نکلے تری تلاش میں

(سفرنامہ)

یکے از مطبوعات "سیارہ ڈائجسٹ" پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور



نکلے
تری
تلاش
میں

مستنصر حسین تارڑ

پہلی بار ------- مارچ

تعداد ------- ۱۵۰۰

مطبع ------- نوائے [illegible] لاہور

[illegible] ------- [illegible]

"کونجاں وانگ ممولیاں دیس چھڈّے

اساں ذات، صفات تے بھیس کھیا!"

(وارث شاہ)

تشکر

مصورِ مشرق جناب عبدالرحمٰن چغتائی
جنہوں نے اِس کتاب کا سرورق تخلیق کیا۔
مصنّف!

حرفِ آغاز

ترکی کے قدیم شہر ارضِ روم کی ایک کہر آلود صبح کو جب میں شیفتہ مدرسے کے مینار تلے اِس حالت میں کھڑا تھا کہ میری جیب میں وطن واپس پہنچنے کے لیے کرایہ تک نہ تھا۔ تقریباً فاقہ کشی تک نوبت آ چکی تھی۔ اُدھر رُوسی ترکستان سے آنے والی ہوائیں سرد تر ہو رہی تھیں اور چند روز میں برف گرنے والی تھی۔۔ اور پھر مایوسی کے سیاہ اندھیروں میں یادوں کے سُنہری دیے جلنے لگے۔ میرے ذہن کے کینوس پر میرے پُورے سفر کے واقعات ایک متحرک فلم کی مانند اُبھرنے لگے۔ اِن خوبصورت یادوں کی حِدت نے میرے دِل کو گرما دیا اور میں ایک نئے عزم کے ساتھ آنے والی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میں اپنے وطن پہنچ گیا تو تقریباً بیس ہزار میل کی اِس طویل مسافت کی رُوداد ضرور قلم بند کروں گا۔ آج اُس کہر آلود صبح کو بیتے ہوئے دو سال ہونے کو ہیں اور میرے ارادے کی تکمیل "نکلے تری تلاش میں" کی صورت میں آپ کے سامنے۔

۱۔ سفرنامے میں ناروے کا تذکرہ بے حد سرسری طور پہ کیا گیا ہے۔ چونکہ مکمل باب کی شمولیت سے کتاب کی ضخامت مناسب حد سے تجاوز کر جاتی تھی اس لیے یہ باب مختصر کر دیا گیا۔

۲- ہسپانیہ کا سفر نامہ بھی اِس کتاب میں شامل نہیں حالانکہ یہ اُندلس کی سر زمین ہی تھی جسے دیکھنے کی چاہت نے مجھے اِس طویل سفر پر اکسایا تھا۔ اِس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ مَیں ابھی تک اِس سفر نامے کو مکمل نہیں کر پایا اور اگر ایسا ہوتا بھی تو اِس کی شمولیت سے کتاب کی ضخامت میں تقریباً دُگنا اضافہ ہو جاتا جو کسی طور مناسب نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ہسپانیہ اپنی تاریخ و ثقافت کے اعتبار سے اتنا اہم ہے کہ اِس کا ذکر سرسری طور پر کرنا زیادتی ہوگی۔ اِنہی وجوہ کے پیشِ نظر مَیں نے اَندلس کے سفر نامے کو ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں ترتیب دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

۳- قارئین یہ محسوس کریں گے کہ کتاب کے آخری ابواب میں تصاویر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اِس کوتاہی کا قصور وار لنڈن کے اُس فوٹو گرافر کو ٹھہرائیے جسے مَیں نے ایک سو کے لگ بھگ تصاویر پرنٹ بنانے کے لیے دیں اور اُس بھلے مانس نے اِن سب کو کسی غلط محلول میں ڈبو کر ہمیشہ کے لیے سیاہ کر دیا۔

۴- سفر نامے میں تاریخی پس منظر کا مواد مستند تاریخی کتابوں سے اخذ شدہ ہے۔ تاریخی امور پر اختلافِ رائے قدرتی امر ہے۔ اگر اِس ضمن میں کوئی قاری تصحیح فرمانا چاہیں تو مَیں شکر گزار ہوں گا۔

اِس کتاب کی اشاعت میں جہاں میسرز سیارہ ڈائجسٹ پبلی کیشنز لمیٹڈ کا بھرپور تعاون شامل ہے وہاں مَیں اُن محترم دوستوں اور بزرگوں کا بھی ذاتی طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے اِس کتاب کی تکمیل کے مختلف مراحل میں میری مدد کی۔

مصورِ مشرق جناب عبد الرحمٰن صاحب چغتائی جنہوں نے اِس کتاب کا دیدہ زیب سرورق تیار کیا۔

جناب برگیڈیئر شفیق الرحمٰن صاحب جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں میں سے وقت نکال کر گاہے بگاہے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

نئی ادبی تنظیم کے اراکین جنہوں نے تنظیم کے اجلاسوں میں میرے سفر نامے کے

طویل اقتباسات سُنے اور انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

اِس کے علاوہ نیشنل کالج آف آرٹس کے میاں مجید جن کی عطا کی ہوئی افغانستان کی تصاویر سفرنامے میں شامل ہیں اور محترم دوست تلمیذ حقانی جنہوں نے اِس کتاب کا عنوان تجویز کیا۔

مستنصر حسین تارڑ
۱۷۔ لکشمی مینشن۔ دی مال لاہور

ترتیب

نکلے تیری تلاش میں

مستنصر حسین تارڑ



ارضِ روم میں خزاں

"اِستانبول - اِستانبول" ریلوے گارڈ ہر کیبن کے دروازے پر دستک دیتا ہوا جا رہا تھا۔ مشہورِ زمانہ اورینٹ ایکسپریس اِنزبروک - لُب لی آنا بلغراد اور صوفیہ سے ہوتی ہوئی اب اپنے آخری سٹاپ یعنی استنبول کے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں یورپ میں چھ ماہ سیاحت کے بعد واپس وطن لوٹ رہا تھا۔ میری جیب میں صرف لاہور تک کا کرایہ تھا اور بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوچ رہا تھا کہ کسٹم سے جلد فراغت ہو جائے تو فوراً ارضِ روم جانے والی گاڑی پکڑ لوں۔ وہاں سے سرحد پار ایران ہے اور پھر افغانستان اور آخر میں میرا پیارا ملک پاکستان جسے دیکھنے کے لیے اب میں ترس گیا تھا۔

کسٹم روم میں پہنچے تو آفیسر نے حکم دیا۔ "اپنا تمام سامان کھول دو۔"

"میرے پاس دو کیمروں اور چند کپڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"میرا وقت ضائع نہ کرو اور تمام سامان کھول دو۔"

اُس نے میرے سُوٹ کیس کا ڈھکنا اٹھا کر اُس میں یوں سَر دے دیا جیسے وہ ایر کنڈیشنڈ

ہو اور باہر کڑاکے کی گرمی پڑ رہی ہے۔

"ہا!" اُس نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا! "لڑکیوں کے کپڑے۔"

"بھائی یہ میری چھوٹی بہنوں کے لیے ہیں۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"ان کی اجازت نہیں۔" اُس نے کپڑوں کی ایک گٹھری بنا کر اپنے پاس رکھ لی اور مجھے رسید لکھ دی۔ میرے کچھ پلّے نہ پڑا کہ کپڑے ضبط ہو گئے ہیں یا ان پر کسٹم ادا کرنا ہوگا۔

"جناب میں اِس رسید کا کیا کروں؟" میں نے نہایت مسکین شکل بنا کر پوچھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے لگے بندھے پیسوں کا خیال آ رہا تھا۔ اگر یہاں ایک دو دِن بھی رہنا پڑ گیا تو واپسی کے بجٹ کا ناس ہو جائے گا اور میں لاہور پہنچنے کی بجائے یورپی ہپیوں کی طرح تبریز کے بازاروں میں بھیک مانگتا پھروں گا۔

"کل آؤ۔" کسٹم آفیسر اب ایک ہپّی کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔

"لیکن میری گاڑی آدھ گھنٹے بعد جا رہی ہے اور میرے پاس پیسے ۔۔۔"

"کل۔" اُس نے گرج کر کہا۔

'کل' آیا تو کوئی قومی تعطیل تھی: تین چار روز خوار ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ محکمۂ کسٹم ان چار کپڑوں کو بذریعہ ریل ارضِ روم روانہ کرے گا اور وہاں سے ایران کی سرحد تک کسٹم کا "معمور" مجھے چھوڑنے جائے گا۔ مجبوری ہے' قانون یہی کہتا ہے۔ اِس سے قبل سیّاح یورپ سے مختلف اشیاء خصوصاً زنانہ کپڑے لا کر ترکی میں بیچ دیتے تھے اور دام کھرے کر کے سرحد پار کر جاتے تھے؛ چنانچہ اِس کی روک تھام کے لیے یہ قانون بنا دیا گیا۔ پہلے ارادہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر وطن کا رُخ کروں، راستے میں پیسے ختم ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ ساتھ ہی اپنی بہنوں کے گول مٹول چہرے یاد آ جاتے کہ وہ منہ اُٹھا کر پہلے میرا اور پھر اپنے ولائتی کپڑوں کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اُن کے لٹکے ہوئے چہرے کون دیکھے ۔۔!

میں نے کپڑوں کا کرایہ ادا کیا اور رسید لے کر ہوٹل آگیا۔ سامان باندھا اور سیدھا سٹیشن کی طرف چل دیا۔ پل غلطہ کے اس طرف بسوں کا اڈہ تھا۔ ارضِ روم تک بس اور ریل کے کرائے میں خاصا فرق تھا۔ میں نے اپنی باقی ماندہ پونجی کا حساب کیا اور کنڈکٹر سے پوچھا: "ارضِ روم؟" کہنے لگا: "بالکل ڈائرکٹ۔ تمام رات سفر کر کے صبح انقرہ۔ کل شام ترابزان۔ وہاں شب بسری کے بعد پرسوں شام ہم ارضِ روم پہنچ جائیں گے۔"
میں ٹکٹ خرید کر بس میں سوار ہو گیا۔ پہلے میٹھی گولیاں بیچنے والا آیا پھر اخبار والا۔ اس کے بعد ایک تیکھی مونچھوں والا سمارٹ سا نوجوان بس کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ پیس تھا۔

"حضرات!" اس نے مسافروں کو مخاطب کر کے بڑی سنجیدگی سے کہا: "میں کپڑا بیچنے والا نہیں ہوں۔ ابھی ابھی مجھے ایک فرانسیسی سیاح ملا تھا۔ بیچارے کی جیب کٹ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی حالتِ زار دیکھی نہ گئی اور صرف انسانی ہمدردی کے تحت اس سے یہ نہایت ہی نفیس اور سو فی صد خالص اونی سوٹ صرف دو سو روپے میں خرید لیا۔ چونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں اس لیے جن صاحب کو درکار ہو وہ خرید لیں۔ میں منافع نہیں لے رہا ہوں۔" اس نے سوٹ کو گال سے لگا کے رگڑا۔ "بالکل نرم اور سو فی صد خالص اون"۔ مجھ سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے کپڑے کو چھوا اور نہایت حقارت سے بولا: "اونہہ! سو فی صد اون۔ بہت خوب یہ تو مکسڈ ہے۔" مونچھوں والے کو غصہ آگیا: "آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں نے صرف جذبۂ ہمدردی کی خاطر اسے خریدا ہے۔"

"اونہہ! جذبۂ ہمدردی۔ اگر تم میں اتنا ہی جذبہ ہے تو میری مدد کرو اور سوٹ پچاس روپے میں فروخت کر دو۔ آخر ایک فرانسیسی کے مقابلے میں ایک ترک تمہاری ہمدردی کا زیادہ حقدار ہے۔" مسافر نے باقی لوگوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا موٹا آدمی کہنے لگا: "جذبۂ ہمدردی کی بات کر کے پھنس گیا ہے۔"

مونچھوں والا اِس دَوران مراقبے میں چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے اس مسافر سے کہنے لگا: "مجھے میری ماں نے نہیں جنا اگر یہ سوٹ میں پچاس روپے میں ہی فروخت نہ کروں۔" مسافر کا ہاتھ فوراً اپنی جیب میں گیا لیکن اس سے قبل کہ وہ رقم نکالے مونچھوں والے نے گرج کر کہا: "لیکن تمہارے ہاتھ فروخت نہیں کروں گا کیونکہ تم نے جذبۂ ہمدردی کی تضحیک کی ہے۔" مسافر نے جھٹ ساتھ بیٹھے ترک دیہاتی سے کہا: "کم بخت پھنس گیا ہے۔ فوراً سوٹ خرید لو۔ اس کے بس سے باہر قدم رکھتے ہی میں تمہیں دس روپے زائد ادا کر کے یہ سوٹ لے لوں گا۔"

دیہاتی نے، جو اَب تک اپنا منہ کھولے یہ تماشا بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، فوراً جیب سے پچاس روپے نکالے اور سوٹ خرید لیا۔ بیٹھے بٹھائے دس روپے بنا لینے میں آخر کیا حرج ہے۔ ہر ایک سوٹ کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ساتھ والے موٹے آدمی نے کپڑے کو ناک سے رگڑا اور پھر انگلیوں میں مَسل کر کہنے لگا: "سوفی صد اُون! یہ تو نِرا سوتی کپڑا ہے۔ بیس روپے کا بھی نہ ہوگا۔ کہاں گیا وہ مسافر؟" اس کی سیٹ خالی تھی۔ معلوم ہوا کہ دونوں ساتھی تھے اور سب کو بیوقوف بنا گئے ہیں۔

بس کا وقتِ روانگی تین بجے تھا، لہٰذا پورے چھ بجے چلی اور سیدھی باسفورس میں ٹھہرے ہوئے سٹیمر میں گھُس گئی۔ ہم یورپ سے ایشیا جا رہے تھے۔ بدلیس سے دلیں صبح کے دُھندلکے میں انقرہ آیا۔ دوسرے روز بحیرۂ اسود کے کنارے سیمسن اور اُسی شام ترابزان، جو ایشائے کوچک میں یونانی سلطنت کا آخری حصار



تھا۔ اسی جگہ یونانی دیومالا کا ہیرو جیسَن اپنے ساتھیوں سمیت آرگو جہاز میں لنگرانداز ہوا تھا۔ وہ "سنہری کھال" کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ پُرانی سرخ چھتیں، تنگ گلیاں، باغات جن میں انار کے شگوفے کِھلے ہوئے ہیں، سارے شہر کا رنگ شوخ سُرخ اور نیلگوں بحیرۂ اسود۔ رنگوں کا حسین امتزاج۔ پَرے سرسبز پہاڑ تھا جہاں یونانی ایکسنافون اپنی دس ہزار فوج سمیت خیمہ انداز ہوا تھا۔ اِردگرد کے جنگل میں شہد کی بہتات تھی؛ چنانچہ اکثر سپاہی کچھ زیادہ ہی کھا گئے اور اپنے حواس کھو بیٹھے۔

ترابزان میں بسوں کی کمی کے باعث رات بحیرۂ اسود کے کنارے مچھیروں کے ایک ویران جھونپڑے میں گزری اور دوسری صبح اُسی بس سے میں ارضِ روم کے لیے روانہ ہو گیا۔ بس گیلی سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ موڑ اور کھائیاں، اتھاہ گہرائی اور پھر پرے وادی میں بل کھاتی ندی، پارے کی سفید لکیر، صاف شفاف اور خنک پانی، ہلکی بارش اور دُھند، خنکی اور سبزہ، ہمیں "ترابزان" چھوڑے دو گھنٹے ہو چکے تھے، لیکن بحیرۂ اسود کی سیلی خوشبو ابھی تک فضا میں لپٹی ہوئی تھی۔ ندی کے کنارے سفید بھیڑیں، برف کے گالوں کی طرح لُڑھک رہی تھیں۔ چرواہے نے بارش سے بچنے کے لیے اپنا بوسیدہ کوٹ سَر پر کھسکا لیا اور سوچا، اب کے ندی میں ضرور طغیانی آئے گی۔

ڈرائیور نے سٹیرنگ سے ملحقہ خانے سے ایک بوتل نکالی اور سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کو تھما دی۔ بوتل مجھ تک پہنچی تو اس میں تھوڑا سا لیموں کا پانی ابھی باقی تھا جسے میں نے ہتھیلی پر اُنڈیل کر منہ پر مَل لیا۔ ترکی کی بسوں میں لیموں کا پانی اُس وقت مہیا کیا جاتا ہے جب پہاڑی راستے کے سفر کے دَوران مسافروں کی طبیعت خراب ہونے کا احتمال ہو اور ہم پچھلے ایک گھنٹے سے درّہ ذی ہانہ میں سے گزر رہے تھے۔

میں خشکی اور سمندر کے راستے ہزاروں میل کی مسافت کے بعد اب وطن واپس جارہا تھا۔

سیاح کی واپسی! مجھے ڈر سا لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب وسوسے جنم لے رہے تھے۔ یہ بس اگر ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند درّۂ ذی ہانا کے کسی موڑ پر گھومنے کی بجائے سیدھی چلی جائے تو؟ سیاح ہو کر ڈرتے ہو، میں نے اپنے آپ کو ملامت کی، اتنے ہی دلیر تھے تو وہاں مال روڈ کے کسی خوبصورت ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ باسی پیسٹریاں کھاتے اور بڑی ہی محفوظ قسم کی زندگی گزارتے۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور پھر اب تو تم اُفق کے اُس پار تک ہو آئے۔ سینکڑوں جگہ سورج ابھرا اور ڈوبا کبھی برف پوش چوٹیوں کو منور کر کے، کبھی چٹیل میدانوں میں شفق کی سُرخ چادر بچھا کے اور کبھی کالے بھور جنگلوں میں کرمچی رنگ بھر کر۔

بس نے ایک پُر خطر موڑ کاٹا اور میرے ذہن میں پھر وسوسوں کے زہریلے ناگوں کے پھن لہرانے لگے جنہیں میں اپنے سفر کے دوران کہیں بھی کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اگر یہاں کوئی حادثہ ہو جائے تو؟ افغانستان کے صحراؤں میں بھی تو ایک حادثہ ہوا تھا۔ سڑک کے نیچے ریت پر بس اوندھی پڑی تھی اور کچھ دور ہلاک ہونے والوں کے لاشے پڑے تھے۔ ان میں زیادہ تر یورپی سیاح تھے جنہیں موت ان ویرانوں میں کھینچ لائی تھی۔ کیا مجھے بھی موت ترکی کے ان پہاڑوں میں کھینچ لائی تھی! میں بھی اگر اس اجنبی دیس میں مر جاؤں تو؟ میری ماں تو وہاں باورچی خانے میں بیٹھی مر جائے گی، اور میرا باپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مجھ تک کیسے پہنچیں گے؟ میرا سر چکرانے لگا اور مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ "کیسے پہنچیں گے؟ کیسے پہنچیں گے؟ کیسے ۔ ۔ ۔" میرے خوابیدہ ذہن نے بار بار دہرایا اور پھر میرا واہمہ ایک بھیانک تخیل کے روپ میں میرے ذہن میں اُبھرنے لگا۔ میری بس کا حادثہ ہو چکا ہے اور

میرے ماں باپ سفر کی سختیاں جھیلتے ہوئے پاکستان سے ترکی آرہے ہیں۔

سڑک بالکل سیدھی اور سپاٹ تھی۔ بس دوپہر کی گرم ہوا کو چیرتی چھوٹے بچّے کی طرح غوں غوں کرتی جارہی تھی۔ باپ کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ سفید بال، تنومند جسم، سُرخ و سپید چہرہ جس پر عمر صرف چند جھُرّیوں کی صورت میں اثرانداز ہوئی تھی۔ ماں ۔۔۔ مشرقی اقدار کی پابند ایک عورت جس نے اب تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ سفید چادر میں ملبوس، خاموش۔ دونوں میاں بیوی چُپ چاپ سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے جو بس کے بانٹ کے اندر دفن ہوکر اُن کا سفر کم کر رہی تھی۔ بس میں اور بھی مسافر تھے جن کی موجودگی اُن کے لیے نہ ہونے کے برابر تھی۔ اجنبی زبان اور اجنبی چہرے۔

بس کابل سے ہرات جارہی تھی۔ غزنی کے دوسری طرف سڑک پر ایک سفید فام سیاح ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ بال بڑھے ہوئے، کپڑے میلے چیکٹ، کاندھے پر سامان کا تھیلا لیکن آنکھوں میں چمک۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھا اور اس سے چند گز اِدھر ہی بس کو روک لیا۔ وہ بھاگا آیا اور سامان کا تھیلا کھڑکی کے راستے اندر پھینک کر پھُرتی سے بس میں سوار ہو گیا۔

"کہاں جاؤ گے؟" کنڈکٹر نے اس کے میلے کپڑوں کو دیکھ کر ناک سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟" اس نے کنڈکٹر کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے عجب شانِ بے نیازی سے پوچھا۔

"ہرات۔"

"تو پھر میں بھی ہرات ہی جاؤں گا۔" ٹکٹ خرید کر اُس نے جیب سے نقشہ نکالا اور اپنا رُوٹ دیکھنے میں مگن ہو گیا۔

ماں کی نظریں اس پر لگی تھیں - اُس کے چہرے کی اضطرابی کیفیت اور آنکھوں کی چمک نے اُسے بہت کچھ یاد دلا دیا تھا- ہاں اُسے بھی تو یونہی گھومنے کا شوق تھا- وہ کہا کرتا تھا: ماں جب اللہ میاں نے مجھے بنایا تھا- تو میرے خمیر میں جنون اور آوارگی کچھ زیادہ ہی بھر دی تھی- بس مجھے وہ جنون ہی چین نہیں لینے دیتا- میرے پاؤں ایک ہی جگہ رہنے سے زمین میں دھنس جاتے ہیں- مجھے دلدلیں پسند نہیں- اور میں کہتی: بیٹے تمہارے دوسرے دوست بھی تو ہیں! کتنی کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں- اُن کو ایسا کیوں محسوس نہیں ہوتا؟

وہ ناراض ہو کر کہتا: امّی جان یہ سب تو کنوئیں کے مینڈک ہیں- صبح کام پر گئے، شام مال روڈ کے بے مقصد چکر لگائے اور گھر آکر ٹیلی ویژن کے سامنے اونگھتے رہے- بس یہ ہے آپ کی کامیاب زندگی- دنیا بہت وسیع ہے امّی! اپنے آپ کو ایک کونے میں نتھی کر لینا کہاں کی کامیابی ہے-

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی- ڈرائیور نے باہر نکل کر سرسری طور پر انجن کا معائنہ کیا- "بس خراب ہو گئی ہے، آگے نہیں جا سکتی" یہ کہہ کر اس نے شلوار کے نیفے سے ایک سگریٹ نکالا اور سُلگا کر زمین پر ایسے بیٹھ گیا جیسے اُس کا اِس بس سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو- ایک مسافر نے چھت پر چڑھ کر سامان اُتارنا شروع کر دیا- اُن دونوں کا فقط ایک ہی سوٹ کیس تھا- وزنی اور بے جان جیسے پتھر کا ہو-

مرد پہلے تو سوٹ کیس کاندھے پر رکھ کر چلتا رہا مگر تھوڑی دُور چلنے کے بعد اُس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے اُسے ہینڈل سے پکڑ کر اپنے پیچھے گھسیٹنا شروع کر دیا- اُس سے کچھ فاصلے پر عورت چل رہی تھی- ہوا کچھ تیز ہو چلی تھی اور ساتھ ریت بھی اُڑ رہی تھی- کانٹے دار جھاڑیاں غباروں کی طرح اِدھر اُدھر

اچھل رہی تھیں ۔ عورت کی سفید چادر ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی ۔ کفن میلا ہو چلا تھا ۔ تھوڑی دیر میں ساری فضا ریت آلود ہو چکی تھی ۔ بیابانی، ریت اور تیز ہوا میں اڑتی ہوئی جھاڑیاں ۔ اس ویرانی میں دو پیکر، مرد عیسٰے کی طرح اپنی صلیب گھسیٹتا ہوا اور عورت بین کرتی مریم ۔

مرد کے چہرے پر ریت کے ذرے اور پسینے کے قطرے جھریوں کو بھر رہے تھے ۔ میں اُسے کہتا تھا : بیٹا تم میں بڑا بننے کی خواہش نہیں ہے ۔ تم ایک اچھی کتاب پڑھتے ہو تو سمجھ لیتے ہو کہ دنیا مل گئی ۔ تمہاری آنکھیں اُفق کے اُس پار ہی دیکھتی ہیں مگر تمہیں اپنے گردو پیش کی خبر نہیں ہوتی ۔ پڑھنا لکھنا اور صرف آوارہ گردی تو کوئی بات نہ ہوئی ۔

وہ کہتا ۔ ابّا جان آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ مجھ میں بڑا بننے کی خواہش ہے ۔ لیکن یہ بڑائی میرے دل میں ہے، میرے احساس میں ہے ۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ مرد کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔ ہاں وہ لاکھوں میں ایک تھا ۔ میرا بیٹا ۔ میرا دوست ۔ اور پھر میں اُسے کہتا : بیٹے، باہر کی دنیا خطرات سے پُر ہے ۔ تم انجانے صحراؤں کو ناپو گے، اجنبی شہروں میں گھومو گے، خدانخواستہ اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

او نہہ حادثہ ! وہ مسکرا کر کہتا : ابّا جان حادثہ کہاں نہیں ہو سکتا ۔ یہیں ہمارے گھر کے سامنے سڑک پار کرتے وقت بھی تو ہو سکتا ہے ۔ لیکن وہ حادثہ وہاں گھر کے سامنے سڑک پر نہ ہوا بلکہ ترکی میں ترابزان اور ارضِ روم کے درمیان ذی ہانا پاس کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہو گیا ۔

ترکی سفارت خانے کے نمائندے کو وہ گھر ڈھونڈنے میں بالکل دقت نہ ہوئی ۔ پاسپورٹ پر پورا پتا درج تھا ۔ اُن دنوں گھر میں سب لوگ بڑی بے تابی

سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ دستک ہوئی تو ماں نے میلے کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا: تمہارے بھائی جان آ گئے۔ ایک پیاری سی گڑیا پچھلے کمرے سے نکلی صحن کو پھلانگتی لپک کر دروازے تک پہنچی اور ٹھٹک کر واپس آ گئی: ماں، دروازے پر کوئی انگریز کھڑا ہے۔

ماں نے الگنی پر سے اپنی سفید چادر اتاری اور سر پہ اوڑھ کر دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

"میں ترکی کے سفارت خانے کی طرف سے آیا ہوں۔" اُس انگریز نے نظریں جھکا کر کہا: "مجھ پر ایک ناگوار ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا لڑکا۔ ترکی میں ارضِ روم کے قریب بس کے حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے۔ میری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ رہا اُس کا پاسپورٹ اور سامان کی رسید جو آپ سفارت خانے سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

بھائی جان نہیں آئے تھے۔

اگر وہ گھر کے سامنے سڑک پار کرتے ہوئے مرتا تو میرے پاس ہوتا۔ میں اس کا منہ دیکھ لیتی اس کے بَین تو کرتی اور اب۔ ۔ ۔ ۔ پولیس آئی ہو گی، پاسپورٹ لے کر، اُسے لاوارث قرار دے کر دہیں کہیں دفن کر دیا ہو گا۔ اس کا بیٹا جسے اس کی ایک پڑھی لکھی سہیلی نے یونانی دیوتا سے تشبیہہ دی تھی۔ وہ تھا بھی خوبصورت، ستواں ناک، بڑی سی آنکھیں، پتلے ہونٹ، مردانگی کا بھرپور رنگ۔ شاید اسی لیے وہ واپس چلا گیا۔ اس کے اندر جو دیوتا تھا وہ اُسے وہیں لے گیا جہاں کبھی زمانے میں دیوتا بستے تھے۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد انہیں ایک اور بس مل گئی۔ سفر جاری رہا۔ ہرات، مشہد، تہران اور اب وہ ایران اور ترک کی سرحد پر تھے۔ کسٹم آفیسر نے اُن کے

پاسپورٹ چیک کیے اور فارم دیا۔ مہربانی کر کے اس پر اپنے سامان کی تفصیل درج کر دیجیے۔
مرد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فارم پُر کر دیا۔ آفیسر نے کاغذ پر نگاہ ڈالی اور پھر دونوں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا: بس ۔ ۔ ۔ پتھر کی ایک سِل۔ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟

عورت نے سوٹ کیس کھولا۔ سفید سنگِ مرمر کی ایک سِل۔

"اس کو باہر نکال کر دکھا دیجیے۔"

سِل کے ایک طرف عربی رسم الخط میں کچھ تحریر تھا۔ آفیسر نے منہ بنا لیا۔ جانے کیا چیز اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اُس نے انہیں ایک اور فارم دیا: "مجبوری ہے صرف کاغذی کارروائی۔ آپ اس فارم پر حلفیہ طور پہ لکھ دیں کہ آپ اس سامان ۔ ۔ ۔ اس پتھر کی سِل کو ترکی میں فروخت نہیں کریں گے یہ لازمی ہے۔"

"میں اپنے بیٹے کی قبر کا کتبہ بیچوں گی؟" عورت نے دُکھ سے کہا۔

"تم خاموش رہو۔" مرد کے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔ "آفیسر ہم اس کو فروخت نہیں کریں گے۔ لیکن یہ آپ کی سرزمین میں ہی رہے گا۔ ہم تو آتے ہی اس لیے ہیں ہم اسے بڑی دُور سے لائے ہیں۔ وہاں سرکلر روڈ پر دکانیں ہیں۔ میں نے اپنے گھر کی تختی بھی وہیں سے بنوائی تھی اور پھر یہ کتبہ بھی۔ دونوں پر ایک ہی نام ہے۔ ہم بہت تھک چکے ہیں۔"

کسٹم آفیسر خاموش کھڑا تھا: "ارضِ روم جانے والی بس آپ کو گیٹ کے باہر ملے گی۔"

انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ مری سے نتھیا گلی جا رہے ہوں۔ پُرپیچ سڑک ہوا میں خنکی اور نیچے وادی میں سبزے کی تہیں۔ پہاڑیوں پر بکھرے ہوئے یونانی کلیسا اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ پچھلے زمانوں میں یہاں یونانیوں کی حکومت تھی۔

یونانی جو دیوتاؤں کے پجاری تھے۔

"ان ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا" ڈرائیور نے استفسار پر بتایا: "مجھے یاد ہے حادثہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہوا تھا۔ اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور دُھند بھی تھی۔ ایک موڑ پر بس سیدھی گہرے کھڈ میں جا گری۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام مسافر بچ گئے صرف ایک سیاح ہلاک ہوا تھا۔ اللہ معافی دے۔" اور ساتھ ہی اس نے اگلے خانے سے ایک بوتل نکال کر منہ کو لگالی۔

اس کا آخری خط استنبول سے آیا تھا: دیکھا امی حضور آپ تو خواہ مخواہ فکر کرتی تھیں۔ مَیں آدھی دنیا گھوم آیا اور کہیں خراش تک نہیں آئی۔ اب تو آپ کے اور میرے درمیان صرف ایک ملک رہ گیا ہے میرا انتظار شروع کر دیجیے وہ ایک ملک درمیان میں ہی رہا۔ وہ تو میرے پاس نہ آیا۔ مجھے ہی اس کے پاس جانا پڑ گیا۔

"پاشا" ڈرائیور نے مرد سے مخاطب ہو کر کہا "یہاں سے وہ بس نیچے گری تھی"

"بھائی بس یہیں روک لینا" مرد نے سیٹ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن بس تو یہاں نہیں رُکتی"

"ہماری بس یہیں رُکتی ہے" اُس نے سوٹ کیس اُٹھاتے ہوئے کہا: "اُس ہلاک ہونے والے سیاح کی قبر کہاں پر ہے؟"

"وہ نیچے۔ اُس ندی کے کنارے، لیکن آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"ہمیں ملاقات کے لیے جانا ہے"

عورت اور مرد نے گھاٹی سے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی تیزی سے اُتر رہے تھے اور جلد ہی ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ مرد نے سوٹ کیس کاندھے سے اُتار کر نیچے رکھ دیا اور گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ کچھ دُور پرے برف کے گالوں

ایسی سفید بھیڑیں ندی کے کنارے چر رہی تھیں اور اُن کے پاس کھڑا چرواہا دونوں کی طرف شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس کے پاس چلے گئے اور پوچھا:
"بھائی یہاں ایک ماہ قبل ایک حادثہ ہوا تھا بس کا ؟" چرواہے نے سر ہلا دیا۔
"اس میں ایک سیاح بھی ہلاک ہوا تھا" چرواہے نے سر زور زور سے ہلایا۔
مرد نے دونوں ہتھیلیوں کا پیالا سا بنا کر پوچھا: "اس کی قبر بھی۔ تمہیں معلوم ہے کہاں ہے ؟"
"قبر۔ ہاں تھی۔ پچھلے دنوں اس وادی میں سیلاب آیا تو بہہ گئی۔ اُس جگہ پر تو اب یہ ندی بہتی ہے۔"
"بہہ گئی! عورت نے ہسٹریائی ہو کر کہا: "لیکن میانی صاحب میں تو اِتنی ساری قبریں ہیں، اُن کو کچھ نہیں ہوتا اور اس پوری وادی میں صرف ایک قبر بہہ گئی۔"
"تم خاموش رہو۔" مرد نے آہستہ سے کہا اور ساتھ ہی سوٹ کیس کھولا، پتھر کی سِل باہر نکالی اور اسے سیدھا کر کے ندی کے درمیان میں پھینک دیا:
"اُس کی قبر بہہ نہیں گئی۔ ندی اُس کی قبر ہے۔"
سِل پر خنک اور شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ندی میں ہمیشہ پانی بدلتا رہتا ہے ایک دفعہ جو پانی گزر جائے دوبارہ نہیں گزرتا۔ اس کی جگہ نیا پانی لے لیتا ہے۔
"اس کی جگہ نیا پانی لے لیتا ہے۔ اس کی جگہ۔ ۔ ۔" میرے نیم خوابیدہ ذہن نے دہرایا۔
مَیں نے ایک جھُرجھُری لی۔ توبہ توبہ میں بھی کتنا بزدل ہوں۔ خدانہ کرے میرے عمر رسیدہ ماں باپ میری قبر کا کتبہ اُٹھائے یوں ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ یہ سب واہمے ہیں، میں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نیند

کا اثر زائل ہو چکا تھا۔

ڈرائیور نے اب گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ ہم درّوں اور گھاٹیوں سے نکل کر میدانی علاقے میں آ چکے تھے۔ بس کی رفتار بھی اب قدرے تیز ہو چلی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک درمیانی عمر کا موٹا جرمن بیٹھا تھا۔ تانبے کے پتلے فریم کی عینک لگائے، ہاتھ میں 'تاریخِ ایشیا کوچک' کی ایک ضخیم کتاب۔ "جس خطے سے ہم گزر رہے ہیں یہاں تاریخ بکھری پڑی ہے" دبیز شیشوں کے پیچھے اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں: "قدیم یونانی سلطنت کی سرحدیں یہاں تک تھیں۔ سلجوق سلطان الپ ارسلان نے انہی وادیوں میں یونانیوں کے دانت کھٹے کیے۔ سلطان محمد ثانی نے ترابزان کا محاصرہ کیا تو شہنشاہِ ترابزان داؤد کو پیغام بھیجا کہ بھائی دو ہی راستے ہیں، یا اپنی سلطنت ہمارے حوالے کر دو اور اپنی جان و مال بچا لو یا سلطنت کے ساتھ جان و مال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔ داؤد سیانا تھا۔ اُس نے پہلی تجویز قبول کر لی۔ شہر سلطان کے حوالے کر دیا اور اپنا خزانہ سمیٹ کر رومانیہ چلا گیا جہاں سلطان نے اُسے ایک قلعہ الاٹ کر دیا۔

ترابزان شاہ راہِ ابریشم کا آخری شہر تھا۔ وہ چھوٹی سی چمکتی ہوئی ندی دریائے فرات ہے جس کا منبع اِنہی پہاڑوں میں واقع ہے۔ معاف کیجیے گا، آپ بور تو نہیں ہو رہے؟" اُس نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا:

"جی بالکل نہیں۔ آپ بیان جاری رکھیے"۔ آدمی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔

مَیں نے جرمنی سے استنبول تک تو ریل میں سفر کیا اور وہاں سے ترابزان تک بحری جہاز میں آیا۔ بڑا دلچسپ سفر تھا۔ آپ کو شاید معلوم ہو (میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی) کہ مارکوپولو چین کی سیاحت کے بعد ترابزان سے ہی وینس کے۔ لیے سدھارا تھا۔ وہ شہنشاہِ چین کے حکم سے شہزادی کو خاتون کو ایران لایا تھا جہاں شاہِ ایران

اس سے شادی کے منتظر تھے۔ لیکن سفر نے طوالت اختیار کر لی اور کوخاتون ایران پہنچی تو شاہ ایران انتقال فرما چکے تھے اور اب ان کا بیٹا تخت نشین تھا۔ بہر حال شہزادی کو واپس چین بھجوانے کی بجائے شاہ صاحب نے خود ہی شادی رچالی۔ شاہ جی منگول نسل کے تھے اور ان دنوں ایران میں خالص منگول نسل شہزادیاں نایاب تھیں۔ مارکوپولو کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ شام کا راستہ چونکہ ڈاکوؤں سے اٹا پڑا تھا اس لیے مارکوپولو سیدھا ترابزان آیا اور بحری جہاز کے ذریعے اپنے وطن وینس چلا گیا۔ ترابزان کی جس سرائے میں مارکوپولو نے قیام کیا اس کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔ معاف کیجیے گا، میں واقعی باتیں زیادہ کر رہا ہوں۔" اس نے جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کیے اور عینک دوبارہ لگالی۔ "میں تو تہران تک جارہا ہوں۔ آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں جا نہیں آرہا ہوں۔ میرے اور میرے گھر کے درمیان صرف ایک ملک رہ گیا ہے۔ وہاں سبھی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں تھک گیا ہوں۔ مجھے سفر سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب ساری عمر گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔"

"ہاں۔" جرمن مسکرا کر بولا۔ "گھر واپس آنا ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے لیکن تمہارے یہ احساسات عارضی ہیں۔ سفر کے اختتام پر ہمیشہ تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ آج سے چند ماہ بعد جب تم پھر دنیا کے جھمیلوں میں پڑ جاؤ گے تو یہی لمحے تمہیں حسین لگیں گے اور پھر سفر تو دیوانگی ہوتی ہے۔ فصلِ گل آتے ہی عود کر آتی ہے۔ مجھے دیکھو بوڑھا ہو چلا ہوں لیکن یہ دیوانگی نہیں جاتی۔ میرے بچے مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں: اچھا تو پھر ڈیڈی، سنا ہے مشرق بڑا پُراسرار ہے۔ ہر جگہ جیب کٹ جاتی ہے۔ مکھیوں کی بہتات ہوتی ہے اور لوگ حشیش بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔ سفر میں صعوبتیں تو ہوتی ہی ہیں۔ لیکن ہماری نئی نسل ایک بہتر گھر اور بہتر کار سے پرے تو کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ ارضِ روم آنے والا ہے، میں ذرا اپنا کیمرہ اور کتابیں وغیرہ سنبھال لوں۔ جنگ کی طرح

سفر سے قبل بھی مطالعہ نہایت ضروری ہے"۔

شام کے دُھندلکے اور بارش کے باوجود ارضِ روم کے قدیم مکانوں کی دیدہ زیب سُرخ چھتیں چمک رہی تھیں۔ شیفیتہ مدتے کے دو مینار دُھند میں بھیانک لگ رہے تھے۔ اڈے کے ساتھ ہی "پلاس ادتلی" کا بورڈ آویزاں تھا۔ اندر جانے پر معلوم ہوا کہ سیدھا سادا "پیلس ہوٹل" ہے۔ خیال تھا کہ دوسرے روز استنبول سے کسٹم والوں کی بھیجی ہوئی کپڑوں کی پوٹلی مل جائے گی تو فوراً تہران روانہ ہو جاؤں گا۔ صبح اُٹھا اور سیدھا سٹیشن کے "گم رُرخ" یعنی کسٹم ہاؤس کا رُخ کیا۔ آفیسر نے کپڑوں کی رسید پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہا: "کل"۔

"کل؟" مَیں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا: "لیکن میں تو ارضِ روم میں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔

"سب یہی کہتے ہیں"۔ اس نے اکتاہٹ سے کہا: "میں کچھ نہیں کر سکتا۔ استنبول سے یہاں تک سامان آنے میں کم از کم ایک ہفتہ لگتا ہے۔ کل پھر پتا کر لینا"۔

میں مایوس ہو کر باہر آ گیا۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ دوسرے دن بھی ٹکا سا جواب ملا۔ مَیں روزانہ صبح سٹیشن پر چلا جاتا اور استنبول سے آنے والی گاڑی کا انتظار کرتا۔ گاڑی آ جاتی مگر میرا سامان نہ آتا۔ سارے دن میں صرف ایک ہی گاڑی آتی اور شام کو واپس استنبول روانہ ہو جاتی۔ اِس دَوران سٹیشن پر خوب رونق رہتی۔ روزگار کی تلاش میں یورپ جاتے ہوئے پاکستانی اور پھر وہاں سے مایوس ہو کر لَوٹنے والے پاکستانی، انگریز، امریکی، جرمن ہپّی۔ نروان کی تلاش میں۔ ارضِ روم "شاہراہِ حشیش" کا بڑا اہم جنکشن ہے۔ یہاں سے تہران، کابل، لاہور، دہلی اور پھر ہپیوں کی جنت کھٹمنڈو جہاں چرس کی خرید و فروخت اور استعمال پر کوئی پابندی عاید نہیں۔ دم میں دم رہے نہ غم، نروان ہی نروان، ہری اوم ہری کرشنا۔



گاڑی چلی جاتی تو سٹیشن بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔ میں باہر نکلتا اور ہوٹل واپس آکر کپڑے بدلے بغیر ہی بستر پر لیٹ جاتا۔ صبح چائے کے ساتھ دہی کھا کر بغیر شیو کیے پھر سٹیشن کی طرف چل پڑتا اور کسٹم آفیسر کا ایک اور "کل" جواب میں سُن کر تھکے ہوئے قدموں سے واپس لوٹ آتا۔

اکتوبر کا آخیر تھا۔ سٹیشن سے شہر تک جانے والی سڑک کے دونوں اطراف شاہِ بلوط کے درختوں کے خزاں رسیدہ پتّے سُرخ ہو کر گرنے شروع ہو گئے تھے۔ اس روز کچھ زیادہ ہی سردی تھی۔ کاکیشیا سے آنے والی سرد ہوائیں خنک تر ہو چلی تھیں۔ چند روز میں سردی شدید تر ہو جائے گی اور پھر۔۔۔۔ برف گرے گی۔ پہلے "کوہ دُھند" اور گرد و نواح کی پہاڑیوں پر اور پھر۔۔۔۔ اور پھر وہ شہر کا رستہ دیکھ لے گی۔

مَیں نے صبح سے صرف ایک پیالی دہی اور چند انگور کھائے تھے۔ دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے، ہوا اور بارش سے بچاؤ کے لیے سر نہوڑے میں آج پھر سٹیشن سے مایوس لوٹ رہا تھا۔ میرے بوٹوں میں پانی چپک رہا تھا۔ گیلے فٹ پاتھ پر شاہِ بلوط کے سُرخ پتّے گرتے اور خوبصورت نقش بنا کر پھسل جاتے۔ مَیں نے جیب میں اپنا آخری ریرا سختی سے بھینچ لیا اور میری بند ہتھیلی نے ٹھنڈے سکّے کی ساری خنکی جذب کر لی۔ شیفتہ مدرسے کے ٹوٹے ہوئے مینار کے سائے میں بیٹھے بوڑھے فقیر نے مجھے دیکھ کر صدا دی، "سفر بخیر" اور مَیں نے اپنی بھینچی ہوئی مٹھی اس کی جھولی میں کھول دی۔

میں شیفتہ مدرسے کے قدیم آہنی دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ شہزادی ہُندی خاتون کا تعمیر کردہ یہ مدرسہ گئے زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ لمبی عباؤں اور اُونچی قباؤں والے طالب علم دُور دراز سے آتے اور مستطیل صحن کے گرد بنی ہوئی نیم تاریک کوٹھڑیوں میں سما جاتے۔ دینی و دنیاوی علوم کے چراغ جلتے اور ان کی روشنی سمرقند و بخارا

ارضِ روم۔ سٹیشن کو جانے والی سڑک

تک پھیل جاتی۔ مَیں نے اندر جھانکا۔ سامنے ایک نیم شکستہ گنبد تلے ایک سلجوق شہزادی سوئی ہوئی تھی۔ سلجوق طرزِ تعمیر کا ایک شاہکار۔ ساری عمارت خاموشی کے تالاب کی مانند تھی۔ کتنا سکون تھا۔ یخ ہوا کا ایک تھپیڑا آیا اور میں مدرسے کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے اور چمٹ گیا۔ بارش بھی تیز ہو چلی تھی۔ سڑک بالکل خالی ہو چکی تھی۔ فقیر نے اپنی جھولی سمیٹی اور سٹیشن جانے والی سڑک پر چل دیا۔ وہاں بارش سے بچاؤ ہو گا۔ اب سڑک اور فٹ پاتھ مکمل طور پر سنسان تھے۔ آسمان پر گھنے اور سیاہ بادلوں کے راج نے شہر کو نیم تاریکی میں ڈبو دیا تھا۔ دیوار کی شکستہ اینٹوں میں سے پانی رِس رِس کر میرے قدموں تلے جمع ہو رہا تھا۔ سردی اور بھوک کی شدّت سے میرا سَر چکرانے لگا۔ میں کہاں ہوں؟ یہاں کیا کر رہا ہوں؟ میرے کانوں سے بنسری کی لَے اور ڈھول کی تھاپ ٹکرائی۔ دھیمی اور سحر انگیز دُھن، سلا دینے والی دُھن، درویشوں کے ناچ کی دُھن، لمبے چغے اور ترپوش پہنے ہوئے درویش، درویشوں کا رُوحانی ناچ۔ ایک متحرک دائرہ اور رومی آنا کے والز کے قدم۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین اور۔۔۔ لَے تیز ہو چلی تھی۔ مجھ پر وَجد طاری تھا۔ مَیں کون ہوں؟ میں بھی تو درویش ہوں۔ میرے پاس بھی تو کچھ نہیں۔ ارضِ رُوم، مولانا رُوم، دما دم مست قلندر علی دا پہلا نمبر۔ لیکن سیون شریف میں تو اتنی سردی نہیں ہوتی۔

مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے دھیمی اور سحر انگیز موسیقی کی لہریں مجھے اپنے دوش پہ بٹھائے لق و دق صحراؤں، بلند و بالا پہاڑوں اور گنگناتی ندیوں کو پاٹ کر اُس چمکیلے دن کی طرف مائل پرواز ہیں جو میرے سفر کا حسین آغاز تھا۔

ہندوکُش کے سائے میں

"آر یُو گوُ ننگ ٹُو کابُول سَر ؟" پاکستانی بس کے گورے چِٹے کنڈکٹر نے شُستہ انگریزی میں ہم سے پوچھا۔

"آہو جی" علی نے بوکھلا کر خالص موچی دروازے کے لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر اپنا سامان بس کے نیچے بنے ہوئے کمپارٹمنٹ میں رکھ دیجیے اور سیٹ نمبر گیارہ اور بارہ پر تشریف رکھیے۔

بس آرام دہ تھی۔ لاہور سے بذریعہ خیبر میل جب پشاور پہنچے تو سٹیشن پر ہمیں ایک تانگہ ڈرائیور جمع گائیڈ مل گیا: "افغانی کرنسی قصہ خوانی بازار سے دستیاب ہوگی اور کابل کے لیے گورنمنٹ کی بس آٹھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ میں آپ کو وقت سے پہلے پہنچا دونگا۔ کرایہ چار روپے۔" ہم نے کہا منظور اور تانگے میں سوار ہو گئے۔ چنانچہ کرنسی تبدیل کروائی اور عین وقت پر اڈے پر بھی پہنچ گئے۔

درّہ خیبر کی پُرپیچ سڑک پر بس لڑھکتی ہوئی طورخم جا رہی تھی۔ سرحد کے اُس پار

افغانستان تھا۔

چند برس پیشتر تیز رفتار جیٹ ہوائی جہاز کے ذریعے لندن سے واپسی ہوئی۔ میں شیشے کی دبیز کھڑکی سے ناک چپکائے اُن فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھ میں اور ہمارے نیچے تیزی سے سرکتی ہوئی دنیا کے درمیان حائل تھے۔ ہسپانیہ کا گہرا نیلگوں ساحل، سنہری دھوپ میں چمکتے ترک گاؤں اور سرزمینِ ایران کا حسن، پلک جھپکتے نظر سے غائب ہو گئے۔ یہ تمام خوبصورتیاں میری پہنچ سے باہر تھیں۔ جہاز کا سفر زمین سے تمام ناطے منقطع کر دیتا ہے اور مجھے یہ جدائی پسند نہ تھی۔ مَیں نے سوچا، میں دوبارہ واپس آؤں گا لیکن گلاس اور ایلومینیم کے ساختہ اُڑن کھٹولے میں قید ہو کر نہیں بلکہ دھرتی کے سینے کے ساتھ لگ کر تاکہ مجھے وسعتوں اور فاصلوں کا احساس ہو، صرف خلاؤں کا نہیں۔

وطن واپس آیا تو رہٹ کے آگے جُتے تازہ دم بیل کی مانند پہلے پہل تو خوب "گیڑے" لگائے۔ گلے میں بندھی گھنٹیوں کی سُریلی آواز نے مسحور کیے رکھا۔ دن فکرِ روزگار میں کٹتا اور شام مال روڈ کے ایک ٹکڑے پر مٹر گشت کرتے یا ٹیلی ویژن کے سامنے جماہیاں لیتے۔ زندگی جامد ہو کر رہ گئی تھی اور مجھے شدّت سے اپنے گلے میں "پنجالی" اور آنکھوں پر چڑھے "کھوپوں" کا احساس ہونے لگا۔ میں ایک جگہ چکر کاٹ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ رسہ تڑوا کر بھاگ نکلوں۔

میرا دوست محمد علی کبھی کبھی میرے پاس آ بیٹھتا اور ہیں اُتے سنہری وادیوں اور جھلمل جھلمل کرتی نیلی جھیلوں کی کہانیاں سناتا جو اب ایک خواب ہو کر رہ گئی تھیں۔ مَیں نے ایک روز اس گھٹن اور سکوت سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ لوہے کے زنگ آلود صندوق میں سے اپنا پرانا خیمہ، سامان کا تھیلہ، کھانا پکانے کی اشیاء اور یورپ کے نقشے نکالے۔ اب میرا وقت انہی نقشوں پر سرخ لکیریں کھینچنے اور

مختلف ممالک کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں کتب کی ورق گردانی میں صرف ہونے لگا۔ میرے ذہن میں سفر کا ایک دُھندلا سا خاکہ اُبھرنے لگا۔ خشکی کے راستے استنبول، پھر وہاں سے شمالی اور وسطی یورپ کے ممالک کی سیاحت کے بعد ہسپانیہ۔ محمد علی کو سیاحت سے کوئی لمبی چوڑی دل چسپی نہ تھی لیکن صرف "ذلیت" دیکھنے کے چاؤ نے اُسے میرا ہم سفر بننے پر مجبور کر دیا اور اب ہم اپنی پہلی سرحد عبور کرنے والے تھے۔

طورخم پر واجبی سی چیکنگ ہوئی اور ہم افغانستان میں داخل ہو گئے۔

بس میں بڑی بین الاقوامی قسم کی رونق تھی۔ امریکن بوڑھیاں، ایک جاپانی جوڑا، فرانسیسی آوارہ گرد اور افغانی "سکھ" جن میں علی بے حد دلچسپی لے رہا تھا۔ جلال آباد پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے طورخم کی بجائے گنڈا سنگھ والا کا بارڈر پار کیا ہے۔ یہاں افغانوں کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیوں کی نسبت سکھوں کی کلف لگی پگڑیوں کی بہتات تھی۔ شہر کا تمام کاروبار سکھوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی سرحد پار کرتے ہی انسان ایک دم نئی تہذیب و ثقافت اور جغرافیائی تبدیلیوں سے دوچار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اُس ملک میں کچھ فاصلہ طے نہ کرے۔ اسی طرح جلال آباد تک ماحول ہمارے صوبہ سرحد جیسا ہی ہے مگر یہاں سے پرے اصلی افغانستان شروع ہو جاتا ہے۔ جلال آباد کے آگے بلند چٹانوں اور تنگ دروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ اور گھاٹیاں ہیں۔ دائیں طرف نورستان کی برف پوش چوٹیاں ہیں جن کے پہلو میں بہتا ہوا دریائے کابل اپنے ہم نام شہر تک ساتھ دیتا ہے۔ افغان حکومت کی اَن تھک کوششوں اور غیر ملکی ماہرین کی نگرانی میں ویرانوں کو مرغزاروں میں بدلنے کی کوشش کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔

یہ مارچ کا آخر تھا۔ سڑک پر کوچی خانہ بدوشوں کے قافلے پنجاب اور سرحد میں موسم سرما بسر کر کے نئے اُفقوں کی تلاش میں شمالی افغانستان کی طرف رواں



تھے - کوچی جو ہمیشہ موسم بہار کے ساتھ سفر کرتے ہیں - افغانستان کی کل آبادی کا کم از کم پندرہ فی صد حصّہ ان خانہ بدوشوں پر مشتمل ہے - آج ہم بھی اِن کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

کابل پہنچے تو شام کا سُرمئی اندھیرا ہر سُو پھیل چکا تھا - ہوٹل کی تلاش میں زیادہ دِقت نہ ہوئی - ہم نے سامان کمرے میں رکھا اور باہر آ گئے - شہرِ نو میں چند جدید عمارات اور کشادہ سڑکیں تھیں، لیکن بھوُرے رنگ کی وسطی پہاڑی کے پرے، صدیوں پُرانا کابل تھا۔ ہمارا ہم سفر دریائے کابل اب شہر کے درمیان میں بہہ رہا تھا مسجد کے سامنے والے پُل کے پہلو میں بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اُتر جائیے تو دریا کی ہمہ گیر افادیت عیاں ہو جائے گی- ایک طرف لمبے بُرشوں کی مدد سے اُزبک قالینوں کو دھویا جا رہا ہے، ساتھ ہی ایک خان صاحب وضُو کر رہے ہیں، کالے چُغے میں ملبوس ایک خانہ بدوش لڑکی ٹین کے کنستر میں گھریلو استعمال کے لیے پانی لے رہی ہے - اُس سے ذرا پرے چند حضرات گردوپیش سے بے خبر اِسی "فلش سسٹم کے اصُول" کے تحت استعمال کر رہے ہیں - بہتا پانی ہمیشہ پاک رہتا ہے۔

شاہ امان اللہ کی ملکہ نے اپنی چادر اُتار دی تو شاہ کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا مگر وہ پُرانے وقتوں کی بات ہے - اب آپ کو ہر جگہ منی سکرٹ اور اُونچی ایڑی کے جوتوں میں ملبوس خواتین نظر آئیں گی - چادر سُکڑ کر جدید وضع کے کٹے ہوئے بالوں پر "سکارف" کی شکل میں رونما ہے - اگر کوئی خاتون ذرا پُرانی وضع کی ہیں تو پھر سکرٹ اور بلاؤز کو شٹل کاک نما سفید بُرقعے سے ڈھانپ لیا جاتا ہے لیکن اس طرح کہ چلتے وقت عریاں پنڈلیوں اور ٹانگوں کی دعوتِ نظارہ عام ہو جائے - روایتی لباس پہننے والوں کی تعداد دِن بدن کم ہوتی جا رہی ہے - مجھے ذاتی طور پر نئی روشنی کے تحت جدید اصلاحات سے پرخاش نہیں لیکن یہ اصلاحات زندگی کے ایسے شعبوں سے متعلق ہونی چاہئیں جہاں کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو سکے۔

کوچی خانہ بدوش جو بہار کے ساتھ سفر کرتے ہیں

اپنے روایتی لباس کو خیر باد کر کے مغربی ٹکڑے زیب تن کر لینا احساسِ کمتری کی علامت ہے، ترقی کی نہیں۔

خیبر ریستوران کا سیلف سروس کیفے یہاں پر سیاحوں کی آماجگاہ ہے۔ کاؤنٹر پر ٹرے لے کر کھڑے ہو جائیے اور مختلف انواع کے کھانوں میں سے اپنے لیے انتخاب کر لیجیے۔ رات کا کھانا ہم نے یہیں کھایا۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو ہوا میں خنکی کا احساس ہوا۔ ہم مسجد والے پل سے دریائے کابل کو عبور کر کے بلندی کی طرف چلے گئے۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں شہرِ نو کی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ مغرب کی طرف رومانوی کوہِ بابا کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں۔ اتنی نزدیک کہ ہاتھ بڑھائیں تو چھو لیں، اتنی عظیم اور خوبصورت جیسے فنِ گندھارا کا کوئی شاہکار مجسمہ ہو۔ اُس کے ساتھ ہی مشرق سے شمال تک ایک ناقابلِ تسخیر خشک اور بلند سلسلۂ کوہ کی برف پوش دیوار کھڑی تھی۔ اِسے افغانوں نے "ہندوکُش" کے نام سے پکارا۔ ایک ایسا پہاڑ جو ہندوؤں کے لیے پیامِ اجل تھا۔ ہندوؤں نے اِسے صرف "کوہ ہندو" کا نام دیا اور ایرانیوں کی قدیم زبان میں اِسے "پاروپانیسادا" (Paropanisadae) کہتے تھے۔ وہ پہاڑ جس کی فلک بوس چوٹیاں عقابوں کی بلندیِ پرواز سے بھی اُونچی ہیں۔ اس کی ازلی برفوں میں تاریخ کے کتنے باب دفن ہیں۔ زمانۂ قدیم میں یونان کی ٹیلا نما پہاڑیاں دیوتاؤں کا مسکن سمجھ کر پوجی جاتی تھیں لیکن جب ایک چرواہا کوہ المپس کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہاں نور کے ہالوں کی بجائے خشک پتھروں کے ڈھیر تھے۔

مقدونیہ کے سکندر کو بھی دیوتاؤں کی تلاش تھی۔ اولمپس کا طلسم ٹوٹا تو اُس کی نگاہیں مشرق سے چڑھتے سورج پر جم گئیں۔ سکندر نے قدیم کتابوں میں پڑھا تھا کہ شاہِ دارا کے ایران کے اُس پار پہاڑوں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جسے آج تک کوئی بھی تسخیر نہیں کر سکا۔ اُس نے سوچا، دیوتا ضرور وہیں بستے ہوں گے لیکن اسے

یہاں آکر بھی مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگر وہاں خشک پتھر تھے تو یہاں ازلی برفوں کی تہیں ۔

کابل ہمیشہ سے اِس خطّے کا مرکز نہیں رہا۔ ہزاروں سال قبل اِن پہاڑوں کے دوسری طرف جُڑواں شہر کپیش اور کپیشا آباد تھے۔ سکندر آیا تو یہاں اس نے ایک یونانی شہر کی بنیاد رکھی۔ اُس کے بعد کُشان نے اِسے جمنا اور جیحون کے درمیان پھیلی ہوئی سلطنت کا صدر مقام قرار دیا۔ اِنہی کُشان کے زمانے میں بُدھ مت ہندوستان اور وسطِ ایشیا کے راستے چین تک پھیل گیا۔ وادئ بامیان میں مہاتما بُدھ کے سینکڑوں فٹ بلند ہیبت ناک مجسّمے اسی دَور کی عکاسی کرتے ہیں۔ بُدھ اور یُونانی تہذیب کے ملاپ نے "فنِ گندھارا" کو جنم دیا جو مشرق کی روحانیت اور مغرب کے فنّی کمال کا حَسین امتزاج تھا۔ اِن شہروں سے پَرے بدخشاں کی روسی سرحد کے ساتھ دریائے جیحوں جسے آمو اور آکسس کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، ایرانی اور طُورانی تہذیبوں کے درمیان سرحد بن کر بہتا ہے۔ جیحوں جس کے دامن میں بلخ آباد تھا۔ جسے "شہروں کی ماں" کا درجہ دیا گیا تھا جسے چنگیز اور تیمور کے قہر نے شکستہ میناروں، اُجاڑ معبدوں اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے ایک ڈھیر میں بدل دیا۔ بلخ جو مولانا رُوم کی جائے ولادت تھا۔

سیاحت کے دَوران کبھی ایسا دوراہا بھی آجاتا ہے جہاں سے دونوں راہیں خواب و خیال کی طلسمی وادیوں میں اُترتی ہیں اور سیّاح کے لیے اپنی منزل کا تعیّن کرنا بے حد دُشوار ہوجاتا ہے۔ ہم دوسری صبح قندھار جارہے تھے لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میں بلخ بھی دیکھ سکوں۔

"بخیر مے روی مومنان" کسی نے غُرّا کر کہا۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک ہٹّا کٹّا فقیر

ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ ہم قندھار جانے والی قادری سروس کی بس میں سوار تھے۔

"کچھ نہ کچھ ضرور دے دو۔ پردیس میں فقیروں سے بھی ڈرنا چاہیے" علی نے فقیر کا قد کاٹھ مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور سوچا اللہ کرے اس فقیر کی دعا سچ ہی ثابت ہو۔

بس پرانے اور نئے کابل کے جھمیلوں سے نکلی اور غزنی کی شاہراہ پر گامزن ہو گئی۔ افغانستان نے اپنی جغرافیائی پوزیشن کی آڑ لے کر دنیا کے تمام ملکوں سے بے پناہ امداد حاصل کی ہے۔ شمال میں روسی صنعت اور ذرائع نقل و حمل کی توسیع میں مصروف ہیں۔ مشرق میں امریکی زراعت کو ترقی دینے میں کوشاں ہیں۔ تعلیم کے میدان میں سویڈن اور جرمنی آگے آگے ہیں۔ کابل سے قندھار تک سڑک امریکیوں کی تیار کردہ ہے اور قندھار سے ہرات تک روسیوں نے بچھائی ہے۔ اتنی خوبصورت سڑکوں پر افغان جس قسم کی ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ بیس پچیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار کبھی بھی نہیں بڑھتی حالانکہ سڑک بالکل ایک لکیر کی طرح چلی جاتی ہے۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر اور دونوں اطراف غیر آباد پہاڑ۔ ایسی سڑک تو گرانڈ پری دوڑ کے لیے بھی موزوں رہے گی۔ میں نے ساتھ بیٹھے افغان سے ڈرائیوروں کی سست روی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا: "اوّل تو حکومت کی طرف سے حدِ رفتار متعین ہے۔ تجاوز کی صورت میں ڈرائیونگ لائسنس عمر بھر کے لیے چھن جاتا ہے۔ دوسرے ڈرائیور بھی نئے ہیں۔ مثلاً اس بس کا ڈرائیور پچھلے سال تک قندھار میں تربوز بیچا کرتا تھا۔ آپ شکر کریں کہ وہ بس سیدھی تو چلا رہا ہے۔" چنانچہ میں نے شکر کیا۔

اب ہم کابل کی نواحی آبادیوں سے بھی نکل آئے تھے۔ دائیں طرف کوہِ بابا اور نزدیک ہو گیا۔ برف چاندی کی تاروں کی مانند چوٹیوں سے نیچے وادی تک لٹکی ہوئی تھی۔ خنک ہوا کا ایک یخ بستہ جھونکا آیا اور میں نے بیگ سے سوئیٹر نکال کر پہن لیا۔

بس سڑک کے دائیں ہاتھ سرو کے درختوں کے جھنڈ میں مڑ گئی۔ سامنے غزنی تھا، سر بفلک اور خاموش۔ ہم سلطان محمود کا مزار چند کوس پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس کا غزنی ہمارے سامنے تھا۔ بس نے ایک اور موڑ کاٹا اور دھول سے اَٹے ہوئے ایک سنسان چوک میں کھڑی ہو گئی۔ "چائے کا وقفہ"۔ ڈرائیور نے اپنی گھنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ سامنے ایک بوسیدہ قہوے خانے پر "سلطان محمود ہوٹل" کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں اور علی باہر رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر "شیریں چائے" پینے لگے۔ کچھ مسافر چوک میں گھومنے لگے۔ بس کے ڈرائیور نے سرسری طور پر اِدھر اُدھر دیکھا اور ہوٹل کے ساتھ والے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی اوٹ میں بیٹھ کر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے لگا۔ مجھے کراہت آ گئی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شہر کے اوپر بالائے حصار کی دیواریں اپنی بربادی اور بے حرمتی پر نوحہ کناں ہیں۔ میری آنکھیں بند کیوں ہیں۔ میں نے سوچا، میں حال میں نہیں ماضی میں سفر کر رہا ہوں۔ میرے دل کی آنکھیں کھلی ہیں۔

آج سے ایک ہزار سال قبل غزنی کو وہ شان و شوکت اور عظمت نصیب ہوئی جو حال کے لندن اور نیو یارک کی قسمت میں بھی نہیں ہے اور یہ سب کچھ صرف محمود کی ذات سے تھا۔ سلطان محمود نے سینکڑوں محلات اور مسجدوں کے علاوہ یہاں ایک عظیم الشان لائبریری بھی تعمیر کروائی۔ اُس کے دربار میں امراء اور وزراء کے شانہ بشانہ شاعر، ادیب اور تاریخ دان بھی جلوہ افروز ہوتے۔ ان دنوں غزنی افغانستان کے صحراؤں میں ایک آبدار موتی کی طرح چمکتا تھا جس نے اپنی تابناک روشنی سے بغداد کو بھی ماند کر دیا تھا۔ سلطان محمود کا دارلسلطنت بے شک بے مثال تھا۔ محمود کو سومنات کے براہمنوں نے صرف ایک بُت کی خاطر بیس کروڑ روپے کی مالیت کے جواہرات بطور نذرانہ پیش کرنا چاہے اور محمود کا جواب اُن تمام

متعصب تاریخ دانوں کے منہ پر تھپیڑ ہے جو اسے صرف لٹیرے کا نام دیتے ہیں۔
سلطان نے کہا: "تمہاری وجوہات اپنی جگہ پر درست اور صائب ہیں لیکن محمود کبھی بھی تاریخ میں "بُت فروش" کے نام سے نہیں پہچانا جائے گا۔" سومنات کے ٹکڑے غزنی، مکہ اور مدینہ تک بھیجے گئے۔ ایڈورڈ گبن کے الفاظ میں: "اس نڈر مسلمان کو موسم کی سختیاں، پہاڑوں کی بلندیاں، دریاؤں کی وسعتیں، صحرا کی بیابانیاں، دشمن کی کثیر تعداد اور مقابلے میں ہاتھیوں کے لشکر کبھی بھی ہراساں نہ کرسکے۔ بے شک غزنی کا محمود مقدونیہ کے سکندر سے بھی عظیم تھا۔"

بقول فلپ ہٹی "اُس نے اپنے دارالسلطنت کو شاہانہ عمارات سے سجا دیا۔ ایک عظیم مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اپنے دربار میں شاعروں اور عالموں کو عالی مرتبے دیے گئے۔ عرب تاریخ دان اور "کتابِ یمینی" کا مصنف العطبی۔ سائنس دان اور تاریخ دان البیرونی اور فارسی کا عظیم شاعر فردوسی اُن میں سے چند ایک تھے۔"

ہندوستان، ایران اور طوران کے سلطان۔ ایک لاکھ پیدل فوج۔ پچپن ہزار گھڑ سواروں اور تیرہ سو ہاتھیوں پر مشتمل فوج کے سپہ سالار میں تکبر نام کو نہ تھا۔ دربار میں غزنی کے خزانے میں جمع دولت اور ہیرے جواہرات کی نمائش کی گئی تو وہ دُنیا کی بے ثباتی اور خدا کے خوف سے رو دیا۔ جس کے دربار میں رعایا کے ایک فرد نے دہائی دی کہ اے سلطان تیری فوج کے ایک تُرک سپاہی نے میرے خاندان کی بے حرمتی کرکے ہمیں گھر سے نکال دیا ہے تو محمود اپنی تلوار بے نیام کرکے اس کے ساتھ ہو لیا۔ گھر میں داخلے سے قبل سلطان نے تمام شمعیں گُل کرنے کا حکم دیا اور مجرم کو تاریکی میں ہی تہ تیغ کر دیا۔ شمعیں روشن ہوئیں تو وہ سجدے میں گر گیا اور پھر فریادی سے یوں گویا ہوا۔ "کہ جب تم نے مجھ سے اپنے گھر لُٹنے کی فریاد کی تو میرے دل میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ کہیں میرا اپنا فرزند ہی اس فعل کا ذمہ دار نہ ہو۔ کیونکہ میری فوج کے کسی سپاہی

کوئی جرأت نہیں ہو سکتی۔ میں نے شمعیں گل کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ میرا انصاف اندھا اور بے رحم ہو اور میں سجدہ ریز اس لیے ہوا کہ مجرم میرا بیٹا نہ تھا۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا فرزند مسعود تخت نشین ہوا۔ نئے سلطان کی تخت نشینی کے ساتھ ہی تُرک قبیلوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ مسعود اپنی فوج لے کر مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ ایک ایرانی تاریخ دان لکھتا ہے کہ مسعود اپنے باپ کی طرح نڈر تھا۔ وہ تلوار سونت کر دشمن کی صفوں میں گھُس گیا اور شجاعت کے ایسے عظیم کارنامے دکھائے جن کی مثال تاریخ کے صفحوں میں نہیں ملتی۔ فتح قریب تھی لیکن جب سلطان نے پیچھے مڑ کر اپنی سپاہ کی جانب دیکھا تو اس کی فوج میں شامل تُرک اُس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے بھائیوں سے جا ملے تھے۔ مسعود کو شکست ہوئی اور غزنی کی شاہانہ عظمت زندقان کے میدان میں دفن ہو گئی۔ اب سلطنت کے نئے حکمران کے چناؤ کا مسئلہ تھا۔ فاتح تُرک قبیلوں کے ہر سردار نے اپنا نام ایک تیر پر کھُدوا اور تمام تیروں کو ایک گٹھے میں باندھ دیا گیا۔ ایک معصوم تُرک بچے نے گٹھے میں سے ایک تیر اٹھا لیا۔ تیر پر سلجوق کے پوتے طغرل بیگ کا نام تھا۔ اور یوُں سلطان محمود کی عظیم سلطنت ایک قرعے سے تُرک گڈریے طغرل بیگ کے نام منتقل ہو گئی۔ غزنی کے جلال و جمال کے دن پوُرے ہو چکے تھے۔ ۱۱۵۰ء میں افغان علاؤالدین غوری نے رہی سہی کسر بھی پوُری کر دی۔ مردوں کو تہ تیغ کر کے عورتوں اور بچوّں کو غلام بنا لیا گیا۔ سلطان محمود کے تعمیر کردہ محلاّت اور عمارات کو بالکل تباہ کر دیا گیا اور شہر کو آگ لگا دی گئی۔ غزنی سات دن تک جلتا رہا اور مہینوں سُلگتا رہا۔

یوُں اس شہرِ بے مثال کی خوبصورتی اور عظمت تاریخ کے صفحوں پر منتقل ہو گئی۔

"سلطان محمود ہوٹل" کے سامنے چوراہے میں دھُول اُڑ رہی تھی۔ مسافر چائے پی چکے تھے اور ڈرائیور بھی فارغ ہو کر اپنا ازار بند کس رہا تھا۔ میری نظریں بالائے حصار

سے ہٹ کر آج کے غزنی پر مرکوز ہو گئیں۔ کچّے اور غلیظ مکانات، دھول سے اَٹی ہوئی تنگ گلیاں، غربت اور گندگی اور پھر شہر سے پرے محمود کے تعمیر کردہ "فتح کے مینار" جہاں بلخ اور بخارا سے آنے والی شاہراہ ختم ہوتی تھی۔ یہاں کے باشندے اب سیاحوں کی بخشش اور حکیم ثنائیؒ کے مزار پر آنے والے زائرین کی خیرات پر پلتے ہیں۔

بس سرو کے جھنڈ سے نکل کر قندھار کی جانب روانہ ہو گئی۔ غزنی نے مجھے اُداس کر دیا تھا۔

کابل کی خنکی نے صرف غزنی تک ساتھ دیا۔ اب ہوا گرم اور ریت آلود تھی۔ بنجر اور چٹیل پہاڑوں کا اُکتا دینے والا سلسلہ تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سڑک اور پہاڑوں کے درمیان ویرانے میں خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آتے۔ یوں لگتا جیسے سیاہ فام پرندوں کے غول کے غول دُبکے بیٹھے ہیں اور ذرا سی آہٹ سے اپنے چوڑے پر پھیلا کر فضائے بسیط میں پرواز کر جائیں گے۔ صدیوں سے یہ لوگ بہار کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے ہیں۔ اِن کے لیے ملک اور سرحدوں کی قید بے معنی چیزیں ہیں۔ یہ دنیا کے عظیم ترین سیاح ہیں۔ لیکن دِن بدن ان سرحدوں کو بند کیا جا رہا ہے جن کے وجود سے وہ اب تک بے خبر تھے۔ ماوراالنہر اور بدخشاں کے پرے آہنی پردہ پڑ گیا اور اب تو حکومتِ پاکستان نے بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ بہار کے مسافروں کو پہلی مرتبہ موسمِ خزاں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم "جاندر" میں رُکے جو چند دکانوں اور قہوہ خانوں پر مشتمل تھا۔ ہم ایک تنگ اور نشیبی دروازہ نما راستے سے قہوہ خانے میں داخل ہوئے۔ مٹی کے کمرے میں کھڑکی یا روشندان کی غیر موجودگی نے پورے ماحول

کو نیم تاریک اور پُراسرار بنا رکھا تھا۔ ہم کچے فرش پر بچھی ہوئی بوسیدہ دری پر بیٹھ گئے۔ ایک بوڑھے افغان نے پہلے ہاتھ دُھلائے اور پھر دستر خوان بچھا کر اُس پر سوپ کا پیالہ، بغیر مرچ کے بھُنے ہوئے گوشت کی کڑاہی اور ہاتھی کے کان جتنے نان رکھ دیئے۔ علی کو پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے پوچھا: "منگا دوں۔" کہنے لگا: "جی نہیں۔ قزلباش ہوتے ہوتے فارسی بولنا میرا پیدائشی حق ہے۔" اور افغان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "آغا آب خوردبیا۔" افغانستان میں قدیم فارسی مروج ہے جو آج کل بولی جانے والی فارسی سے یکسر مختلف ہے۔ افغان نے سَر ہلایا اور سوپ کا ایک اور پیالا لے آیا۔ علی کھسیانا ہو گیا۔ "اب یہ فارسی نہیں سمجھتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ باہر لگے ہوئے نل سے پانی پی لیتے ہیں۔"

باہر آئے تو ہوا کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ دُور صحرا میں بگولے اُٹھ رہے تھے اور سڑک پر کانٹے دار جھاڑیاں اُڑ رہی تھیں۔ چنگیز خان بھی تو اِن ہی صحراؤں کو پاٹ کر خراسان پر حملہ آور ہوا تھا، میں نے سوچا۔ سڑک سے کچھ دُور ویرانے میں ایک قدیم کاروان سرائے کے کھنڈر دھوپ میں چمک رہے تھے، ویران اور مہیب۔ زمانۂ قدیم میں طوران اور ایران کے مابین اِنھی راستوں پر قافلے سفر کرتے تھے جن کی شب بسری کے لیے ہر بیس کوس کی مسافت پر کاروان سرائے تعمیر کی گئیں۔ افغانستان میں جدید ذرائع نقل و حمل کے لیے تارکول کی سڑکیں بھی تقریباً اِنھی راستوں پر بنائی گئیں۔ مشینی ذرائع کی آمد سے کاروان اور قافلوں کا دَور ختم ہو گیا لیکن سرائیں اب بھی قائم ہیں۔ زیادہ تر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں لیکن کچھ اپنی اصلی حالت میں بھی موجود ہیں۔

میں نے علی سے کہا: "چلو ایک نظر اِس سرائے کو ہی دیکھ لیں۔"

"اور جو بس نکل گئی تو؟" اُس نے جھلا کر کہا۔ اُسے اب تک اُس کم فہم افغان پر

غصہ تھا۔

"تو کیا ہوا؟ رات وہیں بسر کریں گے۔ ہم سے پہلے کے لوگ بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ ذرا تصور کرو کہ تمہارا کاروان سمرقند سے ہرات جا رہا ہو۔ سارے دن کی مسافت کے بعد تمہیں شام ڈھلے ریت کے ٹیلے کے اوپر سے شفق کی سرخی میں نہائی ہوئی ایک رومانوی کاروان سرائے دکھائی دیتی ہے۔ کیا تم دیوانہ وار اپنے مریل اونٹ کو بھگا کر وہاں تک نہیں پہنچ جاؤ گے؟"

علی ہنسنے لگا۔ "چلو دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ مٹی کی بنی ہوئی چوکور قلعہ نما عمارت کے درمیان ایک وسیع تالاب تھا۔ جسے صحرا کے بگولوں اور آندھیوں نے ریت سے بھر دیا تھا۔ قافلے آتے تو اونٹوں کو پانی پلا کر صحن میں باندھ دیا جاتا اور مسافر چاروں طرف بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں سما جاتے۔ رات کو بکرے کا پورا دھڑ الاؤ پر بھونا جاتا۔ سرائے کے چھوٹے سے صحن پر ایک اچھے خاصے قصبے کا گمان ہونے لگتا۔ گوشت سے چربی پگھل کر سلگتی ہوئی لکڑیوں پر گرتی اور اس کی اشتہا انگیز خوشبو سرمئی دھوئیں میں مدغم ہو کر پوری فضا میں رچ جاتی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہر مسافر اپنی داستان سناتا اور مخالف سمت سے آنے والوں سے راستے کے بارے میں پوچھتا۔ مرو کے پاس قزاق تو نہیں؟ دشتِ مرگ کے نخلستانوں میں پانی تو نہیں سوکھ گیا؟ کاروان سرائے کا دروازہ ہر مسافر کے لیے کھلا تھا۔ یہ صحرا کا اصول تھا کہ جو بھی اِس کی چاردیواری میں داخل ہو جاتا، اُس کے جان و مال ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتے۔ تمام رنجشیں بھلا دی جاتیں۔ دوست اور دشمن ایک ہی چھت کے نیچے شب بسر کر کے دوسری صبح اپنی اپنی راہ لیتے۔

میں اِنہی خیالات میں گم تھا کہ بس کا ہارن متواتر بجنے لگا۔ اور ہم واپس آ گئے۔

سفر جاری ہوا تو پھر وہی بیابانی اور صحرا کی وسعتیں ساتھ ہو لیں۔ کبھی کبھی سڑک کے کنارے

چرتی ہوئی قراقلی بھیڑیں یک دم بس کے سامنے آجاتیں اور ہارن کی تیز آواز سے بدک کر اُچھلتی ہوئی یوں بھاگتیں جیسے بس کی بجائے کسی خونخوار بھیڑیے سے پالا پڑ گیا ہو۔ "پچھلے آٹھ گھنٹوں میں اِس سڑک پر صرف چار کاروں کا گزر ہوا"۔ علی نے حساب لگایا۔ آخر کاروں کا بیوپاری تھا۔

شام کے پانچ بجے ہم قندھار میں داخل ہوئے۔ کچے مکانات، تنگ گلیاں اور کہیں کہیں سَرو کے درخت۔ علی نے بس سے اُترتے ہی اناروں کی تلاش شروع کر دی جن کا موسم نہیں تھا۔ شاید اِسی لیے اکثر مکین بیماروں کی صورت بنائے پھرتے تھے۔ اڈّے کے گرد و نواح میں اکثر ہوٹل بے حد غلیظ اور تنگ تھے۔ تانگے والے کے مشورے پر "ہوٹل قندھار" کا رُخ کیا جو پُرانے شہر سے باہر جدید حصّے میں واقع ہے۔ ہوٹل کے کلرک نے کمرے کا کرایہ سو روپیہ بتایا چنانچہ واپس باہر آ گئے۔ ساتھ والی عمارت پر پاکستان کا چاند تارا لہرا رہا تھا، 'پاکستان کونسلیٹ قندھار'۔ ہم فوراً اندر پہنچ گئے۔ اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے کہ ایک پٹھان چوکیدار نمودار ہوا۔ "خو کس کو ملے گی؟" ہم نے سینہ تان کر کہا: "ہم پاکستانی ہیں اور یہاں رات بسر کرنا چاہتے ہیں"

وہ ہمیں عمارت کے پچھواڑے لے گیا جہاں ایک صاحب دبیز شیشوں کی عینک لگائے ٹائپ رائٹر پر جھکے ٹائپ میں مصروف تھے۔

"فرمائیے" انھوں نے ٹائپ رائٹر سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا۔

"ہم پاکستانی ہیں اور ہمیں رات گزارنے کے لیے کسی جگہ کی تلاش ہے"۔ میں نے کندھے سے سامان اتار کر نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوٹل نہیں ہے"۔ صاحب نے ہماری طرف بغور دیکھتے ہوئے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔ "ویسے کونسلیٹ میں ایک مہمان خانہ موجود ہے لیکن وہاں کونسل جنرل کی اجازت کے بغیر شب بسری ممکن نہیں"

"خوب۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "اور کونسل جنرل صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ شکار پر گئے ہیں۔" انہوں نے بے رُخی سے کہا اور پھر ٹائپ رائٹر پر جُھک گئے۔

"تو پھر آپ ہی کچھ بندوبست کر دیجیے۔ اب ہم کہاں مارے مارے پھریں گے۔" میں نے لجاجت سے درخواست کی۔ مجھ میں اب سارا سامان اٹھا کر واپس شہر جانے کی ہمت نہ تھی۔ علی پہلے ہی کوٹھی کے لان میں لیٹ کر سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔

"مجھے اس کا اختیار نہیں۔" صاحب کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "سفارتی قوائد کی رُو سے صرف کونسل جنرل کو ہی اختیار ہے۔"

میں نے خاموشی سے اپنا سامان کھولا۔ خیمہ نکال کر فرش پر رکھ دیا اور خیمے کے ڈنڈے آپس میں جوڑنے شروع کر دیے۔ صاحب نے کنکھیوں سے ساری کارروائی کا جائزہ لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"دیکھیے صاحب۔" میں نے جیب سے پاسپورٹ نکال کر شہریت کا صفحہ آگے کر دیا:

"میں پاکستانی شہری ہوں اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو پاکستانی کونسلیٹ قوائد کی رُو سے پاکستان کا ایک حصہ بنتا ہے۔ ان ڈنڈوں اور کپڑے کی مناسب تنصیب سے اِس لان میں ایک عدد خیمے کا ظہور ہو گا اور پھر آپ سفارتی قوائد کی رُو سے ہی ہمیں پاکستان کی سرزمین پر شب بسری سے منع نہیں کر سکتے۔"

صاحب ذرا گھبرا گئے۔ عینک اُتار کر جلدی سے شیشے صاف کیے اور دوبارہ پہن کر نہایت مشفقانہ انداز میں فرمایا: "مہمان خانہ بائیں طرف ہے۔ میں چوکیدار سے کہہ کر کھلوا دیتا ہوں۔ رات کا کرایہ دس روپے ابھی ادا کر دیجیے۔"

کمرہ نہایت آرام دہ اور ہر قسم کے سامانِ آسائش سے آراستہ تھا۔ شام کو تیار ہو کر باہر نکلے تو برآمدے میں انہی ٹائپسٹ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگے:

"یقین جانیے یہ میرے دائرۂ اختیار سے باہر تھا ورنہ ہم یہاں اپنے ہم وطنوں کی خدمت کے لیے ہی تو مامور ہیں۔ اگر کھانے کی غرض سے باہر جا رہے ہوں تو 'میر واعظ' عمدہ جگہ ہے۔"

"ہوٹل میر واعظ" کے رنگ برنگے شیشوں، مذہبی طغروں اور فلمی اداکاراؤں کی نیم برہنہ تصاویر سے مزیّن ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ اکثر لوگ کرسیوں پر پاؤں رکھے کھانا کھانے میں محو تھے۔ چند ایک نسوار چڑھا کر ناک پر رومال رکھنے کا تردّد کیے بغیر پوائنٹ بینک پھینکنے میں مصروف تھے۔ فضا میں چرس کی ناگوار بُو کا گمان ہوتا تھا۔ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے پٹھانوں کی ایک ٹولی ہال میں بجنے والی ہندوستانی موسیقی پر سر دُھننے پر ہی اکتفا کر رہی تھی۔ یعنی کھایا پیا کچھ نہیں۔ تین فلمی ریکارڈ سُنے اور چرس کا ایک سگرٹ پیا۔ کھانے کا آرڈر دیتے وقت میں ابھی 'خورد نوش' کی گردان کے جھنجھٹ میں پڑا ہوا تھا کہ ساتھ بیٹھے ہوئے قوی ہیکل پٹھان نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹھیٹھ پنجابی میں کہا: "بادشاہو کی کھاؤ گے۔"

'بادشاہو' نے بتایا کہ کیا کھائیں گے اور اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا:

"آپ پٹھان ہیں؟"

"جی ہاں پٹھان ہی سمجھیے۔ دراصل میں ہندو ہوں۔ ہمارے آبا و اجداد کئی سو برس پیشتر یہاں آ کر بس گئے تھے۔ قندھار میں سکھ اور ہندو بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ آپ نے رات بسر کرنی تھی تو مندر میں چلے آتے۔ وہاں بھنڈارا بھی مل جاتا۔" ہم نے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا ہی کریں گے۔ ہوٹل سے نکلے تو باہر ہُو کا عالم تھا۔ قندھار کے کوچہ و بازار سرِ شام ہی سنسان ہو چکے تھے۔

دوسری صبح کونسل کا چوکیدار ہمارے لیے ناشتہ بنا کر لے آیا۔ چائے، تلے ہوئے انڈے اور پراٹھے۔ ہم نے روانگی سے قبل ناشتے کے دام چکانے چاہے تو وہ

ناراض ہو گیا۔" خو تم پردیسی، امارا بائی۔" اُس کی اِس غیر متوقعہ مہمان نوازی نے ہمارے دل موہ لیے۔ ہم نے اپنا سامان باندھا اور بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ ہرات جانے والی بس کی روانگی میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ سامان بس پر رکھوا کر شہر کی سیر کے لیے نکل گئے۔ ابھی تک صرف قہوہ خانے اور تنور کھلے تھے۔ باقی تمام دکانیں بند تھیں۔ مرکزی چوک کے وسط میں سپاہی ٹریفک کنٹرول کرنے کی بجائے زمین پر بیٹھا تربوز کھانے میں مشغول تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے مزار کے دروازے پر ایک باوردی پہرے دار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہم باہر سے ہی جھانک کر واپس اڈے پر آ گئے۔

بس شہر کے باغات اور ہریاول سے نکل کر ایک مرتبہ پھر خشک پہاڑوں اور تا حدِ نظر پھیلے ہوئے ویرانوں کی آغوش میں چلی گئی۔ دائیں ہاتھ ایک بے ہنگم سا پہاڑ آیا جس کی چوٹی پر بابر کی فتوحات کی یادگار 'چہل زینہ' ہے۔ یادگار تک پہنچنے کے لیے چالیس پتھریلی سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ اکبر نے اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اِسی یادگار پر اپنی فتوحات کا پوسٹ سکرپٹ لکھوایا۔ بس ایک زوردار جھٹکے سے رُک گئی۔ میں نے باہر جھانکا۔ سڑک سے کچھ دُور ریت پر ایک مسافر بس اوندھی پڑی تھی۔ بس کے شکستہ ڈھانچے کی اوٹ میں حادثے میں ہلاک ہونے والے مسافروں کے لاشے پڑے تھے۔ صحرا کی تیز ہوا لاشوں پر ڈالی ہوئی چادروں کو اُڑائے لے جا رہی تھی۔ چادر سرکتی تو ادھ کھلی آنکھیں، کٹے ہوئے بازو اور بے جان دھڑ نظر آ جاتے۔ ایک زخمی مسافر پتھر چُن کر چادروں کے کناروں پر رکھ رہا تھا تاکہ ہوا کا زور انہیں اُڑا نہ لے جائے۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک چادر کے نیچے سنہری بالوں کی ایک لٹ ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ کوئی یورپی سیّاح تھا۔ جسے موت افغانستان کے صحراؤں میں کھینچ لائی تھی۔ حادثے میں بچ جانے والے مسافر بھی ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ وہ بھوتوں کی مانند اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ساری فضا میں ایک ناگوار بُو رچی ہوئی تھی۔

"حادثہ صبح چھ بجے ہوا" ایک مسافر کہہ رہا تھا "نزدیک ترین ہسپتال قندھار میں ہے۔ اُمید ہے طبّی امداد آج دوپہر تک پہنچ جائے گی۔"

گھر سے نکلنے کے بعد پہلی بار مجھے سفر کے خطرات اور صعوبتوں کا احساس ہوا۔ وحشت اور خوف کا ایک چھوٹا سا سنپولیا جو پہلے سے میرے دل کے کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ شڑاپ سے باہر نکلا اور اپنا ننھا منا پھن لہرانے لگا۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا، یہاں نہیں تو ایران یا ترکی میں سہی یا پھر۔۔۔ پھر کیا؟ میں نے نڈر بننے کی ناکام کوشش کی۔ حادثہ کہاں نہیں ہو سکتا۔ وہاں اپنے گھر کے سامنے سڑک پار کرتے وقت بھی تو ہو سکتا ہے۔ سنپولیا یہ بات سُن کر پھر کسی تاریک کونے میں دُبک گیا۔ ہماری بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں نے بلند آواز سے مرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کی اور ہم روانہ ہو گئے۔

دوپہر کو ہم 'گرشک' پہنچ گئے۔ جہاں سے کچھ فاصلے پر دریائے ہلمند کے کنارے لشکری بازار اور قلعہ بست کے کھنڈرات ہیں۔ محلات، مسجدیں، حفاظتی بُرج، فصیلیں اور بلند محرابیں صحرا میں بکھری پڑی ہیں۔ لشکری بازار غزنوی سلطانوں کا سرمائی دارالسلطنت تھا۔ ترکوں کے ہاتھوں سلطان مسعود کی شکست کے بعد جہاں غزنی برباد ہوا وہاں لشکری بازار کو بھی زوال آگیا۔ اس عظیم شہر کی حدیں دشتِ مرگ کو چھوتی تھیں۔ آب و ہوا خشک اور سخت گرم تھی۔ محلِ وقوع اور آب و ہوا ایک وسیع سلطنت کے دارالخلافے کی تعمیر کے لیے انتہائی ناموزوں تھی۔ برسوں سے آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور تاریخ دان اس گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرتے رہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کے تحت مجبور ہو کر غزنی کے سُلطانوں نے اس ویرانے کا انتخاب کیا۔ چند برس پیشتر کھُدائی کے دوران برآمد ہونے والی اشیا نے اس عقدے کو حل کر دیا۔ یہ تردد صرف ہاتھیوں کی خاطر کیا گیا تھا۔

اُن دنوں ہاتھی جنگی مُہمّات کا ایک لازمی اور فیصلہ کُن جُز ہوا کرتے تھے۔
یونانی سلوکس نے جو اِنہی اطراف کا حکمران تھا، ہمسایہ ایرانی سلطنت پر فوج کشی سے پہلے ہاتھیوں کی سپلائی کے لیے ہندوستانیوں سے "ٹینڈر" مانگے۔ چندر گپت موریہ نے کوہِ ہندوکش سے قندھار تک کا علاقہ بطور "کوٹیشن" لکھ دیا اور سلوکس کی طرف سے منظوری کا خط آنے پر آرڈر کے مطابق بڑھیا قسم کے فربہ ہاتھی سپلائی کر دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلوکس کا حریف، رنٹی گوسی میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کی کثیر تعداد دیکھ کر ہی بھاگ نکلا۔ محمود غزنوی بھی اپنی آئے دن کی ہندوستانی مہموں کے لیے ہاتھیوں پر بہت بھروسہ کیا کرتا تھا۔ موسم گرما میں غزنی خوشگوار رہتا مگر سرما کی شدت اِن قوی ہیکل جانوروں کو راس نہ آتی اور اِن میں سے اکثر فوت ہو جاتے! چنانچہ ایک گرم اور خشک جگہ کی تلاش ہوئی جہاں محمود کے چہیتے ہاتھی سردیوں میں خوش رہ سکیں۔ لشکری بازار کی تعمیر اِسی ضمن میں ہوئی۔ اِس سے قبل رومنوں نے بھی اپنے جنگی ہاتھیوں کی خاطر شام میں خصوصی شہر تعمیر کروائے۔

دھوپ کی شدّت میں کمی واقع ہو چکی تھی اور بھوری چٹیل اور بنجر زمین پر جابجا سبزے کے نشان اِس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ہماری منزل قریب ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ہم ایک گھنٹے تک ہرات پہنچنے والے ہیں۔

ہوٹل بہزاد۔ ہرات



ہرائے

"اور جب سکندرِ اعظم جنوبی پہاڑوں کی طرف سے نیچے آیا تو اُس نے وادی کے دامن میں ایک قدیم کاروان شہر "ہرائے" کے بالمقابل ایک اور "سکندریہ" کی بنیاد رکھی اور اپنی فوج کے مفلوج سپاہیوں کو وہاں آباد کر کے خود آگے بڑھ گیا۔"

'ہیرلڈ لیمب'

ہماری بس ایک خشک پہاڑی کو عبور کر کے ایک ہری بھری وادی میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہری رُود یعنی "دریائے ہری" بہہ رہا تھا۔ 'ہری' 'ہرائے' اور 'آریہ' تینوں ہرات کے قدیم نام ہیں۔ دریا کے پار سڑک کے دونوں طرف چیڑ کے درختوں کی قطاریں دُور تک چلی گئی تھیں۔ وادی کی ہریاول اور درختوں کے سبزے کو میری دُکھتی ہوئی آنکھوں نے اپنے اندر سمو لیا۔ مَیں نے آج تک جتنے بھی شہر دیکھے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اتنی خوبصورت سڑک کے اختتام پر نہیں ہے۔ دس بارہ میل کا یہ ٹکڑا دونوں طرف سے مختلف

قسم کے درختوں اور پھلوں کے باغات سے بھرا پڑا ہے۔ چیڑ کے اِنہی درختوں کو ایرانی مصوروں نے موتیوں کی ایک مالا سے تشبیہہ دی اور ہرات کو اُس کے درمیان میں جڑا ہوا یاقوت کہا گیا۔

درختوں سے پرے مٹی کی دبیز دیواروں کے پیچھے خوبصورت رہائشی مکانات سرو کے درختوں میں چھُپے ہوئے تھے۔ مشرق نے ہمیشہ سے ہی باطنی خوبصورتی کو ظاہر پر ترجیح دی ہے۔ ہم شہر میں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ بس ایک تنگ دروازے میں سے گزر کر ایک گندے اور تعفن سے بھرپور اڈے میں جا کھڑی ہوئی۔ ہم نے اپنا سامان اتارا اور اڈے سے باہر ایک وسیع اور کُشادہ پتھریلی سڑک پر آنکلے۔ سامنے "ہوٹل بہزاد" کا بورڈ دیکھ کر ہم اندر چلے گئے۔ ہوٹل صاف ستھرا اور مناسب تھا۔ ڈیسک سے کمرے کی چابی لے کر ہال میں داخل ہوئے تو سامنے 'سیاحوں سے درخواست' کے بورڈ پر نظر پڑی۔ "یہاں چرس پینا ایک حد تک منع ہی سمجھیں"۔ ٹھنڈے پانی کے غسل نے تمام دِن کی سُستی اور تھکن دُور کر دی۔ کھانے کے لیے نیچے کمرے میں آئے تو وہاں ہڑبونگ مچی تھی۔ زیادہ تر غیر مُلکی سیاح تھے۔ ایک لمبی داڑھی والے صاحب تین ڈالر وصُول کر کے سٹوڈنٹ کارڈ جاری کر رہے تھے۔ جنہیں دکھا کر بسوں اور ریل گاڑیوں کے کرائے میں تخفیف کروائی جاتی ہے۔ مجھ سے مخاطب ہوتے تو میں نے کہا: "مجبوری ہے، مَیں طالب علم نہیں ہوں"۔

داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمانے لگے: "تو برخوردار کارڈ بھی تو جعلی ہیں"۔

دوسری میز پر ایک فاقہ زدہ ہپی براجمان تھا۔ مَیں نے ہرات کی تاریخی عمارات کے بارے میں پُوچھا تو کہنے لگا: "چرس کے سگریٹ کا ایک کش مجھے اُن زمانوں میں لے جاتا ہے جب اِن عمارات کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اب دیکھ کر کیا کروں۔ پچھلے دو ماہ سے ہرات میں ہوں۔ چرس پیتا ہوں اور جیتا ہوں"۔

علی سامنے بیٹھی ہوئی امریکی لڑکی کی طرف دیکھ کر برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر ہماری میز پر آئی "میں کوکا کولا پیوں گی" علی نے فوراً منگا دیا۔ بل آیا تو معلوم ہوا تین روپے کا ہے اور ایران سے درآمد شدہ ہے۔ کوکا کولا پی کر لڑکی نے اپنی نیلی پتلون کی جیب سے ایک بھورے رنگ کی ڈلی نکالی اور میز پہ رکھ دی۔ ایک سگریٹ کا آدھا حصّہ تمباکو سے خالی کر کے ڈلی کو ماچس جلا کر پگھلایا اور تمباکو میں بڑی مشاقی سے مَل دیا۔ اس مرکّب کو سگریٹ کے خالی حصّے میں بھرا اور ایک لمبا کش لگا کر علی کی طرف بڑھا دیا "پیو"

"یہ کیا ہے؟" علی بالکل بوکھلا گیا۔

"چرس اور کیا؟" اور اس نے دھواں علی کے مُنہ پر بکھیر دیا۔ علی نے دبی زبان میں موچی دروازے کا پیدائشی حق استعمال کیا اور ہم کھانا کھائے بغیر ہوٹل سے باہر آگئے۔

ہرات کے بڑے بازار میں خوب رونق تھی۔ قدیم وضع کی تنگ دکانوں کے باہر خوبصورت پوستینیں، کھالیں، نمدے اور خراسانی قالین سجے ہوئے تھے۔ مجھے ہلکے بھورے رنگ کی ایک پوستین پسند آگئی جس کے گلے اور بازوؤں پر سفید دھاگے کی کڑھائی بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

"خالص قراقلی ہے" دکان دار نے کہا "آپ کے لیے صرف تین ہزار افغانی" سودا پندرہ سو میں طے ہو گیا۔ میں نے پوستین پہن کر دکان کے شیشے میں دیکھا، خاصا سمارٹ لگ رہا تھا۔ ہم سیر کرتے ہوئے بڑے چوراہے تک آگئے جو پورے ہرات کا مرکز ہے۔ چوک سے بائیں ہاتھ جاتی ہوئی سڑک کے آخر میں مسجد جامی کے میناروں اور گنبدوں کا ہلکا سا خاکہ تاریکی میں نظر آرہا تھا۔ ایک بوڑھا افغان فٹ پاتھ پر بیٹھا گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سیخوں پر بھون رہا تھا۔ ہم نے

وہیں کھڑے ہو کر چند سیخیں کھائیں اور واپس ہوٹل کی طرف چل دیے۔ راستے میں بوندا باندی شروع ہو گئی جو ہوٹل پہنچنے تک تیز بارش میں بدل چکی تھی۔ میں نے کمرے میں جا کر کھڑکی کھولی تو ہرات کی کچی گلیوں کی سوندھی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی۔ سڑک کے پار قہوہ خانے میں چند افغان کوئی قدیم خراسانی لوک گیت بلند آواز میں الاپ رہے تھے۔ بستر کے ساتھ سفید دیوار پر کسی منچلی سیاح نے سرخ لپ سٹک سے 'ہوٹل بہزاد' لکھا ہوا تھا۔ جس کے نام نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ میرا پسندیدہ مصوّر بہزاد جو ایرانی نقاشی کی تاریخ میں بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ اسی شہر میں پیدا ہوا۔ وہ تیموری سلطان حسین مرزا کے دربار میں مصاحب تھا۔ اُس زمانے میں ہرات تیمور کے سمرقند سے بھی دولت مند اور حسین تھا۔ اُس نے تیمور کے عسکری کارناموں پر مبنی ایک مصوّر کتاب تخلیق کی جس کی تصاویر رنگوں کے حسین امتزاج کا نمونہ تھیں نیلے نارنجی اور گہرے سبز رنگ۔ بہزاد کی تصاویر میں زندگی حرکت کرتی نظر آتی۔ انسان، جانور، درخت، صحرا سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے۔ مختصر تصویر کشی میں بہزاد بلاشبہ سب سے بلند ہے۔ آج شہرِ بہزاد کے اکثر باشندے اس کے نام سے بھی ناآشنا ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی جائے ولادت کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا۔ میں انہی خیالات میں مگن تھا کہ نیند نے آلیا۔

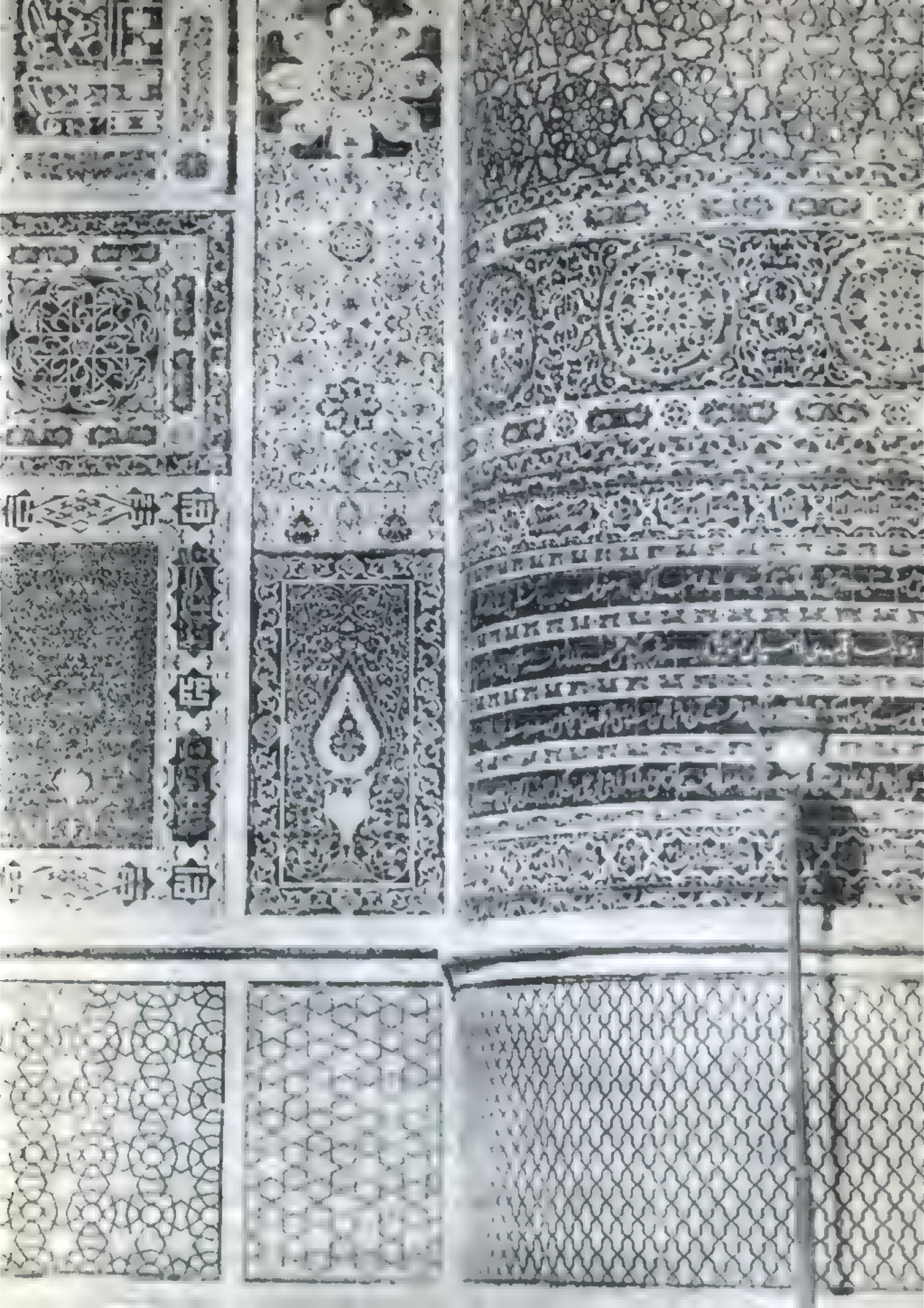
دوسری صبح ہم ناشتے کے لیے ایک قہوہ خانے میں چلے گئے۔ تنور کے ساتھ مٹی کے فرش پر دری بچھی تھی۔ الاؤ کی حدت فرش میں سرایت کر کے ہم تک پہنچ رہی تھی۔ تازہ میٹھی بالائی اور گرم نانوں کے بعد قہوہ آگیا۔ پیالیوں کی تہ میں باریک چینی پہلے سے موجود تھی۔ آپ قہوہ پیالی میں انڈیلتے تو چینی کی ایک تہ خود بخود گھل جائے گی اور آخری پیالی تک آپ کا ساتھ دے گی۔ آج ہرات کی سیر کا پروگرام تھا۔

ہرات اور قدیم تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کسی زمانے میں اِس کی

خوبصورتی ضرب المثل تھی۔ ایک پرانی کہاوت کے مطابق خراسان ایک صدف تھا جس میں ہرات ایک آبدار موتی کی طرح چمک رہا تھا۔ ۱۳۴۰ء میں ابن بطوطہ کا یہاں سے گزر ہوا تو اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا "پھر ہمارا شہر ہرات میں ورود ہوا۔ یہ خراسان کے تمام شہروں میں سے زیادہ آباد ہے۔ خراسان کے شہر بڑے بڑے ہیں جن کی تعداد چار ہے۔ ان میں دو یعنی ہرات اور نیشاپور آباد ہیں اور دو یعنی بلخ اور مرو ویران پڑے ہیں"۔ قدیم تاریخ میں اس علاقے کو 'آریا' یا 'آریانہ' یعنی نسل آریہ کا مسکن کہا جاتا تھا جو بعد میں بگڑ کر 'ہری' ہو گیا اور پھر ہرات کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر کے جنوب میں 'ہری رود' یعنی 'دریائے ہری' اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ ۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر اعظم نے اسے 'آرتاکونا' کا یونانی نام دیا اور اس کے بالمقابل ایک نیا شہر 'سکندریہ' آباد کیا۔ فرشتہ کی تاریخ کے مطابق ۶۵۱ء میں ——— حضرت عثمان کے گورنر عبداللہ بن امیر کے ہاتھوں ہرات فتح ہوا اور ایران کی مسلم سلطنت کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔ ان دنوں یہاں کی اکثر آبادی حضرت زرتشت کی پیروکار تھی۔ غزنوی سلطانوں اور سلجوق ترکوں کے بعد یہ شہر خوارزم کے سلطانوں کے زیر نگیں آگیا۔ اس دور میں ہرات خوبصورت عمارات اور زمین کی زرخیزی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ایران اور طوران کی خوں ریز جنگوں کے باوجود ہرات کی خوشحالی میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ ایک ایسا اہم تجارتی مرکز بن گیا جہاں سمرقند، بخارا، دہلی اور دمشق سے آتی ہوئی عظیم شاہراہیں آپس میں ملتی تھیں۔ ایک تاریخی دستاویز کے مطابق ۱۲۱۹ء میں ہرات میں بارہ ہزار دکانیں، ڈیڑھ لاکھ رہائشی مکانات، ساڑھے تین سو مدرسے، چھ ہزار حمام، سرائے، پن چکیاں اور درجنوں شاہانہ محلات تھے۔ یاقوت نے اسے خراسان کا امیر ترین اور سب سے بڑا شہر قرار دیا۔ امن و آشتی کی اس فضا میں چنگیز خاں کے حملے نے زہر گھول کے رکھ دیا۔ ہراتی تاریخ دان خوندمیر کے مطابق

"چنگیز خاں کے دو حملوں میں پندرہ لاکھ سے زائد شہری قتل ہوئے۔ سب سے پہلے ۱۲۱۹ئہ میں چنگیز خاں نے ہرات کو تباہ کیا لیکن سلطان جلال الدین نے کمال شجاعت سے تاتاریوں کو مار بھگایا۔ تین برس بعد ایک مرتبہ پھر تاتاری حملہ آور ہوئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ہرات زندگی کی ایک رواں دواں لہر تھی اور چند سالوں میں ہی انہی کھنڈرات سے ایک نئے ہرات نے جنم لیا جسے غوری سلطانوں کے تحت ایک مرتبہ پھر "چمنِ ایشیا" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اِس کے کوچہ و بازار میں یہ کہاوت عام ہو گئی کہ ہرات ہی دنیا کا خوبصورت ترین شہر ہے۔ دائمی امن اور خوشحالی شاید اِس شہر کے مقدر میں نہ تھی۔ ۱۳۸۱ئہ میں امیر تیمور وسطِ ایشیا کے ترکوں کی معیت میں سمرقند سے نکلا اور ہرات پر حملہ آور ہوا۔ شاہی خزانے کے بیش قیمت جواہرات، طلائی تاج اور تمام سونا چاندی جیحوں کے پار سمرقند میں منتقل کر دیا گیا۔ شہر کی فصیلیں مسمار کر دی گئیں اور حفاظتی دروازے اُکھاڑ کر فتح کی یادگار کے طور پر تیمور کی جائے پیدائش کیش میں بھجوا دیے گئے۔ ہرات ایک مرتبہ پھر اُجڑ چکا تھا۔ تقریباً آٹھ سال بعد جب امیر تیمور نے خراسان، سیستان اور مازندران کے علاقے اپنے بیٹے شاہ رُخ کو سونپے تو اُس کی نگہ انتخاب اپنے باپ کے تباہ کیے ہوئے ہرات پر پڑی اور اُس نے اسے اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ شاہ رُخ نے منہدم فصیلیں دوبارہ تعمیر کروائیں اور شہر کے حفاظتی دروازے کیش سے واپس لاکر پھر نصب کروا دیے۔ سمرقند کے ماہر معماروں کو شہر کی تعمیرِ نو پر مامور کیا گیا۔ شاہ رُخ کا عہد ہرات کی تاریخ کا حسین ترین دَور ثابت ہوا۔ وسطِ ایشیا کا یہ دارالسلطنت اب مشرقی شہروں کی ملکہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اِس کا حکمران تلوار کا دھنی ہونے کے علاوہ انصاف پسند اور انتہائی پرہیزگار بھی تھا۔ شاہ رُخ کی حسین ملکہ گوہر شاد نے ہرات کو خوبصورت اور عالی شان محلات سے سجا دیا۔ آج شہر سے باہر



ایک لق و دق صحرا میں اِس حسین ملکہ کے مقبرے کے کھنڈرات بکھرے پڑے ہیں۔ مقبرے کے شکستہ گنبد کی دیدہ زیب نیلی اینٹیں خراسان کی تپتی دوپہر میں چمکتی ہیں تو ویرانے میں نیلگوں رنگوں کی لہریں اُبھرنے لگتی ہیں۔

شاہ رُخ کی وفات کے فوراً بعد اُس کے بیٹے اور شاہی خاندان کے متعدد شہزادوں کے درمیان تخت کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں سلطان حسین مرزا فتح یاب ہوا اور سن ۱۴۶۹ء میں تخت نشین ہوا۔ حسین مرزا کو سائنس کے علاوہ فنونِ لطیفہ سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ اُس کے دربار میں شاعروں اور مصوروں کو غلبہ حاصل تھا۔ بہزاد ان میں سے ایک تھا۔ ۱۵۰۵ء میں سلطان حسین مرزا فوت ہو گیا۔ ہرات کی شہرت اور خوبصورتی اِس نکتے پر آ کر ٹھہر گئی۔ حسین مرزا کے بیٹوں کی دعوت پر کابل اور غزنی کا حکمران بابر، ہرات گیا جہاں اُس کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ "تزک بابری" کے صفحات میں بابر کی ہرات سے بے پناہ وابستگی پائی جاتی ہے۔ اُس کا بیٹا ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ہندوستان سے فرار ہوا تو اُسے ہرات میں ہی پناہ ملی۔ اِس کے بعد ہرات کا شاندار دَور بتدریج تنزل پذیر ہوتا گیا اور اِس کی شہرت کا سورج گہنا گیا۔

آج کا پُرانا ہرات چند قدیم عمارات، کچّے مکانات اور غلیظ بازاروں پر مشتمل ہے۔ البتہ شہر کے نواح میں گورنمنٹ کے دفاتر، ایئر پورٹ اور نئی آبادیاں جدید تہذیب کی مظہر ہیں۔ اہلِ ہرات کو اپنے تیموری عہد سے بے حد لگاؤ ہے۔ ملکہ گوہر شاد کی خوبصورتی، حسین مرزا اور شاہ رُخ کی شجاعت کی داستانیں خراسانی لوک گیتوں میں ڈھل چکی ہیں۔

ہرات کی خوبصورت ترین عمارت مسجدِ جامی شہر کے جنوبی کنارے پہ واقع ہے۔ باہر سے مسجد کی وُسعت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ ہم اندر داخل ہوتے تو اِس کے وسیع صحن اور گنبدوں نے ہمیں اِس کی عظمت اور خوبصورتی کا احساس دلایا۔ مسجد بالکل ویران پڑی تھی۔ رات کی بارش سے میناروں اور گنبدوں کی دیدہ زیب اینٹوں کی نیلاہٹ



اور نمایاں ہو چکی تھی اور تمام عمارت غیر مرئی طور پر شفاف نیلگوں آسمان میں جذب سی ہو گئی تھی۔ اکثر جگہ نیلی اینٹیں اور پتھر اکھڑ چکے تھے جن کی مرمت کا کام جاری تھا۔ مسجد کے برآمدے میں چند ہنر مند کاریگر نئی اینٹوں کی تراش خراش میں مصروف تھے۔ مسجد کی موجودہ صورت ۱۲۰۰ء میں غیاث الدین غوری کے دور میں ظہور پذیر ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان نے یہ مسجد مشہور بزرگ فخر الدین راضی کے لیے تعمیر کروائی۔ راضی کا مزار مسجد سے ملحق اُن کے حجرے میں واقع ہے۔

شہر سے باہر ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کے قریب شیخ بیقارا کے مدرسے کے چار سربریدہ مینار کھڑے ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں انگریز افواج نے مدرسے اور مسجد کو منہدم کر دیا تاکہ حملہ آور اُسی عمارت کی چھت پر اپنا توپ خانہ نصب کر کے شہر پر گولہ باری نہ کر سکیں۔

ہم جب ہرات چھوڑ رہے تھے تو بیقارا مدرسے کے پُرشکوہ مینار صحرائی وسعتوں میں دراز قد زرافوں کی طرح گردنیں اُٹھائے کھڑے تھے۔ اُن کی بلندی اور خوبصورتی پر وقت کی تباہ کاریاں بھی اثر انداز نہ ہو سکی تھیں۔



شہرِ بہزاد سے شہرِ خیام تک

کسٹم کی دو عمارتوں اور ایک ہوٹل پر مشتمل اسلام قلعہ کی سرحدی چوکی ہرات سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ افغان کسٹم سے جلد ہی فراغت ہو گئی اور ہم کسٹم ہاؤس سے باہر سڑک پر سواری کی تلاش میں آن کھڑے ہوئے۔ یہ سرحد دوسری بین الاقوامی سرحدوں سے مختلف ہے۔ افغان سرحد عبور کرتے ہی ایران نہیں آ جاتا، بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان دس بارہ میل کا ایک ویران ٹکڑا ہے جو No Man's Land یعنی کسی ملک کی ملکیت میں نہیں، چونکہ یہاں باقاعدہ آمد و رفت کا انتظام نہیں، اس لیے اس ویرانے کو عبور کرنے کے لیے آپ اپنی تخلیقی صلاحیت، ہمت، اُپج سبھی کا بیک وقت مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ ہم اِس مِنی صحرا کو پاٹنے کی فکر میں تھے کہ تین پاکستانیوں سے ملاقات ہو گئی جو سڑک پر دھرنا مارے جماہیاں لے رہے تھے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے تھے ہم بھی انہی کے برابر سامان زمین پر رکھ کر بیٹھ گئے اور سواری کی راہ تکنے لگے۔ دو حضرات تو بندر عباس سے کویت سمگل ہونے کی فکر میں تھے اور تیسرے جو ذرا اُدھیڑ عمر کے تھے اور

چہرے مہرے سے ذرا بھی سپورٹس مَین نہیں لگتے تھے، سیالکوٹ کی کسی فرم کے لیے آرڈر لینے نکلے تھے۔ منزل یورپ تھی، دوپہر سے شام ہو گئی، لیکن اُس پار جانے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ سیالکوٹ کے شیخ صاحب جو عرصہ دراز سے کاروبار کے سلسلے میں ہر سال یورپ اور افریقہ جاتے تھے، ہمیں اس دوران میں اپنے پہلے دوروں کے دلچسپ واقعات سُناتے رہے۔ زیادہ تر ذکر اُن کی ذاتی وجاہت اور کشش کا تھا جو بقول اُن کے صنفِ نازک کے لیے بے حد مہلک ثابت ہوتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب وہ سوڈان میں گھوم پھر رہے تھے ایک سیاہ فام جنگلی خاتون اُن پر فدا ہو گئیں اور اُس نے انہیں اپنے جھونپڑے میں رات بسر کرنے کی دعوت دی اور پھر وہ سرد آہ بھر کے اپنے خضاب رسیدہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے، پھر کیا بتاؤں کہ رات کیونکر کٹی۔ آپ تو اپنے بچّوں کی طرح ہیں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ اطالیہ سے یونان سمندری جہاز کے ذریعے سفر کر رہے تھے کہ ایک یونانی لیڈی نے ۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر گاہے گاہے آنکھیں بند کر کے گنگنانا شروع کر دیتے۔ ہم ابھی شیخ صاحب کی رومانی داستانوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہرات کی جانب سے ایران آئل کمپنی کا ایک دیوہیکل آئل ٹینکر نمودار ہوا جو ظاہر ہے ایران کی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو آر سی ڈی کے واسطے سے ایران کے سرحدی قصبے یوسف آباد تک لے جانے کی درخواست کی۔ اُس نے ہامی بھر لی اور ایک آدمی کے لیے تو اگلی سیٹ پر جگہ ہے اور باقی حضرات ٹینکر کی چھت پر سوار ہو جائیں۔ کرایہ پچاس افغانی پیشگی۔ ہم نے شیخ صاحب کی بزرگی کو مدِّنظر رکھتے انہیں اگلی سیٹ الاٹ کر دی اور خود ٹینکر کی آہنی سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ گئے جو خاصی بلند تھی۔ پٹرول کی ٹینکی پر لوہے کی سلاخوں کا جال تھا جس پر بیٹھنا ممکن نہ تھا اس لیے سامان بچھا کر لیٹ گئے اور جنگلے کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"ہوشیار باش"۔ ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کرتے ہوئے خبردار کیا۔ ٹینکر ارنا بھینسے کی

مانند ڈکراتا ہوا حرکت میں آیا اور ہم عازم ایران ہوئے۔ طاقت ور انجن کی پھنکار کچی سڑک کے سینے سے دھول کا غبار اٹھاتی اور ہم اس کی لپیٹ میں آکر بھوت بن جاتے۔ ٹائر تلے ایک چھوٹا سا کنکر بھی آجاتا تو ہم ہوا میں اُچھل جاتے۔ میں چھپکلی کی طرح اوندھے منہ لیٹا سلاخوں سے چمٹا ہوا تھا۔ اپنی حالت پر ہنسی بھی آرہی تھی اور پھر خوف بھی کہ خوامخواہ ٹینکر پر سواری کی حماقت کی۔ اگر یہ دیو اُلٹ جائے تو ہزاروں گیلن پٹرول بھسم کر کے رکھ دے گا۔ چند میل کی مسافت کے بعد جب اُچھل کود اور دھول پھانکنے کی عادت ہو گئی تو میں نے سر اُٹھا کر علی کی جانب دیکھا۔ وہ ایک کونے میں لیٹا مزے سے سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگرٹ ؟ میرا دماغ اُلٹ گیا۔

"علی" میں نے چیختے ہوئے کہا: "سگرٹ بجھا دو"

"وہ کیوں ؟" اس نے ایک اور کش لگا کر کہا اور اسی لحظے اس نے جلتا ہوا سگرٹ ہوا میں اچھال دیا۔ اس کو خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ علی کا رنگ بالکل زرد تھا۔

دُور تاریکی میں یوسف آباد کی برقی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ ٹینکر کسٹم ہاؤس میں داخل ہوا تو ہم سر سے پاؤں تک دھول میں اٹے پڑے تھے اور جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ حافظ و سعدی کے دیس سے ہمارا تعارف انتہائی گرد آمیز اور غیر شاعرانہ انداز میں ہوا۔

یوسف آباد بالکل وائلڈ ویسٹ (Wild West) کے ایک چھوٹے قصبے سے مشابہت رکھتا تھا۔ گرد آلود چوڑی سڑک، چند قہوہ خانے، ایک دو سرائیں اور پولیس سٹیشن۔ شب بسری کے لیے ہم نے ایک قدیم سرائے کا انتخاب کیا جس کے وسط میں بوسیدہ تالاب تھا۔ تالاب کے کائی والے پانی کے اندر خودرو گھاس کی تہیں تھیں اور اس کے کے ساتھ باغ میں جنگلی بیلوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اس سارے گورکھ دھندے کے چاروں طرف تنگ کوٹھڑیاں تھیں جہاں ہمارا قیام تھا۔ کھانے سے پہلے ہم نے سرائے کے مالک سے غسل خانے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ مُسکرا دیا: "ایران میں غسل خانے نہیں حمام ہوتے ہیں۔ سرائے کے پچھواڑے والی گلی کے کونے پر چلے جائیے۔"

میں اور علی جب حمام کے بلند اور بالا چوبی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو یوں معلوم ہوا جیسے الف لیلہ کے کسی طلسمی غار کا دہانہ کھل گیا ہو۔ خادم نے بڑھ کر سلام کیا اور تولیوں اور چادروں کا بنڈل ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ سفید اور نیلے ٹائلوں سے مزین ہال کمرے کے درمیان سنگِ مرمر کے بنے ہوئے خوبصورت تالاب میں فوّارہ اُبل رہا تھا۔ تالاب کے گِرد کا تمام فرش ایرانی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا جہاں ایرانی دہقان کمر میں چادریں باندھے بیٹھے تھے۔ بعض چائے سے دل بہلا رہے تھے اور چند خادموں سے مالش کروانے میں مصروف تھے۔ کمرے کے چاروں طرف حمام ہی حمام تھے۔ خادم نے ایک حمام کا دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ حمام دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ میں نے اپنے دھول سے اٹے ہوئے کپڑے تہ کر کے تھڑے پر رکھ دیے اور ساتھ والے حصّے میں چلا گیا جہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل لگے تھے۔ گرم پانی کی تیز دھار میرے جسم کی ساری تھکن اور گرد بہا کر لے گئی۔ لذّت اور سکون کی خوشگوار لہر نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی اور میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ میں بہت دیر نہاتا رہا یہاں تک کہ میری انگلیوں کے گول سرے پچک سے گئے اور میں وہاں سے اُٹھ کر ساتھ والے حصّے میں چلا آیا۔ یہاں میں نے ایک چادر اپنی کمر میں باندھ لی اور دوسری کندھوں پر ڈال کر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں بھاپ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار پر آویزاں قدِ آدم آئینے کی نم آلود سطح پر میرا دُھندلا دُھندلا عکس اُبھر رہا تھا۔ میں اُس وقت ایک موٹا رومن لگ رہا تھا جو ٹوگا باندھ کر روم کے کسی شاہی حمام میں بیٹھا ہوا ہو۔ اتنے میں خادم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور گرم چائے کا ایک گلاس مجھے تھما دیا۔ میں خاصی دیر وہاں بیٹھا چائے اور سگرٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

حمام ایرانی تہذیب کا لازمی جُزو ہیں۔ رہائشی مکانوں میں غسل خانے تعمیر کرنے کا رواج نہیں۔ لوگ گھروں سے تیار ہو کر حمام میں آجاتے ہیں اور غسل اور مالش کے بعد یہیں سے

سیدھے دفتر یا کاروبار پر چلے جاتے ہیں۔ رات کو پارٹی ہو تو کھانے سے پہلے مہمانوں کو اعلیٰ درجے کے حمام میں مدعو کیا جاتا ہے۔ کاروباری معاملات بھی حمام کے ماحول میں بہتر طور پر طے پا سکتے ہیں۔ امتحان نزدیک آجائے تو طالب علم تالاب کے کنارے چادر باندھ کر بڑے سکون سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ہم حمام سے باہر نکلے تو یوسف آباد تاریک اور خاموش تھا۔

دوسری صبح سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے ہم مشہد کے لیے روانہ ہو گئے۔ بس میں سوار اکثر مسافر مشہد میں حضرت امام رضا کے روضے کی زیارت کرنے جا رہے تھے خراسان کا زمینی منظر بے حد اکتا دینے والا ہے۔ بھوری بنجر زمین، خشک جھاڑیاں اور چٹیل پہاڑ باقاعدگی سے نظر کے سامنے آتے ہیں کہ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں، لیکن صبح و شام سورج کی کرنیں اس ویران خطے میں بھی رنگ بھر دیتی ہیں۔ اُس صبح بھی تا حدِ نظر سنہری کرنیں اور خاک کے ان گنت رُوپہلی ذرّے نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں دمک رہے تھے۔ صحرا کا حسُن اُس کی وسعت اور نیلے آسمان کے امتزاج سے ہوتا ہے اور اُس وقت ہماری نظریں خوبصورتی کے اس عظیم شاہکار کی چمک سے خیرہ ہو رہی تھیں۔

دوپہر تک ہم جامی کے شہر تربتِ جام سے گزر کر شہرِ فریمان پہنچ گئے۔ افغان شہروں کی ویرانی اور بے ترتیبی کے بعد ایرانی شہروں کی صفائی اور خوبصورتی نہایت خوشگوار تبدیلی تھی۔ ستھرے اور کشادہ بازار جن کے گرد پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ سفیدے کے درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں، دکانوں کی سجاوٹ میں سلیقے اور ذوق کا رنگ، خوش پوشاک اور ہنس مکھ باشندے۔ فریمان میں چائے کا وقفہ تھا۔ ہم ایک قہوہ خانے کے باہر فٹ پاتھ پر لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر شیشے کے صراحی نما نازک گلاسوں میں چائے کا لطف اُٹھانے لگے۔ افغانستان کی نسبت موسم خنکی مائل تھا۔ دھوپ کی نرماہٹ بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ ہماری میز کے ساتھ

زمین پر بیٹھا ہوا ایک ایرانی چھوٹے تیشے کی مدد سے قند کے راکٹ نما ٹکڑے کو چھوٹی چوکور ٹکڑیوں کی شکل دے رہا تھا۔ اس کے تیشے کی ہر چوٹ اتنی نپی تلی ہوتی کہ مجال ہے جو کسی بھی ٹکڑی کے حجم یا وضع میں ذرّہ برابر فرق آئے۔ ایک ماہر سنگ تراش کی مانند اُس کی ہر کاٹ ایک شاہکار کو جنم دے رہی تھی۔ تیشے کا ایک وار قدرے ترچھا پڑا تو قند کی ایک ڈلی ڈھپ سے سفید اولے کی مانند ہماری میز پر آگری۔ میں نے جلدی سے ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھ لی اور ایرانی قند تراش کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "بالے بالے" اس نے گردن ہلائی اور ہنسنے لگا۔ سامنے گُل و رنگ میں رچے ایک قطعے کے درمیان فنِ بُت تراشی کی باریکیوں سے یکسر مبرا شاہ کا مُجسّمہ نصب تھا۔ "اسے بھی پتھر کی بجائے قند کا ہونا چاہیے"۔ میں نے منہ میں گھلتی ہوئی شیرینی کا مزا لیتے ہوئے سوچا۔ اتنے میں ڈرائیور نے ہارن بجایا اور تمام مسافر پھر سے بس میں سوار ہو گئے۔ فریمان کے بعد بیابانی کچھ کم ہونے لگی۔ کہیں کہیں خشک پہاڑوں کے دامن میں جنگلی گُلِ لالہ کے سُرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔

پچھلے پہر ہم مشہد کے نواح میں پہنچے۔ شہر کے اُفقی خطوط میں سب سے نمایاں امام رضا کے روضے کا سُنہری گنبد تھا جو دوسری عمارتوں سے بلند دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بس اڈّے پر کھڑی ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ روضے کی زیارت سے پیشتر اسٹیشن سے تہران روانہ ہونے والی گاڑی کا وقت دریافت کر لیا جائے۔ مشہد کا ریلوے اسٹیشن حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔ جدید فنِ تعمیر کے نمونے کی ایک کشادہ اور وسیع عمارت ہے جس کی چھت ایک خصوصی حیثیت کی حامل ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ستونوں کے بغیر کھڑا ہوا اتنا بڑا اور اونچا چھجا ابھی گر پڑے گا۔ بہرحال اُس روز تو بچاؤ ہو گیا۔ اندر داخل ہوئے تو معلومات اور ٹکٹوں کی کھڑکیاں بند تھیں اور پورا ہال بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک خاکروب سے معلوم ہوا کہ صبح ایک گاڑی تہران سے آتی ہے جو شام کو واپس چلی جاتی ہے۔ وقفے میں

اسٹیشن کے عملے کے ارکان گھر جا کر قیلولہ فرماتے ہیں۔ شیخ اور دوسرے پاکستانی ابھی تک ہمارے شریکِ سفر تھے۔ انہوں نے انتظار خانے کے بینچ پر استراحت کا ارادہ کرتے ہوئے کہا "مشہد سخت مذہبی شہر ہے۔ مجھے موافق نہیں آ سکتا۔ آپ لوگ زیارت کر آئیں میں سامان کی رکھوالی کرتا ہوں"۔

شیعہ مسلمانوں کے نزدیک مشہد، امام کے روضے کی نسبت سے کربلا اور نجف کے بعد سب سے زیادہ تقدس رکھتا ہے۔ روضے کے صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دونوں طرف تبرکات کی متعدد دکانیں ہیں۔ حضرت علی، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی رنگدار شبیہیں تسبیاں، مذہبی قطعے، کیلنڈر، خاکِ پاک اور ہر مرض کے لیے چاندی کے تعویذ۔ میں نے تھیلے سے اپنا مووی کیمرہ نکالا اور لینز پر آنکھ جما کر روضے کے بڑے گنبد کو فوکس میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں فلم بنانے کے لیے بٹن دباتا، کسی کے آہنی ہاتھ نے ایک جھٹکے سے کیمرہ چھین لیا۔ میرے سامنے روضے کا مسلح محافظ سینہ تانے کھڑا تھا۔ "فوتو ممنوع" اس نے قہر آلود نظروں سے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔ میرا جی چاہا وہ ایک نظر اُن دکانوں پر بھی ڈال لے جہاں روضے کی رنگین تصویریں بک رہی تھیں۔ "شما خارجی۔ فوتو ممنوع" اس نے میرے بڑھے ہوئے بالوں اور کپڑوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ خارجی کے لفظ پر علی بدک گیا "تم خارجی ہو گے۔ میں شیعانِ حیدر کرارؓ سے تعلق رکھتا ہوں۔ قزلباش سمجھے؟ اور یہ بے چارہ بھی مسلمان ہے"۔ ثبوت کے طور پر اُس نے اپنے گلے کا تعویز محافظ کے سامنے لہرا دیا۔ تعویذ پر کلمہ طیبہ تحریر تھا۔ "بالے بالے" محافظ نے معذرت کرتے ہوئے کہا اور میرا کیمرہ واپس کر دیا۔

ہم شاہ عباس کے تعمیر کردہ بڑے دالان میں داخل ہوئے جس کی تمام دیواریں بیل بوٹوں سے آراستہ نیلے ٹائلوں سے مزین تھیں۔ میناروں پر سونے کا ملمع چڑھایا گیا تھا ہر دیوار کے درمیان ایک اونچا دروازہ تھا جس کے پہلو میں حجروں کی قطاریں تھیں۔ دالان

میں ایران اور دُنیا کے ہر خطّے سے آتے ہوئے مسلمان عورتیں، مرد جمع تھے۔ بعض نماز میں مشغول اور زیادہ تر آہ و بکا میں مصروف ــــ امام رضا کی ولادت ۷۷۰ء میں ہوئی۔ خلیفہ وقت مامون الرشید کی خواہش تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کے دو بڑے فرقے شیعہ اور سُنّی ماضی کے اختلافات بھلا کر متحد ہو جائیں۔ اس کوشش میں مامون نے امام رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی اُن کے عقد میں دے دی۔ ۸۱۹ء میں امام رضا زہریلے انگور کھانے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ شیعہ تاریخ دانوں کے مطابق مامون الرشید نے امام کو ایک دعوت دی اور دسترخوانوں پر سجے ہوئے انگور کے خوشوں کے چند دانوں میں زہر بھروا دیا۔ امام نے کھانے کے دوران خاص طور پر زہر آلود انگور کے دانوں سے اجتناب کیا۔ اس پر مامون نے خاص طور پر وہ انگور امام کو پیش کیے۔ امام رضا اپنے دوست کی دعوت ٹھکرا نہ سکے۔ انگور چکھ کر وہ فوراً ہی دسترخوان سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی جانب چل دیئے۔ مامون نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی امام کو پکار کر کہا: "رضا کہاں جا رہے ہو؟" امام رضا نے پلٹ کر جواب دیا: "مامون جہاں تم مجھے بھیجنا چاہتے تھے۔" یہ روایت کہاں تک دُرست ہے اس کا فیصلہ تو مستند تاریخ دان ہی کر سکتے ہیں، بہر حال اس کا راوی دانش گاہِ تہران کے شعبۂ تاریخ کا ایک طالب علم تھا۔ دوسری روایت کے مطابق امام کو طوس کے دہقانوں نے شہید کیا تھا۔

امام رضا، مامون کے تعمیر کردہ روضے میں دفن ہوتے اور اُن کے بعد مامون کی وصیت کے مطابق اُسے امام کے قدموں میں دفن کیا گیا۔ آج زائرین مقدس لحد کی زیارت سے قبل خلیفہ مامون الرشید کی قبر پر تھوکتے اور لعنت بھیجتے ہیں۔ ذہن میں کئی سوال اُبھرتے ہیں کیا مامون واقعی ایک ظالم اور ریاکار شخص تھا جس نے امام کی بے پناہ مقبولیت سے ہراساں ہو کر انہیں قتل کروا دیا۔ امام کو جانشین مقرر کرنا اور اُن کے پاؤں میں دفن ہونے کی وصیت صریحاً فریب تھا یا پھر رضا کے بچپن کا دوست مامون ایک مخلص انسان تھا جس نے رضا کو

اپنا جانشین بنایا۔ اپنی بیٹی عقد میں دے دی۔ اس کی موت پر پہروں روتا رہا، عالی شان مقبرہ تعمیر کروایا اور پھر مرنے کے بعد بھی اپنے دوست سے جدا ہونا پسند نہ کیا۔

ہم نے اپنے جوتے اتار کر باہر بیٹھے ہوئے خادم کے حوالے کیے اور چاندی کے بڑے دروازے سے روضے کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر ہال میں زائرین کا بے پناہ ہجوم تھا۔ لوگ جہاں چاہتے فرش پر لیٹ جاتے۔ سجدہ ریز ہوتے یا چاندی کے بیرونی دروازوں کو بے تحاشا چومنا شروع کر دیتے۔ طویل مدت میں کروڑوں عقیدت مندوں کے ہونٹوں سے مس ہوئی یہ چاندی اور مصفا اور چمک دار ہو گئی تھی۔ ماحول میں عقیدت اور جذبے کی شدید لہر دوڑ رہی تھی۔ ہال کی چھتیں سونے چاندی اور شیشوں سے مرصع تھیں اور سارا فرش بیش بہا قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ زائرین کے ریلے نے مجھے بھی روضے کی طرف دھکیل دیا۔ جوں جوں روضے کی جالی قریب ہو رہی تھی، زائرین کی آہ و بکا اور گریہ زاری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جدید مغربی لباس پہنے ہوئے ایرانیوں کے دوش بدوش خراسانی چرواہے اور ترکمان خانہ بدوش تھے جن کی نگاہیں ہال کے وسط میں چاندی کی جالی کے بیچ سیاہ ریشمی پردوں میں ملفوف امام کی قبر پر تھیں۔ وہ روتے، آہیں بھرتے، جالی کا طواف کرتے اور پھر دیوانہ وار اس کی قبر سے لپٹ جاتے۔ مریض اور لاچار اپنا پیراہن جالی سے رگڑتے اور امام سے شفا کی بھیک مانگتے۔ ان کی آنکھیں عقیدت کی گرمی سے جل رہی تھیں۔ جذبہ ان کو کسی اور جہان میں لے گیا تھا۔ وہ آج امام کی معصومیت کا حصہ بانٹنے آئے تھے۔ مجھ پر بھی ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ آج ایک معصوم درویش کو عوام کی عقیدت اور جذبے کی معراج نے اس جگہ لا کھڑا کیا تھا جہاں شہنشاہوں کا گزر بھی نہ تھا۔ شاہ عباس پا پیادہ اپنے دارالسلطنت اصفہان سے یہاں آیا۔ دائمی عظمت کا سرچشمہ واقعی عوام ہوتے ہیں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے جالی کو چھوا اور پھر پیچھے ہٹ کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ کھڑے ہوئے سیاہ پوش درویش نے ہاتھ اٹھا کر درود پڑھا اور میں بھی

اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

روضے کے باہر دالان میں بالکل خاموشی تھی۔ دھوپ میں سنہری گنبد چمک رہے تھے۔ میں اسی اضطرابی حالت میں صحن کے ساتھ ساتھ چھوٹے سے راستے میں سے گزر کر مسجد گوہر شاد میں داخل ہوا تو ایک دم مکمل خاموشی اور گہرے سکون کا احساس ہوا۔ ساری مسجد نیلی روشنی کے سمندر میں نہائی ہوئی تھی۔ خراسان کی ملکہ اور تیمور کی بہو گوہر شاد کی تعمیر کردہ یہ مسجد ایران کی خوبصورت ترین مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔ نیلے ٹائلوں کا کام اتنا دیدہ زیب ہے کہ ایک فرانسیسی سیاح نے اسے دیکھ کر کہا تھا: "مسجد گوہر شاد کی نیلی دیوار ہی پورا ایران ہے۔"

تہران جانے والی گاڑی جب اسٹیشن سے باہر نکلی تو مشہد کا شہر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ امام رضا کے روضے کا سنہری گنبد چھتوں اور کشادہ بازاروں سے بلند نیلے آسمان میں ایک سنہری گولے کی مانند اٹکا ہوا تھا۔

"روزِ محشر اوّلین پیغمبران حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ اور اُن کے ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، علی، حسین اور حسن جنّت کے سب سے اونچے درجے میں ہوں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک پردہ کھینچ دیں گے۔ دوسری طرف اُن لوگوں کے لیے جگہ ہو گی، جنہوں نے اماموں کے روضوں کی زیارت کی اور امام رضا کے روضے پر حاضری دینے والے کا مقام اُن سب میں سے بلند ہو گا۔" •——————• (ایک ایرانی روایت)

مشہد سے تہران تقریباً سولہ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ خوش قسمتی سے ہم سب کو ایک ہی کیبن میں جگہ مل گئی۔ کھانے کے ڈبّے میں ایک عدد "خوراک مرغ" نوش کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے تاریخ ایران اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرتا رہا، مگر گاڑی کے شور اور میرے ساتھی کے بے ہنگم خراٹوں نے میرے مطالعے میں خلل ڈال دیا۔ میں نے کیبن کی روشنی گل کر دی اور سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔ باہر مکمل تاریکی تھی اور دُور دُور کسی آبادی کا نام و نشان

نہ تھا۔

شاید نصف شب ہو گی کہ مجھے سخت پیاس لگی۔ میں پانی کی تلاش میں سوئے ہوئے مسافروں کے جسم پھلانگتا غسل خانے تک گیا، لیکن پانی کا نل سوائے شوں شوں کی آواز کے اور کچھ برآمد نہ کر سکا۔ میں مایوس ہو کر واپس کیبن میں آ گیا اور پھر اونگھنے لگا۔ یکایک گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے رکی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ اوپر چڑھا کر باہر جھانکا کوئی چھوٹا سا قصباتی اسٹیشن تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے مدھم روشنی کے ایک قمقمے کے علاوہ سارا اسٹیشن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمارے ڈبے سے ذرا پرے مٹیالے پلیٹ فارم پر پانی کا ایک نل نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور گاڑی سے اتر کر سیدھا نل پر چلا گیا۔ ٹونٹی گھمائی تو خنک پانی کی تیز دھار میرے کپڑوں کو تر کرتی ہوئی پلیٹ فارم پر پھیل گئی۔ میں نے ٹونٹی کا لٹو پیچھے گھما کر پانی کا زور کم کیا اور اس کے نیچے ہتھیلی پھیلا کر اپنے خشک اور گرد آلود ہونٹ بھیگے ہوئے پانی کی سطح پر جما دیئے۔ سامنے چھت سے لٹکتے ہوئے بورڈ پر اسٹیشن کا نام لکھا تھا جو تاریکی کی وجہ سے صاف پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اپنی کوتاہ نظری کو آنکھیں بھیچ کر کم کرنے کی کوشش کی۔ یکدم فارسی اور انگریزی کے حروف بورڈ کی سطح سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے: "نیشاپور"۔ اسٹیشن کی تاریکی چھٹ گئی اور رنگ اُبلنے لگے، گلِ لالہ چٹکے، ارغوانی لہریں اُبھریں اور شوخ و سنگ ندیاں گنگنانے لگیں۔ عمر خیام کا نیشاپور۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شعر و خراب کی یہ وادی مشہد اور تہران کے درمیان آتی ہے۔ مجھے اپنی کم علمی پر سخت ندامت ہوئی۔

عطّار کا مقتل، خیام کا مدفن، سلجوق طغرل بیگ کا پہلا دار السلطنت جہاں دنیا کی عظیم ترین رصد گاہ تعمیر ہوئی۔ جو نیلے اور نازک ظروف کا مرکز تھا اور جسے فٹز جیرلڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر کے وقت کے سب سے بڑے مہندس اور ماہر فلکیات کو بطور شاعر مغرب سے روشناس کیا۔ فٹز جیرلڈ تیسرے درجے کا شاعر تھا جس کا کلام زبانِ


خیام گامدفن
نیشابور

زدِ عام نہ ہوا تو اُس نے پانچ چھ برس سرسری طور پر فارسی زبان کا مطالعہ کر کے خیام کی رباعیات کو مغرب کے پسندیدہ فلسفۂ نشاط کا رنگ دے کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اہلِ مغرب مشرق کی رومانوی پڑیا میں بند ہے۔ "بابر بہ عیش کوش" کا زہر تریاق سمجھ کر پھانک گئے۔ فارسی کے جید علمار باعیات کے ترجمے کی صحت پر اعتراض کرتے تو فٹز جیرالڈ کہتا: خوبصورت ترجمہ خوبصورت عورت کی مانند وفادار نہیں ہو سکتا۔ حال ہی میں امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ نے ایک افغان کی مدد سے رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ ایک قدیم نسخے سے کیا گیا اور فراسٹ کا کہنا ہے کہ اس میں خیام کی شاعری کو کسی ردّ و بدل کے بغیر پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کی روح برقرار رہے جب کہ فٹز جیرالڈ میں یہ چیز مفقود ہے۔ مغربی نقادوں نے فراسٹ کی اس مخلصانہ کوشش کو سراہنے کی بجائے اُلٹا اُسے مطعون کیا۔ انہوں نے جیرالڈ کے ترجمے کو ایک ننھی مُنّی چڑیا سے تشبیہ دی جو فضائے بسیط میں محوِ پرواز ہے اور فراسٹ کا ترجمہ اس کے مقابلے میں ایک ایسے حنوط شدہ عقاب کی حیثیت رکھتا ہے جو کارنس پر بے جان پڑا ہے۔

مردِ آہن کی ایک دل دوز چیخ نے مجھے خواب و خیال کی اس رنگین وادی سے کھینچ کر ایک نیم تاریک قصباتی اسٹیشن پر پٹخ دیا جہاں نل کے نیچے میری ہتھیلی خنک پانی کی بوچھاڑ سے یخ ہو چکی تھی۔ میری پیاس ختم ہو چکی تھی۔ ساکن پلیٹ فارم پر گاڑی حرکت میں آئی اور میں بھاگ کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ صبح ہوئی تو میں ناشتے کے لیے کھانے کے ڈبے میں چلا گیا۔ تلے ہوئے تخمِ مرغ نان کے ساتھ کھائے اور پھر شیریں چائے پی کر وہیں بیٹھ گیا۔ ہم تہران کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سرو کی قطاروں کے پرے کوہِ البرز کی برف پوش چوٹیاں سورج کی پہلی شعاعوں سے چمک رہی تھیں۔



نیلی شراب کی آبشار

تہران پہنچے تو شیخ صاحب نے مشورہ دیا: "بچو، "پانساں پلستان" اول درجے کی جگہ ہے۔ وہیں قیام کیا جائے۔ سٹیشن سے باہر نکلے، ایک ٹیکسی ڈرائیور نے "پاکستانی برادر" کا نعرہ لگایا اور پھر "بسم اللہ" پڑھ کر ہمارا سامان ٹیکسی کی چھت پر رکھ دیا۔ ٹیکسی سٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے تہران کی ٹریفک میں گڈمڈ ہو گئی۔ خیابانِ ناصر خسرو تک کے دو میلوں میں ڈرائیور نے ٹریفک کے ہر اصول کی خلاف ورزی کی اور سڑک کے تمام دوسرے مکینوں کا شجرۂ نسب فر فر سنایا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ "گرینڈ پری ریس" میں حصہ لینے کی مشق کر رہا ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شیخ صاحب سے پوچھا: "یہ خبطی تو نہیں؟ انہوں نے مجھے کچوکا دیتے ہوئے جواب دیا: "بیٹے یہ تہران ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔ اس بھلے مانس نے تو ایک آدھ کار کو گزرنے کا رستہ بھی دے دیا ہے۔"

"پانساں پلستان" جس کا قدیمی نام "مسافر خانہ۔ اطمینانِ نو" تھا، بس یونہی سی جگہ تھی۔ ہم کپڑے بدل کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے تو شیخ صاحب نے ایک اور نادر مشورہ

سے نوازا: "بچو، سب سے پہلے بازارِ حُسن کی سیر کو چلا جائے"۔ ہمارے گستاخانہ انکار پر بے حد مایوس ہوئے اور سر ہلا کر فرمایا: "کسی شہر کی خوبصورتی کا پیمانہ وہاں کا بازارِ حُسن ہوتا ہے اور یہ تاریخی عمارتیں اور عجائب گھر وغیرہ دیکھنا تو محض وقت کا زیاں ہے۔"

ہم وقت ضائع کرنے کے لئے جب باہر نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ ہلکی کُہر میں تہران کی لاتعداد روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میدانِ سپاہ کو پار کر کے ہم خیابانِ فردوسی پر آنکلے جس کے آخری سرے پر شاعر فردوسی کا مجسّمہ شاہنامہ کی جلد تھامے ایک ایسے تہران پر نظر ڈال رہا تھا۔ جو اُس کے شاہان کے ایران سے کتنا مختلف تھا۔ قدیم اور جدید کے درمیان صدیوں کے فاصلے تھے۔ مِنی سکرٹ اور شیک CHIC ہیئر ڈو والی فراخ ذہن دِل گد گدانے والی لڑکیاں۔ پیئر کارڈن کے جدید ترین سوٹوں میں ملبوس اتراتے نوجوان، ہر کونے پر آبِ جوُ خُنک دستیاب۔ سنیما، نائٹ کلب، کابرے، ایک سیلِ نور۔ ہم خیابان خیابان گھومے۔ سنیما ہندی دیکھا جس کے مکالمے فارسی میں تھے اور گانے اُردو میں۔ ایک ہوٹل سے کھٹّی لسّی پی اور چلو کباب کھائے۔ لامبے اور نفیس چاول، تازہ مکھّن اور گرم گرم کباب۔

باہر نکلے، سڑک پر ایک صاحب نے کار روک لی: "کہاں چلیئے گا؟" ہم نے تکلّف برتنا چاہا، وُہ مُصر ہو گئے۔ سو اُن کا دل رکھنے کے لئے بیٹھ گئے اور ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ تہران کے بازاروں میں ابھی تک رونق تھی اور فردوسی کا مجسّمہ آسکر وائلڈ کے ہیپی پرنس کے مجسّمے کی مانند اداس اور تنہا کھڑا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے اپنی فارسی لُغت کے تمام الفاظ تشکر یئے کے روپ میں ڈھال دیئے۔ لیکن کار والے صاحب شاید ہماری بات سمجھ نہ سکے: "براہِ کرم چار تومان کرایہ اَدا کر دیجیے۔" معلوم ہوا تہران میں

تہران میں اکثر لوگ فارغ اوقات میں اپنی کاروں پر مسافر ڈھونے کا کام بھی کرتے ہیں ونتر جاتے ہوئے کسی کو بٹھالیا۔ تو سارے دن کی چائے کا خرچہ پورا ہو گیا۔ سنیما سے واپسی

پر اکثر سواری مِل جاتی ہے۔ چلو ٹکٹ کے پیسے پورے ہو گئے یہ طریقہ زائد آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔ اور لوگوں کو سہولت بھی رہتی ہے۔ چنانچہ ہم نے کرایہ ادا کیا اور ہوٹل میں چلے آئے

دوسری صُبح میں نے سُکھدیپ کو فون کیا۔ وہ فوراً اپنی سپورٹس کار میں میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ اور نہایت تپاک سے مِلا۔ ولایت میں سکھدیپ اور مَیں ایک ہی کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ دراز قد، ہنس مُکھ اور مخلص ہونے کے علاوہ اُس میں سکھوں کی تمام خصوصیات کُوٹ کُوٹ کر بھری تھیں۔ سُکھدیپ کے والد مہاراجہ پٹیالہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور عرصہ دراز سے ایران میں کاروبار کے سِلسلے میں مستقل سکونت پذیر تھے۔ ولایت سے واپسی ہوئی تو ہمیشہ عید اور نوروز کی مبارک باد کا کارڈ بھیجا۔

"یار بڑی سَرپرائز دی ہے تم نے۔ مجھے اطلاع تو کر دیتے۔" اُس نے اپنی گھنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "آخر مسلے ہونا"

"پیارے سردار جی، ان انجانی ملاقاتوں کا کچھ اور ہی مزا ہے"

"اچھا، چھوڑو اِن باتوں کو۔ میں تمہیں آج تہران کی سیر کراؤں گا۔ لو لو، کیا دیکھو گے؟ گلستان پیلس میں تختِ طاؤس کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"تختِ طاؤس ہمارا تھا۔ غیر کے قبضے میں اپنی چیزیں دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوتی" میں نے جواب دیا۔

"اچھا پھر بیٹھو کار میں اور پھر واہگورو جو کرے سو کرے"

سُکھدیپ نے کار سٹارٹ کی اور میدانِ سپاہ سے نکل کر شاہ رضا کی طرف موڑ دی۔ موسم بے حد خوش گوار تھا اور آسمان ایک ایرانی شاعر کے الفاظ میں "نیلی شراب کی آبشار" تھوڑی دیر میں ہم زیرین تہران سے نکل کر شمران کی طرف جا رہے تھے۔ تہران کا یہ حصّہ کوہ دماوند کے پہلو میں واقع ہے اور باقی شہر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ سخت گرمیوں میں جب خیابانِ فردوسی تپنے لگتا ہے تو شمران میں بہار کا موسم

ہوتا ہے۔ پُررونق بازار اور بلند عمارتیں پیچھے رہ گئیں تو فضا میں موٹروں کے ہارن اور شہری ہنگاموں کے شور غل کے بجائے سڑک کے پہلو میں گنگناتی ندی کا شور۔ ان گنت پرندوں کی چہچہاہٹ اور پہاڑی چشموں کی کُن مَن ابھرنے لگی۔ خنکی تبدریج بڑھ رہی تھی، سڑک کے دونوں طرف پھولوں کے تختوں اور گھنے سرسبز چناروں کی قطاریں تھیں۔ ہم اس پُرپیچ سڑک پر کوئی موڑ مُڑتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے گھنے چنار ہمارا راستہ روک لیں گے۔ ان کی شاخیں ہمارے عین اوپر آپس میں یوں گتھی ہوئی تھیں کہ سبزے اور خنکی کی ایک سُرنگ سی بن گئی تھی۔ خنک ہوا کا تھپیڑا آتا اور چنار کے سُرخی مائل چوڑے پتّے ہماری کار پر بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگتے۔

سُکھدیپ نے دَربند کے بُلیوارڈ میں کار پارک کی اور ہم ایک پتھریلی چٹان میں سے تراشی ہوئی سیڑھیاں طے کر کے ایک پُرفضا اوپن ایئر ریستورانت میں آ گئے۔ جو میز ہم نے منتخب کی اس کے ساتھ ہی ایک پہاڑی چشمہ اُبل رہا تھا۔ تمام میزوں کے وسط میں آرائش کے لیے گلدانوں کے بجائے رنگ برنگے ننھے منے پرندوں کے پنجرے رکھے تھے۔ ماحول سراسر رومانوی تھا۔ میں نے سُکھدیپ کی گھنی ڈاڑھی اور بسنتی پگڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں دوستی اور خلوص کے جذبات تو تھے، مگر رومان ---------

"کیا پیو گے؟" سُکھدیپ نے لہرا کر پوچھا۔ اس پر بھی ماحول کا اثر ہو چکا تھا۔

"تحصیل چھالیہ کی کھٹی لسّی جو تہران میں بھی ملتی ہے۔"

"اوئے۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "ابھی تک مُسلے ہو۔"

"تم بھی تو سکھ کے سکھ ہی رہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یک آبِ جَو خنک و جگر مُرغ۔" اس نے ویٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔

شکھدیپ کا فارسی لہجہ بالکل اہلِ ایران کی مانند تھا۔

چار آبِ جَو چڑھانے کے بعد شکھدیپ موڈ میں آگیا۔

"یار تمہیں یاد ہے ہماری پہلی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟" اُس نے آبِ جَو کا گھونٹ بھر کر کہا: "کالج کا سالانہ رقص تھا اور تم ہمیشہ کی طرح ایک کونے میں اکیلے بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ اور تم جانو واہگرو کا خالصہ تمباکو نہیں پیتا صرف لسّی پیتا ہے۔ دَہی کی نہیں صرف جَو کی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے تمہاری میز پر بیٹھنے کی اجازت چاہی تو تم نے سگار کا دھواں میرے منہ پہ بکھیر دیا اور بوڑھے انگریز بیبا کی طرح منہ بگاڑ کر کہا: "پلیز یور سیلف اولڈ بوائے!" ساری شَلم انگریزی بول بول کر میرے تو جبڑے بھی دُکھنے شروع ہوگئے تھے۔ کچھ اثر لسّی کا بھی تھا۔" میں نے چڑ کر کہا، بادشاہو، جے پنجابی او تے پنجابی وِچ گل کرو۔ گوریاں دی بولی انگریزی دی لت کیوں تروڑ دے او۔ اولڈ برائے۔"

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اور پھر تم نے مجھ سے شرط لگائی کہ اگر وَیلری جو کالج کی سب سے حسین اور مغرور لڑکی تھی، ہماری میز پر آجائے تو تم مجھے دیسی گھی میں تلے ہوئے قیمے کے پراٹھے کھلاؤ گے۔"

"آہو" سکھدیپ نے خوش ہو کر کہا: "وہ تیسری تمہارے ایک دفعہ کہنے پر اپنے مداحوں کو چھوڑ کر ہماری میز پر آ اٹھ آئی اور میں نے تمہیں اسی رات پراٹھے کھلائے۔"

بھلا میں یہ سب کچھ کیسے بھول سکتا تھا۔ ان پراٹھوں کی وجہ سے میری لینڈ لیڈی نے مجھے نوٹس دے دیا۔ نصف شب جب رقص ختم ہوا تو میں گھر واپس آکر اپنے کمرے میں سوگیا۔ رات کے پچھلے پہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے بستر

سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ لینڈ لیڈی غصّے میں لال بھبھوکا نائٹ گاؤن پہنے کھڑی تھی۔ "تمھارا کوئی مہمان نیچے لگاتار گھنٹی بجا رہا ہے۔ رات کے اس پہر مہمانوں کو بلانا مہذّب طریقہ نہیں ہے۔ میرا کمرہ صبح تک خالی ہو جانا چاہیے۔" میں نیچے گیا تو دروازے کے باہر سکھدیپ ہاتھ میں پراٹھے لیے دانت نکال رہا تھا۔

"خالصے نے گھر جاتے ہی تمھارے لیے یہ دیسی گھی میں تلے ہوئے قیمے کے پراٹھے تیار کیے اور ابھی لے آیا۔ بھلا شرط پوری کرنے میں خالصہ دیر کیسے کر سکتا ہے؟"

اس حادثے کے بعد میں اور سکھدیپ گہرے دوست بن گئے۔ وہ پٹیالہ طرز کی پگڑی باندھتا اور اس کے وسط میں روزانہ ایک مختلف رنگ اور حجم کا پتھر اٹکا لیتا۔ لڑکیاں پوچھتیں تو کہتا: "میرا باپ ہاتھیوں کا سب سے بڑا شکاری ہے اور اس کی اپنی ریاست ہے۔ یہ ہیرے اس نے مجھے ولایت آتے وقت بطور جیب خرچ دیے تھے۔" چنانچہ وہ بے حد مرعوب ہوتیں اور ان میں سے ایک آدھ رات کے کھانے کی دعوت قبول کر لیتی۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا: یار، پیٹی کوٹ لین کے ایک کباڑیے سے بارہ شلنگ میں خریدے تھے۔ عام رنگدار شیشہ ہے۔ ذرا یہ میمیں خوش ہو جاتی ہیں۔"

اور آج برسوں کے بعد اچانک میل ہو گیا تھا۔ لندن کا نیلم پروا مسٹر سنگھ اب تہران کا ایک بہت بڑا سوداگر تھا اور بیوی بچّوں سمیت شہر کے نواح میں ایک خوشنما بنگلے میں رہتا تھا۔ اس کی بے ساختہ دوستی اور خلوص ابھی تک جوں کا توں تھا۔

ہمارے سامنے پرانے آتش فشاں کوہِ دماوند کی چوٹی سے برف پگھل پگھل

کرشمران کی ندیوں اور چشموں کو سیراب کر رہی تھی۔ "تم تو جانتے ہو گے ایک مقامی حکایت کے مطابق کوہ دماوند کی برف پوش چوٹی پر سیمرغ کا بسیرا ہے جس کی ایک آنکھ ہمیشہ ماضی پر اور دوسری مستقبل پر رہتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"تہران میں ماضی اور مستقبل دونوں فضول چیزیں ہیں۔" سکھدیپ نے آبِ جَو کا جھاگ منہ سے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہاں صرف حال کی حکمرانی ہے۔ ماضی کی تلاش میں پرس پالس جاؤ جسے سکندر کی رقاصہ تائیس نے ایرانیوں سے ایتھنز کی آتش زدگی کا انتقام لینے کے لیے جلا دیا تھا یا پھر اصفہان، جسے نصف جہان کہتے ہیں۔ یار، یہ کیا بور باتیں کر رہے ہو۔ سیمرغ کو چھوڑو اور جگرِ مرغ کی طرف دھیان دو۔"

میں نے چٹپٹا بُھنا ہوا جگرِ مرغ کھایا۔ نہایت لذیذ تھا۔

"جگرِ مرغ کے بعد اب تمہیں مچھلی کھلائی جائے گی۔ لندن کی بدذائقہ فش اینڈ چپس نہیں بلکہ دریائے خزراج کی مچھلی۔"

تھوڑی دیر میں ہم شہرِ شمالی سے اتر کر تہران شہر کی وسیع سڑکوں پر تھے۔ سکھدیپ اپنی کار کے طاقتور انجن کا پورا پورا استعمال کر رہا تھا اور سپیڈ و میٹر کی سوئی سو اور ایک سو بیس کیلو میٹر کے درمیان تھرک رہی تھی۔ "ذرا احتیاط سے چلاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے "لسّی" کے اثرات عدِ نظر رکھتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو پیارے، میں نے ڈرائیونگ کا امتحان لنڈن سے پاس کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے مرعوب ہوتے بغیر جواب دیا۔" ایک ہی ممتحن نے جب تمھیں دس مرتبہ ڈرائیونگ کے امتحان میں فیل کر دیا تو گیارھویں مرتبہ تمھارے یہ کہنے پر کہ صاحب جی، اگلے ہفتے خالصہ ہمیشہ کے لیے ولایت چھوڑ رہا ہے۔ آپ کے بچّے جئیں اس مرتبہ پاس کر دو۔ بڑی کرپا ہو گی۔ اس نے تمھیں رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا۔"

"وہ سسرا تو ویسے ہی سکھوں کے خلاف تھا۔" سکھدیپ نے ایکسیلیٹر پر اور دباؤ ڈالتے ہوئے غصّے سے کہا۔

تہران شہر خاصا پیچھے رہ گیا تھا اور خراج کے قصبے سے گزرنے کے بعد اب ہم دریائے خراج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دریا سڑک اور پتھریلی چٹانوں کے درمیان سر پٹختا ہوا بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے درختوں کی گھنی چھاؤں میں لوگ پتھروں پر بچھے ہوئے دیدہ زیب قالینوں پر بیٹھے پکنک منا رہے تھے۔ آج تعطیل تھی اور سارا تہران اس پُرفضا وادی کی رنگینیوں کا لطف اٹھانے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ ایک موڑ پر دریا گھنے درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ ہم نے سڑک کی نکڑ پر کار کھڑی کی اور وادی میں اترتی ہوئی کچی سیڑھیاں طے کر کے دریا کے کنارے واقع ریستوران میں آ گئے۔ بلند درختوں میں خوشگوار خنک ہوا کی سرسراہٹ اور ساتھ بہتے ہوئے دریا کے شور میں زندگی کی لہر تھی جس میں مَیں بھی ڈوب گیا۔ اوپن ایئر ریستوران کے درمیان ایک کچّے تالاب میں خراج سے پکڑی ہوئی مچھلیاں اُچھل رہی تھیں۔ آپ اپنی پسند کی مچھلی خود ہی پکڑ لیجیے اور ویٹر کے حوالے کر دیجیے۔ وہ میز کے

ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ایستادہ کرکے آپ کے سامنے بڑی نفاست اور سلیقے سے تَل دے گا۔ ہم پانی میں ہاتھ ڈالتے تو مچھلیاں ہتھیلی میں گدگدی کر کے پھسل جاتیں، چنانچہ اپنے کپڑے تر بتر کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ یہ فرض ویٹر ہی پورا کرے۔

کھانے کی تیاری کے دوران میں سکھدیپ ایرانی واڈکا سے حَظ اٹھاتا رہا۔ "مچھلی کھانے سے پیشتر معدے ضرور گرم ہونے چاہئیں اور اس کارِ خیر کے لیے واڈکا لاجواب چیز ہے۔ ان کمبختوں کے پاس شیراز کی ارغوانی شراب موجود نہیں، ورنہ وہ اِس سے بھی بہتر ثابت ہوتی ہے۔" سکھدیپ خاصا آؤٹ ہو چکا تھا۔

ریستوران کی تمام میزیں پُر تھیں اور اکثر لوگ، جو تہران کی اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، مے نوشی میں مصروف تھے۔ ہمارے برابر والی میز پر محفلِ سماع گرم تھی جہاں درمیانی عمر کے ایک خوش شکل اور خوش پوشاک ایرانی نے شراب، شباب اور موسیقی کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ کرسیوں پر تین ادھیڑ عمر موسیقار سر نیوڑھائے ایران کے روایتی ساز بجا رہے تھے۔ سامنے ایک حسین و جمیل عورت میز پر کہنیاں ٹکائے بڑی دلنوازی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرائے جا رہی تھی۔ پَل بھر کے لیے سارنگی خاموش ہوئی۔ دَف پر ایک تیز تھاپ پڑی اور ایک موسیقار ہاتھ بلند کر کے کسی عشقیہ غزل کے اشعار الاپنے لگا۔ غزل کا اختتام ہوا۔ تو میزبان مراقبے سے بیدار ہوا۔ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر غزل کا آخری مصرع جھوم جھوم کر پڑھا اور پھر ہاتھ

ہیں جام لے کر موسیقاروں کے گرد رقص کرنا شروع کر دیا۔ عورت کی کالی
بھورا آنکھیں رقص کرتے ہوئے بے خود ایرانی کا پیچھا کرتیں اور وہ پھر
عجب والہانہ انداز سے ہنسنے لگتی۔ میز کے نیچے اس کے گورے گورے
پاؤں دَف کی تھاپ پر حرکت کر رہے تھے۔ میں بھی موسیقار کی لوچ
دار آواز پر کان دھرے اشعار کے معانی سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا
ایک غزل کے اختتام پر جب وہ صاحب حسب معمول جام لے کر اٹھے
تو سکھدیپ بھی اپنا جام اٹھا کر اُن کے ساتھ رقص میں شامل ہو گیا۔
موسیقی ختم ہوئی ایرانی صاحب جام و مینا، سازندوں اور اپنی محبوبہ سمیت
ہماری میز پر آ گئے۔ سکھدیپ نے میرا تعارف کرایا کہ یہ پاکستان سے
آئے ہیں۔ انھوں نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" کہہ کر گلے سے لگا لیا اور سازندوں
کو حکم دیا کہ بیان جاری رہے۔

مچھلی تیار ہو گئی۔ واقعی بے حد خستہ اور مزیدار تھی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی اور دھوپ کی ملاحت میں خنکی کا اثر نمایاں تھا۔
میں ریستوران سے اُٹھ کر نیچے دریا کی سطح کے قریب ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ پانی
میں ہاتھ ڈالا تو جیسے کسی نے کاٹ لیا۔ بالکل یخ۔ دریا کے خراج کے تیز
پانی کے شور اور ہوا کی بھرپور سرسراہٹ کے باوجود سازندوں کی تانیں
مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سکھدیپ بھی آ گیا۔

"نہانے کا ارادہ ہے کیا؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"دریاؤں میں ہم نہیں نہاتے۔ ہاں کیپٹن سمندر ہو تو الگ بات ہے۔"
میں نے سوا سو میل دور رامسر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑ ماری۔

"نہاؤ گے"؟ اس نے ہانک لگائی۔
"یقیناً" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تو پھر یہ شرط بھی پوری ہو جائے۔ میں آج تمہیں کیسپین ہی میں نہلاؤں گا۔"
سکھدیپ کی سنجیدگی میرے لیے تشویش کا باعث بن گئی۔ طویل فاصلے کے علاوہ کیسپین کا راستہ نہایت دشوار اور پُر خطر تھا۔ آبِ جَو اور واڈکا کے مٹکے چڑھانے کے بعد سکھدیپ جھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ایسے سفر پر جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا، لیکن وہ بضد تھا "میں یہ شرط ضرور پوری کروں گا۔"
میں نے جب صاف انکار کر دیا تو اس نے میری ملّی شجاعت کو ٹ نہ بنایا۔
"پاکستانی ہو کر ڈرتے ہو؟" اس طرح نے فیصلہ کر دیا اور ہم البرز کے سلسلۂ کوہ میں گولی کی مانند جا رہے تھے۔ سکھدیپ عمیق گھاٹیوں اور خطرناک موڑوں سے بے پروا ایک ہی رفتار پر اڑا جا رہا تھا۔ سو، ایک سو دس، ایک سو بیس۔ سپیڈو میٹر کی سوئی ایک سو تیس کلو میٹر کے ہندسے پر جھوم رہی تھی۔ دور سڑک پر کار یا بس نظر آتی اور پلک جھپکتے میں ایک زنّاٹے سے غائب ہو جاتی۔ فرا اور سرو کے درختوں کے درمیان دریائے خراج کا شفّاف پانی ڈھلتی دوپہر کی ملائم دھوپ میں لمحہ بھر کے لیے چمکتا دکھائی دیتا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ دریا کی دوسری طرف بلند چٹانوں کی شکلیں ہر لحظہ بدل رہی تھیں۔ بُلند مینارے، ہیبت ناک قلعے، خوفناک دیو اور سیاہ عفریتیں ڈوبتے سورج کی روشنی سے عجیب عجیب شکلیں ظہور میں آ رہی تھیں
ہم نے خراج پر تعمیر کردہ عظیم بند عبور کیا تو موڑ پر گھاٹی کے نیچے سُرخ سُرخ

سیبوں سے لدا ایک باغ نظر آیا۔ سکھدیپ نے فوراً کار روک لی۔

"میں سیب کھاؤں گا۔" اُس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو۔ میں لا دیتا ہوں۔" میں نے پیشکش کی وہ قطعاً اس حالت میں نہ تھا کہ گھاٹی سے نیچے اتر کر پھر واپس بھی آجاتا۔ میں بڑی احتیاط سے نیچے اتر کر باغ تک چلا گیا۔ پہاڑ کے دامن میں ہونے کی وجہ سے یہاں روشنی بے حد کم تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ "شاید انار ہیں۔" میں نے اندازہ لگایا۔ ایک سیب یا انار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میرے بالکل پیچھے ایک حیوانی قسم کی غرّاہٹ بلند ہوئی۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے کینن ڈائل کے ہاؤنڈ آف باسکرویل کا ایرانی ماڈل کھڑا تھا۔ گدھے کے قد کا ایک وحشتناک کُتّا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ اپنے خونخوار دانت تیزی سے چکچاتا اور اس کی نم آلود چھوٹی ناک سکڑتی اور پھیل جاتی۔ نیم تاریکی میں اس کی آنکھیں مشعلوں کی طرح روشن تھیں۔ وہی گھاٹی جسے اترنے میں پانچ منٹ صرف ہوئے تھے۔ اب میں نے چند سیکنڈوں میں پھلانگی اور ہانپتا ہوا واپس سڑک پر پہنچ گیا۔

"یار سیب نہیں لائے۔" سکھدیپ نے سٹیئرنگ سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کاٹھ مارو سیبوں کو۔" میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "شکر کرو زندہ بچ گیا ہوں۔ نہایت ہیبت ناک قسم کا کتا تھا۔" میرا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

"کتا؟" سکھدیپ نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں نہیں ہوتے۔ بھیڑیا ہوگا۔"

"بھیڑیا؟" میں نے سیٹ سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہوتے ہیں؟"

"ہاں، دوسرے درندوں کے علاوہ بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔"

کوہِ البرز کی ایک میل لمبی سُرنگ عبور کر کے جب ہم دوسرے سِرے پر نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور ہر طرف تاریکی چھا چکی تھی۔ سُرنگ کی پتھریلی دیواروں سے رِستے ہوئے پانی کی بوچھاڑ نے ہمیں بالکل بھگو دیا۔ رات کی تاریکی نے گرد و پیش کے خطروں کو ہماری نظر سے اوجھل کر دیا تھا۔ کار کی تیز روشنیاں اندھیرے کو اور بھی گہرا کر رہی تھیں۔ رات کے دس بجے سکھدیپ نے مژدہ سنایا کہ ہم ماژندران کے صوبے سے گزر کر بحرۂ کیسپئن کے ساحل پر پہنچ گئے۔ گھُپ اندھیرے میں صرف لہروں کا شور اس بات کی غمّازی کر رہا تھا کہ سمندر قریب ہے۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ سڑک پر چند میل تک گئے اور پھر دائیں ہاتھ پر ایستادہ ہوٹل کے بورڈ کے ساتھ کار موڑ دی۔ ہم نے وہاں شب بسری کے لیے کمرہ بُک کروایا اور کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ ہال کی فرانسیسی طرز کی سفید کھڑکیوں سے پرے کیسپئن تھا۔

"کیوں پیارے" سکھدیپ، جو اَب بالکل سوبر تھا، شرارت آمیز لہجے میں کہنے لگا: "کیسپئن کا سمندر تمہارے سامنے ہے۔ لگا دو چھلانگ۔"

میرا خیال تھا کہ وہ اَب تک شرط بھول چکا ہو گا۔

"سامنے کہاں ہے تاریکی میں کچھ بھی تو نظر نہیں آتا، صرف لہروں کا شور ہے" میں نے کھسیانا ہو کر کہا "اور پھر کیسپئن تو سِرے سے سمندر ہے ہی نہیں۔ یہ تو دُنیا کی سب سے بڑی جھیل کہلاتی ہے۔"

"چلو حساب برابر ہوا" اُس نے خوش دِلی سے کہا "ایک شرط میں ہارا تھا، ایک تم ہار گئے۔"

رات کے کھانے سے پہلے ویٹر "کیوی آر" لے آیا جو کیسپئن میں پائی جانے والی سٹرجن مچھلی کا پیٹ چاک کر کے نکالا جاتا ہے اور ہزاروں روپے فی پونڈ کے حساب سے برآمد کر دیا جاتا ہے۔ یورپ میں لوگ اسے فیشن کے طور پر کھاتے ہیں۔ مہنگی اور بدمزہ چیز

کھانا بھی سناری میں شامل ہے۔ آج سے کئی برس پہلے ماسکو کے کریملن میں ایک دعوت کے دوران میں پہلی مرتبہ کھانے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن وہ "کیوی آر" اس سمندر کی دوسری طرف رُوسی کنارے پر تیار کیا گیا تھا۔ میں نے چکھا تو ذائقے میں ذرّہ برابر فرق نہ تھا۔ ابھی نمک مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ ایک دم سُکھدیپ کو کچھ یاد آ گیا۔ "یار گڑ بڑ ہو گئی ہے۔" اس نے پریشان ہو کر کہا، "میری تیمی تورات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ میں ڈیسک سے تہران فون کیے دیتا ہوں تاکہ خوامخواہ فکرمند نہ ہو۔ تم بیٹھو۔" تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کہنے لگا، "یار، اب واقعی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی تیمی کو بتایا کہ آج رات ایک پاکستانی دوست کے ہمراہ رامسر کے قریب ٹھہرنا پڑ گیا ہے۔ اب وہ بھلی لوک مانتی ہی نہیں۔"

"کیا نہیں مانتی؟"

"بس کہتی ہے دوست وغیرہ کوئی نہیں، تم ضرور کسی لڑکی کے ساتھ ہو۔ ابھی اور اسی وقت تہران واپس آؤ، ورنہ میں چلی پٹیالے ....."

"پھر کیا ارادہ ہے؟" میں نے میز سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جانا پڑے گا۔"

تہران جانے والی سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ رات کو اس سڑک پر بھاری ٹریفک کی بالکل ممانعت تھی اور کاروں والے حضرات پُرخطر پہاڑی راستے کے پیشِ نظر ویسے ہی ہمّت نہیں کرتے جب تک "میں چلی پٹیالے" کی دھمکی نہ ملے۔ میں نے سکھدیپ کی طرف دیکھا وہ نہایت مشاقی سے کار چلا رہا تھا۔

"تم نے مجھے کیبپئن تو دکھایا ہی نہیں، صرف لہروں کا شور اور سمندر کی بُو سنگھا دی۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"پھر کبھی سہی میرے دوست۔" اُس کے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔ "ازدواجی زندگی میں

بھی کتنی پابندیاں ہوتی ہیں۔ یاد ہے ہم دونوں لندن کے شیفٹس بری ایونیو پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کس بے فکری سے گھوما کرتے تھے۔ لڑکیاں کہتیں یہ دونوں نارمل نہیں، بھلا دو لڑکوں کا ہاتھ پکڑ کر چلنا چہ معنی۔ یاد ہے تمہاری وہ جینیس کتنا جلتی تھی۔ اِس بات پر؟ کبھی کوئی خط وغیرہ آیا ہے؟"

"اب تو کبھی نہیں آیا۔ اُسے اونچی سوسائٹی کی پارٹیوں، جیٹ سیٹ اور سینٹ لارینٹ کے کپڑوں سے دلچسپی تھی۔ ہمیشہ WITH IT رہنے کا جنون اور مجھے ان کھوکھلی اقدار سے اتنی ہی نفرت۔۔۔۔ وہ حسین تو تھی، ہی سو اُس نے ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی سے شادی رچالی اور اب پیرس سے باہر ایک "شاتو" میں رہتی ہے۔ سارے پیرس میں مادام جینی جیسی "ٹیسک" پارٹیاں کوئی نہیں دیتا۔" میں ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا تھا۔ کوئی موڑ آتا تو کار کی روشنیاں پل بھر کے لیے سڑک سے جُدا ہو کر کھائیوں کے پار چٹانوں پر پڑتیں اور پھر واپس آجاتیں۔ یکدم رات کے سنّاٹے میں بھونکنے کی آوازیں اُبھریں، میں نے مڑ کر کار کے پیچھے اندھیرے میں دفن ہوتی سڑک کی طرف دیکھا۔ لاتعداد روشن اور چمکتی آنکھیں ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔ مشعلوں کے اس جلوس سے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"کُتّے؟" میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی سکھدیپ سے سوال کیا۔

"بھیڑیے"۔ اس نے سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا اور ایکسلریٹر دبا دیا۔ مشعلیں اندھیرے میں گُم ہوگئیں۔

البرز کی سُرنگ کے پار سڑک کے کنارے دو فربہ بھالو بیٹھے تھے، کار کی روشنی پڑی تو تھوتھنیاں اٹھا کر نیچے جنگل میں گم ہوگئے۔

"کچھ اور بھی باقی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جنگل بھرے پڑے ہیں، سورج کی حرارت رات گئے تک سڑک کے تارکول میں موجود

مرتی ہے اور جانور جنگل کی خنکی سے فرار ہو کر یہاں آ بیٹھتے ہیں۔ انہی جنگلوں میں سکندرِ اعظم
ہرکانین نسل کے شیر کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "میکبتھ" میں اسی شیر کی تندی
اور خونخواری کا ذکر آیا ہے۔"

ہم تہران کے نواح میں پہنچے تو صبح کاذب کا سماں تھا۔ ہوٹل کے دروازے کے
باہر سکھدیپ نے کار کھڑی کر دی۔

"اب کب ملو گے؟" اُس نے میرے دونوں کندھے پکڑ کر گرمجوشی سے کہا۔

"میں کل ... میرا مطلب ہے آج تبریز چلا جاؤں گا۔ میری منزل اُندلس ہے۔
الحمرا کے ایوانوں اور قرطبہ کی محرابوں نے مجھے ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔ اس ڈور کے
آخری سرے پر جا کر دیکھوں گا کہ اسے کون ہلا رہا ہے۔ پھر واپسی انہی راہوں سے ہوئی
تو ضرور ملوں گا۔"

ہم بغلگیر ہوئے تو سکھدیپ جذباتی ہو گیا۔ "ضرور آنا۔ ہم پھر کیسپین چلیں گے، لیکن
دن کے اُجالے میں ..."

میں نے اُوپر کمرے میں جا کر کھڑکی سے جھانکا تو وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر کھڑا تھا
میں نے ہاتھ ہلایا اور بلند آواز سے کہا:

"سکھدیپ، وہ ممتحن جس نے تمہیں دس مرتبہ ڈرائیونگ ٹیسٹ میں فیل کیا تھا نا؟
وہ سسرا واقعی سکھوں کے خلاف تھا۔ تم تو بڑی اچھی کار چلاتے ہو۔"

سکھدیپ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ایڑیاں اٹھا کر دونوں ہاتھ ہوا میں بلند
کیے اور کار سٹارٹ کر کے تہران کی کہر آلود صبح میں گم ہو گیا۔

نوحؑ کا پہاڑ

مَیں اور علی "راہِ آہن ایران" یعنی ایران ریلوے کی رات کی گاڑی سے تبریز روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو جگمگاتا تہران نظروں کے سامنے آ گیا۔ شمران کے پہلو میں تاریکی میں روپوش کوہِ دماوند کے ہلکے افقی خطوط نے مجھے حکایتی پرندے سیمرغ کی یاد دلائی جو برف پوش چوٹی پر بیٹھے ماضی اور مستقبل دونوں پر بیک وقت اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ مَیں نے بھی تہران میں بیتے ہوئے خوبصورت دنوں کی یاد سے ناطہ توڑا اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ گاڑی کل صبح تبریز پہنچ جائے گی۔ وہاں سے ہم بس کے ذریعے چند گھنٹوں میں ایران کی سرحدی چوکی بازرگان تک چلے جائیں گے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بازرگان سے ترکی کے شہر ارضِ روم کے لیے بس مل جاتی ہے اور پھر ارضِ روم سے ہمیں استنبول کے لیے ڈائرکٹ گاڑی مل جائے گی۔ "بقیہ سفر کی منصوبہ بندی باسفورس کے کنارے بیٹھ کر کی جائے گی۔" مَیں نے سوچا اور ڈبے کے دوسرے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں صرف دو ایرانی مرد اور ایک موٹی ادھیڑ عمر عورت براجمان تھے۔ سونے سے قبل مَیں نے کھانے کا ڈبہ نکالا تو موٹی عورت نے

فوراً اپنی گٹھڑی سے ایک مَیلی سی پوٹلی نکالی۔ "بیٹا، تم ہمارے مہمان ہو۔ کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔" اُس نے پوٹلی کھول کر سُوکھا زرد پنیر اور روٹی ہمارے سامنے رکھ دی۔ موٹی عورت کی آنکھوں سے ممتا کی شفقت ٹپک رہی تھی۔

"ہم کُردستان کے رہنے والے ہیں۔" عورت نے فخر سے کہا۔ "قزوین سے بس ہمارے پہاڑی قصبے تک جاتی ہے۔ اِن سے ملو یہ میرے بیٹے ہیں۔" دونوں مردوں نے نشست سے اُٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ہم سے ہاتھ مِلائے۔ ان کی گرفت آہنی تھی۔ علی دیر تک اپنا ہاتھ سہلاتا رہا۔ "میرے سات بیٹے اور بھی ہیں۔ پوتے پوتیوں کی تعداد مجھے ٹھیک یاد نہیں رہتی۔ حالانکہ عمر صرف نوّے سال ہے مگر حافظہ جواب دیتا جا رہا ہے۔" مَیں نے حیرت سے اُس کے دمکتے ہوئے سُرخ و سپید چہرے کی طرف دیکھا جو جھریوں سے پاک تھا۔

"پنیر بے حد لذیذ ہے۔" علی نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

"ہونا بھی چاہیے۔" عورت نے خوش دِلی سے کہا۔ "مَیں نے خود اپنے ہاتھوں سے پانچ سال قبل بنایا تھا۔"

"یعنی یہ پنیر پانچ سال پُرانا ہے؟" علی نے منہ کھول کر کہا۔

"ہاں۔ ہمارے ہاں پنیر جتنا پُرانا ہو اتنی ہی رغبت سے کھایا جاتا ہے۔"

"آہم۔" علی نے بمشکل اپنا لقمہ نگلا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"تمہیں کُرد قوم کی جدوجہدِ آزادی کا تو علم ہوگا۔" موٹی عورت کا بیٹا مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "ہم صلاح الدین ایوبی جیسے سپوتوں کو جنم دینے والی سرزمین کے بیٹے ہیں۔ اگرچہ ہمارا ملک ایران، عراق اور ترکی کی سرحدوں پر بکھرا پڑا ہے لیکن ہم پچھلے کئی برس سے اپنی منتشر شدہ قوم کو ایک ہی پرچم تلے جمع کرنے کی بھرپور جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہم ایرانی، عراقی یا تُرک نہیں صرف کُرد ہیں۔ یہ عارضی سرحدیں ایک دن ختم ہو کر رہیں گی اور تب ہم آزاد کُردستان کی ریاست کی بنیاد رکھیں گے۔ ہمیں کوئی غلام نہیں

بنا سکتا۔" اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

"کیا تم ہماری آزادی کا نشان روائتی کُرد پگڑی دیکھنا پسند کرو گے؟" چھوٹا بھائی جو اَب تک خاموشی سے ہماری باتیں سُن رہا تھا مجھ سے مخاطب ہُوا۔ میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"ہاں ضرور۔" اُس نے اپنی ماں کے پاؤں تلے پڑی ہوئی گٹھڑی کھولی اور دو رنگدار ریشمی چادریں نکال کر ایک اپنے بڑے بھائی کو دے دی اور دوسری خود اپنے سر پہ باندھنے لگا۔ دونوں بھائی جب پگڑیاں باندھ چکے تو نشست سے اُٹھ کر ہمارے سامنے اکڑوں کھڑے ہو گئے۔ وہ بے حد وجیہہ اور جری لگ رہے تھے۔ اُن کی پگڑیوں کی جھالریں ڈبے کی چھت کو چھُو رہی تھیں۔

"ایرانی ریلوے کے ڈبے دراز قد کُردوں کے لیے بے حد تنگ ہیں۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔

"سرزمینِ ایران کی طرح۔" بڑے بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

"ایرانی اِتنے بُرے نہیں۔" موٹی عورت جو اب تک بڑے فخر سے اپنے جوان بیٹوں کو دیکھ رہی تھی کہنے لگی "سارا قصور تو عراقیوں کا ہے۔"

"اِس کا خمیازہ بھی تو انہیں بُھگتنا پڑ رہا ہے۔" بڑے بھائی نے مُسکرا کر کہا اور پھر تینوں ماں بیٹوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

"ہماری بس جب کُردستان کی سرحد پر پہنچے گی تو ہم اپنے وطن میں داخل ہونے سے پہلے یہ پگڑیاں باندھ لیں گے۔" چھوٹے بھائی نے پگڑی کی گرہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ ایرانی لوگ انہیں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

"ایرانی کون ہوتے ہیں انہیں ناپسند کرنے والے۔" بڑے بھائی نے گرج کر کہا۔ "آج ہم نے اپنے پاکستانی بھائیوں کے لیے یہ پگڑیاں باندھی ہیں۔ اب یہ نہیں اُتریں گی۔"

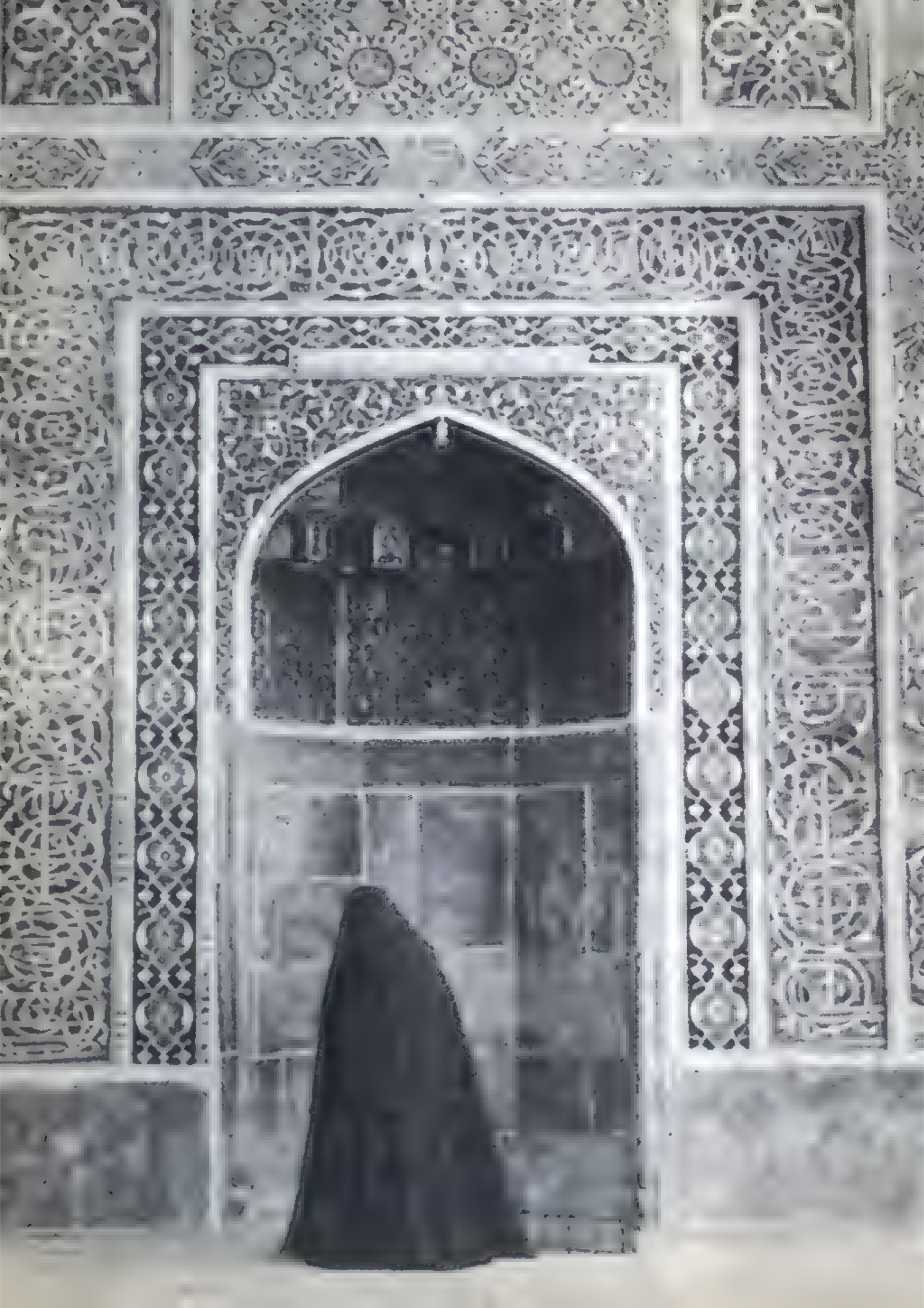
چھوٹے بھائی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اُس نے فوراً گرہ مضبوطی سے

باندھ لی۔ ماں نے سر ہلا کر بیٹے کے فیصلے کی تائید کی۔

موٹی عورت نے ہم سے بے شمار سوال پُوچھے۔ کتنے بہن بھائی ہو؟ دیہات میں لوگ کھیتی باڑی کس طرح کرتے ہیں؟ مسجدوں کے مینار کیسے ہوتے ہیں؟ پنیر بنانے کا رواج کیوں نہیں؟ قزوین قریب آیا تو کہنے لگی "تم میرے بیٹوں جیسے ہو۔ ہمارے ساتھ گاؤں چلو اور چند روز اپنے کُرد خاندان میں بھی گذارو۔"

"مَیں بھی آپ کو ماں ہی سمجھتا ہوں" اُس کے خلوص اور پیار سے متاثر ہو کر مَیں نے جواب دیا۔ "لیکن بیٹے ہمیشہ تو ماؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آج ہمیں اجازت دے دیں مَیں کبھی نہ کبھی آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ شاید اُس وقت تک کُردستان آزاد ہو چکا ہوگا۔" قزوین آیا تو ماں نے میرا ماتھا چُوما۔ سلامتی کی دُعا دی۔ بھائیوں نے گلے لگا کر خدا حافظ کہا اور تینوں کُرد رات کی تاریکی میں گُم ہو گئے۔

دوسری صبح ہم تبریز پہنچ گئے جو صوبہ آذربائیجان کا صدر مقام ہونے کے علاوہ تہران کے بعد ایران کا سب سے بڑا شہر ہے۔ کوہِ صاہند سے نکلتی ہوئی ندیاں جنوبی وادیوں کو سیراب کرتی ہیں جہاں زمین بے حد زرخیز ہے۔ مشرق کے اکثر شہروں کی مانند تبریز کا حال اس شہر کے شاندار ماضی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اکثر تاریخی عمارات قدرتی آفتوں اور زلزلے کی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکی ہیں۔ نیلی مسجد کی چند شکستہ اینٹیں اِس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ صدیوں پہلے یہ عمارت ایرانی فنِ تعمیر کا شاہکار ہوگی۔ ارگ کا حصار بلند فصیلوں اور میناروں کا ایک شکستہ ڈھیر ہے۔ تبریز ایران کے مغل بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا۔ ارغون خان کی درخواست پر جب خانِ اعظم نے ایک مغل شہزادی مارکوپولو کی حفاظت میں چین سے ایران روانہ کی تو پولو اُسے لے کر تبریز ہی آیا تھا لیکن ارغون خان اِس دوران فوت ہو گیا اور چینی شہزادی اس کے بیٹے غازان خان کے پلّے باندھ دی گئی۔ مارکوپولو اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے۔ "تبریز عراق کے صُوبے میں واقع ہے۔ لوگوں کی اکثریت کمخواب، ریشم اور اطلس



کے کاروبار میں ہے۔ شہر کے بازاروں میں ہندوستان۔ مسول اور ہرموز سے لایا ہوا سامان بکتا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی وادیوں میں قیمتی پتھر دستیاب ہیں۔ تمام شہر باغات سے ڈھکا ہوا ہے۔"

تبریز کی گلیوں میں گھومتے ہوئے مجھے شمس تبریزی اور مولانا روم کی پہلی ملاقات کی روایت یاد آگئی۔ مولانا اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم ہونے کی حیثیت سے دربار شاہی میں میں عالی مقام رکھتے تھے۔ ایک روز مولانا ایک تالاب کے کنارے بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شمس اُدھر سے گذرے تو کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر مولانا سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے ؟"

"یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں" مولانا جنہیں اپنے علم پر بے حد ناز تھا طنزاً کہنے لگے۔ اُن کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ کتابوں کے ڈھیر میں آگ لگ گئی۔ مولانا نے گھبرا کر شمس سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے ؟" تو اُنہوں نے بڑے تحمّل سے کہا۔ "یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔" مولانا یہ جواب سُن کر بے حد پشیمان ہوئے اور انہیں احساس ہُوا کہ روحانیت کے بغیر دنیاوی علم مکمل نہیں ہو سکتا۔ اُسی تالاب کے کنارے شمس تبریزی کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر ان کے قتل تک ساتھ رہے۔

اُسی دوپہر ہم ایک بس پر سوار ہو کر ایران۔ تُرک سرحد بازرگان کی طرف روانہ ہوگئے۔ تبریز سے باہر نکلتے ہی بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آذربائیجان کے زمینی مناظر بقیہ ایران سے یکسر مختلف ہیں۔ وہاں چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ صحرا پھیلے ہیں تو یہاں ہر سو ہرے بھرے کھیت اور سر سبز وادیاں بکھری پڑی ہیں۔ ان علاقوں میں لوگوں کی زبان بھی فارسی کی بجائے تُرکی ہے۔ ہم "مرانڈ" سے گذرے۔ وادی کے پہلو میں نیند میں ڈوبا ہُوا خوبصورت گاؤں، ایک حکایت کے مطابق حضرت نوحؑ کی اہلیہ یہاں دفن ہیں۔ "ماکو" کا قصبہ آیا، سُتھرا اور خوشنما۔ صحت مند لوگ، جا بجا پھولوں کے تختے۔ بڑے چوک کے

ساتھ شفاف ندی۔ برف گھل گھل کر نیچے آ رہی تھی اور پھر ماکو کا ناقابلِ تسخیر قلعہ جسے تیموری افواج کا منہ پھیر دینے کا شرف حاصل ہُوا۔

آس پاس کے اِنہی پہاڑوں اور وادیوں میں زرتشت نے تبلیغ کی۔ "جانوروں اور غریب لوگوں سے نیکی کرو۔ مقدس آگ کو لکڑیوں سے جلائے رکھو۔" خدا "آہورامزدا" نے کہا، "نیک سوچ، نیک الفاظ اور نیک اعمال ہی سے انسان نجات حاصل کر سکتا ہے۔" زرتشت نے غزنی تک سفر کیا۔ بلخ کے بادشاہ نے اپنے آتش پرست ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں بلخ آتش کدوں کا شہر کہلایا۔ "ماکو" سے نکل کر ایک مرتبہ پھر ہم پہاڑوں میں کھو گئے۔ چڑھائی کی وجہ سے بس بے حد آہستہ جا رہی تھی۔ بلندی کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ خنکی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک موڑ پر سامنے وادی کے آخری سرے پر چمکیلی روئی کا ایک ڈھیر نظر کے سامنے آ گیا۔ ارد گرد کے پہاڑوں سے بلند آسمان پر دُھند اور بادلوں کا ایک گولا سا بن گیا تھا۔ مَیں نے آنکھیں مسح کر غور سے دیکھا۔ دُھند نہیں ہو سکتی۔ شاید بادل ہیں۔

بس نے ایک اور موڑ کاٹا، سب کچھ اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پھر وہی بادل نظر آیا۔ بادل بھی نہیں تھا، برف تھی بالکل کوہِ فوجی یاما کی طرح ——— بازرگان تک یہ برف پوش پہاڑ یونہی آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ یہاں پر ایرانی کسٹم کے عملے نے صرف پاسپورٹوں پر مُہریں لگانے پر ہی اکتفا کیا۔ دوسری طرف تُرک کسٹم والوں نے جی بھر کے تلاشی لی اور اُسکے بعد سب کو ایک ایک فارم تھما دیا۔ "اسے پُر کر دیجیے۔ مجبوری ہے صرف کاغذی کارروائی۔" فارم پر بے شمار سوال درج تھے۔ آپ کے پاس کیمرے کی کتنی فلمیں ہیں؟ تُرکی میں کتنے روز قیام کا ارادہ ہے! آپ اپنے سامان میں چرس یا افیم تو نہیں لے جا رہے؟ اگر لے جا رہے ہیں تو مہربانی کر کے وزن لکھ دیجیے وغیرہ وغیرہ۔ سُنا ہے ترکی میں منشیات کی سمگلنگ کا اِنسداد اسی طرح کیا جاتا ہے۔ سمگلر حضرات فارم پُر کرتے وقت نہایت ایمانداری سے دو من افیون یا چار چھٹانک چرس لکھ دیتے ہیں؛ چنانچہ فوراً دھر لیے جاتے ہیں۔ ایران والے چونکہ سمگلروں

کی دیانت داری کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں اس لیے انہوں نے منشیات کا کھوج لگانے کے لیے السیشن کتوں کا عملہ بھرتی کر رکھا ہے۔ یہ کسٹم کتے منشیات کا کھوج کم لگاتے ہیں اور سیاحوں کے سامان میں بندھے ہوئے سینڈوچز اور پنیر زیادہ رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں۔

ایرانی کتوں اور ترک کسٹم سے چھٹکارا حاصل کر کے ہم نے کسٹم ہاؤس کے وسیع دالان کے پہلو میں واقع بینک سے ایرانی ریال ترک لیرا میں تبدیل کیے۔ صدر دروازے سے باہر نکل کر ترکی کی سرزمین پر جب پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میرے سامنے خنک چاندی کی چمکتی ہوئی دیوار کھڑی تھی۔ دامن سے چوٹی تک سفید برف کے بوجھ تلے دبا ہوا بلند پہاڑ جو سرحد کے اُس پار سے دھندلا کہر آلود بادل معلوم ہوتا تھا، اتنا نزدیک جیسے ہاتھ بڑھاؤ تو ایک چھناکے سے چھن چھن کرتی چاندی تمام وادی میں بکھر جائے۔ یہ کوہِ ارارات تھا۔ روایت ہے کہ طوفانِ نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اسی پہاڑ کی چوٹی پر لنگر انداز ہوئی تھی۔ ارارات کے پہلو میں بے شمار چوٹیوں نے سر اُٹھا رکھے تھے، لیکن سبھی خشک اور ویران۔ اس مقدس پہاڑ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے سربسجود۔

کوہِ ارارات کے خوبصورت سحر کے خنک بازو مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ یکدم ایک تیز اور یخ بستہ ہوا چلنے لگی جو ارارات کے پاک دامن سے چھو کر پھسلتی ہوئی نیچے وادیوں میں اُترتی اور میرے جسم کو یخ کر جاتی۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی تند ہوا کا شور کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ سڑک کے کنارے مٹی کا بنا ہوا ایک بوسیدہ قہوہ خانہ تھا جس کے باہر چند ٹوٹے ہوئے بنچ پڑے تھے۔ قہوہ خانے کا مالک شکستہ دیوار کے ساتھ ایک چھپر کی آڑ لیے کر زمین پر بیٹھا دہکتے کوئلوں پر شیش کباب بھوننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ خنک ہوا کا تھپیڑا پہاڑ سے اُترتا اور کوئلوں کو اُڑا لے جاتا۔ میں نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر کانوں پر رکھ لیا اور قہوہ خانے کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں اب بُری طرح ٹھٹھرنے لگا تھا۔ بنچ کے ساتھ ہی میرا سامان پڑا تھا۔ تھیلے کے پھٹے ہوئے کونے میں سے میری ہراتی پوستین کی

سیاہ کھال جھانک رہی تھی جس کی موجودگی مجھے یاد ہی نہ تھی۔ مَیں نے ٹھٹھرتے ہاتھوں سے تھیلا کھولا اور پوستین نکال کر پہن لی۔ قراقلی کی نرم اور گرم کھال نے میرے جسم کی تمام سردی چُوس لی اور مَیں شیش کباب بھوننے والی انگیٹھی کے ایک کوئلے سے سگریٹ جلا کر بڑے سکون سے بیٹھ گیا۔

"ایک سیخ کتنے کی؟" مَیں نے شہادت کی اُنگلی کھڑی کر کے قہوہ خانے کے مالک سے پوچھا۔

"دو لیرا۔" اُس نے اپنی قمیص کے دامن سے ہاتھ پونچھ کر مجھے ایک سیخ پکڑا دی۔

"ارض روم جانے والی بس کتنے بجے آئے گی؟" مَیں نے گوشت کا ایک ٹکڑا سیخ سے اتار کر جلدی سے منہ میں رکھ لیا۔ بے حد گرم تھا۔

"وہاں تو صرف دِن میں ایک بس جاتی ہے اور وُہ آج صبح صبح ہی چلی گئی تھی۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں تو میرا ایک دوست اپنے ٹرک پر آپ کو اگلے قصبے بایزید تک لے جائے گا۔ وہ اندر قہوہ پی رہا ہے" اس نے جواب دیا۔

مَیں نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور پاؤں تلے مَسل کے کھڑا ہو گیا۔ آرات کا پورا پہاڑ سورج کی روشنی سے چمک رہا تھا مگر گردو نواح کے پہاڑ اور گہری وادیوں میں دھند لکا چھا رہا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ قہوہ خانے کا مالک اب کباب بھوننے کی بجائے زمین پر بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ مَیں نے آرات کی چوٹی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا:

"اس کی برف کس موسم میں پگھلتی ہے؟"

"آرات کی برف کبھی نہیں پگھلتی۔" اُس نے تقدس آمیز نظروں سے چوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے بتایا۔ "یہ نوحؑ کا پہاڑ ہے۔ وادی کے دوسری طرف جس صبح موسم صاف ہو تو اس کی اُجلی برفوں میں ایک کالا دھبّا دکھائی دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ نوحؑ کی کشتی کا ایک حصّہ ہے۔"

"وادی کے اُس پار تو رُوس ہے۔" مَیں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اُس نے مایوسی سے سر ہلایا "ایک مرتبہ روسیوں نے نوح کی کشتی کی تلاش میں آرات پر ایک مہم بھی بھیجی تھی۔ وہ بے مذہب لوگ ہیں اس لیے ناکام واپس گئے۔"

اتنی دیر میں ٹرک کا مالک قہوہ پی چکا تھا۔ میرے اور علی کے علاوہ چند یورپی سیاح بھی ٹرک کے پچھلے حصّے میں سوار ہو گئے۔ ٹرک قہوہ خانے کے ساتھ والی ڈھلوان سے نیچے اُترا اور بایزید کی کچی سڑک پر دُھول اُڑاتا چل دیا۔ سڑک کے کنارے سفید سنگِ میل پر "ارض روم ۲۸۴ کلومیٹر" کے الفاظ لکھے تھے۔ کچی سڑک بالکل ہموار اور سیدھی جا رہی تھی۔ ہمارے بائیں ہاتھ ٹیلے اور پہاڑیاں تاحدِ نظر پھیلے ہوئے تھے اور دائیں جانب فصلوں اور چراگاہوں کا ایک وسیع اور سرسبز میدان آرات کی خنک دیوار کے دامن تک چلا گیا تھا۔ میدان کے خاتمے پر آرات کے پہلو میں گڑیوں کے گھروندوں ایسے ننھے مُنّے کچے مکانوں کے گاؤں تھے۔ برف مکانوں کی چھتوں کو چھُو رہی تھی۔ خنک ہوا کی شدت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ ٹرک میں سوار دوسرے مسافر سردی سے بچاؤ کے لیے کونوں میں دُبکے بیٹھے تھے اور علی ہمیشہ کی طرح ارد گرد کے مناظر سے بے نیاز سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ مَیں ٹرک کے جنگلے کا سہارا لیے بمشکل کھڑا تھا اور آرات کی اُجلی اُجلی برفوں، اِس کے دامن میں خوابیدہ کچے گاؤں اور لہلہاتی فصلوں کو ایک بھوکے اور ندیدے بچے کی طرح ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ اِس پوری وادی کا حُسن اپنے اندر سمو کر اس کا ذخیرہ کر لوں اور پھر زندگی کے تاریک لمحوں میں یہی حُسن قطرہ قطرہ رِس کر مجھے ٹھنڈک اور سکون کا احساس دلائے اور لمحوں کی تاریکی میں آرات کی سفید برف چمکنے لگے۔

اگرچہ اب رات ہونے کو تھی اور ساری وادی میں ملگجی اندھیرا پھیل رہا تھا، لیکن آرات کی چوٹی ابھی تک ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کی پیلی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ مَیں نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار ... میں نے زیرِ لب گنتا

شروع کر دیا۔ چوالیس۔ پینتالیس . . . . یکدم چوٹی تاریک ہو گئی جیسے شمع بجھ گئی ہو۔ سورج ڈوب چکا تھا۔

چند فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک ترک دیہاتی کھڑا تھا۔ قریب پہنچنے پر اُس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھا اور ٹرک ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دیہاتی کے کاندھے پر بندوق تھی اور اُس کے ساتھ مہین تھوتھنیوں والے دو شکاری کتے کھڑے تھے۔ وہ غالباً شکار سے واپس آ رہا تھا۔ اُس نے پہلے ہمیں اپنی بندوق تھمائی اور پھر ایک ایک کر کے بڑے پیار سے کتوں کو اٹھا کر ٹرک میں بٹھا دیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ڈرائیور کو اپنی زبان میں کچھ کہا اور ٹرک کے سٹارٹ ہوتے ہی بڑی پھرتی سے سوار ہو گیا۔ اُس کی کمر کے گرد بندھے تھیلے میں سے ایک خون آلود خرگوش کا خوب صورت اور لمبا کان باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے اپنے تھیلے کی طرف متوجہ پا کر وہ مُسکرا دیا اور اپنے کتوں کو تھپکتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ "اس وادی میں شکار کی اتنی بہتات ہے کہ ہم لوگ جو آرارات کے دامن میں رہتے ہیں روزانہ دو چار خرگوش مار لاتے ہیں۔ کبھی کبھار ہرن بھی مل جاتا ہے۔ کیوں بچّو ؟" اُس نے کتوں سے مخاطب ہو کر بڑے لاڈ سے کہا۔ جواب میں بچّوں نے اپنے تیز نوکیلے دانتوں کی نمائش کر دی۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد اُس نے اگلی سیٹ کا شیشہ بجا کر ڈرائیور سے رُکنے کے لیے کہا "میرے گاؤں جانے والی پگڈنڈی آگئی ہے" اور بندوق اور بچّوں کے ساتھ نیچے اُتر گیا۔ ٹرک دوبارہ چلا تو مَیں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں آرارات کے دامن میں ایک گاؤں کے ہلکے خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کچے گھر کی چمنی سے سفید دھوئیں کی بل کھاتی لکیر فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ شکاری کا رُخ اُسی جانب تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے دونوں کتے دُم ہلاتے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ شاید انہوں نے اُس گھر میں پکنے والے رات کے کھانے کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ کاش میں بھی اُن کے ساتھ اس مقدس پہاڑ کی گود میں بسے خوبصورت گاؤں میں جا سکتا۔ صرف ایک رات کے لیے۔

شاید میں اس طرح آرارات کے طلسم کو پالوں، اُسے چھُو لوں۔

آج سے تقریباً سات سو برس پیشتر مارکوپولو بھی اسی راستے سے گذرا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے۔ "آرمینیا کے قلب میں ایک نہایت بلند پیالہ نما پہاڑ واقع ہے۔ کہا جاتا ہے نوحؑ کی کشتی یہاں لنگرانداز ہوئی تھی اور اسی مناسبت سے اسے "نوحؑ کا پہاڑ" کہتے ہیں۔ یہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ اس کے گرد چکر لگانے میں دو دن صرف ہو جاتے ہیں۔ چوٹی پر برف پوری طرح کبھی نہیں پگھلتی بلکہ ہر سال پرانی برف پر نئی برف کی تہیں جم جاتی ہیں اور اس طرح اس کی بلندی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ برف کے پگھلنے سے پہاڑ کا دامن سرسبز اور زرخیز ہے۔"

بایزید پہنچے، اندھیرا چھا چکا تھا اور شدید سردی تھی۔ شاید یہ آرارات کی ابدی برفوں کا کرشمہ تھا۔

"ارضِ روم" کے لیے بس صبح ساڑھے چار بجے روانہ ہوگی۔ آپ ٹکٹ ابھی خرید لیجیے" ہمیں بسوں کے اڈے پر بتایا گیا۔

شب بسری کے لیے ہوٹل کی تلاش کے مرحلے سے پہلے ہم نے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ بایزید قلعہ کے پہلو میں ایک گندا سا قہوہ خانہ نظر آیا۔ مَیں نے کہر آلود شیشوں کو ہتھیلی سے پونچھا اور اندر جھانکا۔ خوب اُدھم مچا ہوا تھا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو سب لوگ خاموش ہو گئے کہ یہ اجنبی جانے کہاں سے آ گئے۔ علی نے ہاتھ اُٹھا کر بلند آواز سے السلام علیکم کہا تو پھر سے اُدھم مچ گیا کہ اپنے ہی ہیں۔ کھانے کے حصول میں خاصی دشواری پیش آئی، کیونکہ زبانِ یارِ من ترکی والا معاملہ تھا؛ چنانچہ مالک ہمیں باورچی خانے میں لے گیا جہاں اس کی نہایت خوش شکل، مگر قدرے فربہ بیٹیاں گاہکوں کے لیے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا دیں اور دیگچیوں کے ڈھکن اُٹھا اُٹھا کر تمام تُرک کھانوں

کا تعارف کروایا۔ گاڑھے چاول اور سبزیوں کا سُوپ۔ مکھن میں تلے ہوئے بند گوبھی کے پتّے۔ قیمہ بھرے بینگن۔ چاول اور سلاد کے کوفتے اور مختلف قسم کے کباب۔ علی دیگچیوں کی بجائے گوری چٹی ترکن کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ مَیں نے مالک کو اشارے سے بتایا۔ یہ۔ یہ اور چپاب یعنی کباب اور پھر علی کا بازو تھام کر اُسے واپس قہوہ خانے میں لے آیا۔

"خوب است" وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

کھانا آیا تو ہم نے اسے ایرانی خوراک سے بدرجہا لذیذ پایا۔

وہ رات ہم نے ایک بے حد غلیظ سرائے نما عمارت میں بسر کی اور منہ اندھیرے اُٹھ کر بسوں کے اڈے پر آگئے۔ مَیں نے قصبے سے پرے کوہ آرارات کی طرف دیکھا وہاں ابھی تک تاریکی کا راج تھا۔ بس شہر سے نکلی تو میری نگاہیں ایک ہی نقطے پر مرکوز رہیں۔ سورج طلوع ہوا۔ پہلی کرن آرارات کی برف پوش چوٹی پر پڑی اور منعکس ہو کر پوری وادی میں پھیل گئی۔ "آج مطلع صاف ہے" مَیں نے دھند اور بادلوں سے پاک نیلگوں آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا "وادی کی دوسری طرف آرارات کی اُجلی برفوں میں ایک سیاہ دھبّا دکھائی دے رہا ہو گا۔ کشتیٔ نوحؑ کا ایک حصّہ۔" آہستہ آہستہ ہم آرارات سے دُور ہوتے گئے یہاں تک کہ مجھے اس کی سفید برف پر دُھند یا بادل کا گمان ہونے لگا۔ بس نے ایک موڑ کاٹا اور آرارات نظروں سے غائب ہو گیا۔ مَیں اب اِس مقدّس اور خوبصورت پہاڑ کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا۔

گرد و نواح کی پہاڑیوں پر ابھی تک سرما کی برف پوری طرح نہیں پگھلی تھی۔ کہیں کہیں گڈریوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آتے۔ عورتیں چھینٹ کے چُغوں اور شلواروں میں ملبوس۔ سر پر رنگ برنگے رومال باندھے اُپلے تھاپنے میں مصروف اور مرد بھیڑیں چراتے ہوئے۔ کچّے مکانوں کی چھتوں پر گھریلو کپڑوں کے علاوہ ترکمان قالین اور نمدے دھوپ میں سُوکھ رہے تھے۔ ایک سر سبز و شاداب میدان کے آخر میں کسی شہر کے اُفقی خطوط نمودار

ہوئے۔ "ارضِ رودم" ڈرائیور نے پلٹ کر مسافروں کو بتایا۔ شہر کے مکانوں کی سُرخ
چھتوں کے درمیان شیفتہ مدرسے کے مینار دھوپ میں چمک رہے تھے۔

مدرسے کے میناروں سے بارش کا پانی برس برس کر میرے قدموں میں جمع ہو رہا تھا۔ مَیں نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ ہاں یہی نم آلود اور افسردہ مینار تھے جنہوں نے چھ ماہ قبل چمکتی دھوپ میں میرا استقبال کیا تھا۔ اُس روز مَیں کتنا خوش تھا۔ ارضِ رودم کے کوچہ و بازار میں زندگی اور خوب صورتی تھی۔ علی اور مَیں نے یونیورسٹی کے ساتھ ایک نفیس قہوہ خانے میں ڈولما اور شیش کباب کھائے اور بھر پوری دوپہر شہر میں گھومتے رہے۔ استنبول کے لیے گاڑی شام چھ بجے چلتی تھی اور ابھی ایک بجا تھا۔ ہم نے دورانِ سفر کیلئے خشک مچھلی، پنیر، انڈے اور ڈبل روٹی خریدی۔ اور پھر ہم اِدھر آنکلے۔ مدرسے کے باہر لوگ دھوپ سینک رہے تھے۔ خوانچے والے ترک مٹھائیوں کے تھال لیے بیٹھے تھے اور اُن کے گرد بے شمار بچے جمع تھے اور پھر اُس روز وہ فقیر بھی تو یہیں بیٹھا تھا جو ابھی ابھی بارش سے بچاؤ کی خاطر سٹیشن کی طرف چلا گیا تھا۔ اُس کی جھولی میں میرا آخری لیرا تھا۔ مَیں نے علی سے کہا مدرسہ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ اسی دروازے کے باہر دربان نے ہمیں روک لیا "کھڑکی سے ٹکٹ خرید لیجئے۔ دو لیرا" علی نے آہنی دروازے کی سلاخوں سے اندر جھانکا اور کہنے لگا۔ اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری موچی دروازے والی مبارک حویلی اِس سے کہیں بہتر ہے۔ دو لیروں میں مچھلی کا ایک اور ڈبہ آسکتا ہے۔" اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اُس روز میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یورپ سے واپسی پر اِسی مدرسے کے میناروں تلے مَیں اِس حالت میں کھڑا ہوں گا۔ میری جیب خالی ہوگی اور وطن جانے والی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ یہ شہر اور اِس کے گلی کوچے میرے لیے بے بسی اور غریب الوطنی کا پیغام بن جائیں گے۔

اُس روز سٹیشن تک جانے والی سڑک کے دو رویہ شاہ بلوط کے درختوں میں کتنی تازگی

اور شگفتگی تھی ۔ موسم بہار کا آغاز تھا ۔ ہم دونوں خوراک کے پیکٹ اور اپنا سامان اُٹھائے آنے والے حسین سفر کی رنگینیوں میں کھوئے گنگناتے ہوئے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے جہاں استنبول جانے والی گاڑی کھڑی تھی ۔ بارش ابھی تک جاری تھی ۔ مَیں ایک مرتبہ پھر اپنے سفر کی حسین یادوں میں کھو گیا ۔

ارض روم کے چھوٹے سے سٹیشن پر بے حد رش تھا ۔ گاڑی جواب تک سٹیشن سے باہر ریلوے یارڈ میں کھڑی تھی وہاں سے چل کر پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو ہزاروں لوگ اُس پر ٹوٹ پڑے ۔ چند سیاحوں کے علاوہ باقی تمام مسافر ترک دیہاتی تھے ۔ مَیں اپنا سامان اُٹھائے بے بسی کے عالم میں پلیٹ فارم کے دونوں سروں کے درمیان جگہ کی تلاش میں طواف کرتا رہا لیکن ہر دروازے اور کھڑکی میں جسموں کی ایک دیوار چُنی تھی ۔ مَیں نے گارڈ سے مدد کی درخواست کی تو اُس نے سامان مجھ سے لے کر ایک کھڑکی کے اندر دھکیل دیا اور ساتھ ہی گاڑی چلنے کا وِسل دے دیا ۔ گاڑی چلی تو مَیں پائدان کے ساتھ لٹک رہا تھا ۔ دروازے میں کھڑے دیہاتی میری طرف اشارہ کرتے اور پھر ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر بیوقوں کی طرح دانت نکال لینے لگتے ۔ مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا ۔ کافی دیر بعد جب اُنہیں احساس ہوا کہ اس معلق حالت میں مَیں اُن کے مزاح سے لُطف اندوز ہونے سے قاصر ہُوں تو انہوں نے مجھے گاڑی کے اندر کھینچ لیا ۔ سامان کی تلاش ہوئی تو وہ ڈبوں کے ساتھ لمبے راستے میں پڑا ملا ۔ مجھے حلی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ آیا وہ گاڑی پر موجود بھی ہے یا نہیں ۔ بہرحال مَیں سامان کے تھیلے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ استنبول تک دو راتوں اور ایک دن کا سفر کیسے کٹے گا ۔ اس دوران کئی دیہاتی بلا جھجک و جھجک میرے جسم کو پھلانگ کر گاڑی کے دوسرے حصے میں آتے جاتے رہے ۔

" آپ کے تھیلے پر چاند تارے کلبہ رحیم کاڑھا ہوا ہے ۔" ایک نوجوان ترک جو

مجھے پھلانگنے کے لیے اپنی ٹانگ اُٹھائے کھڑا تھا۔ رُک کر کہنے لگا۔ مَیں چونکہ اس وقت پاک تُرک بھائی بھائی کا نعرہ لگانے کے موڈ میں نہیں تھا اس لئے خاموش بیٹھا گھورتا رہا۔

"آپ شاید پاکستانی ہیں؟" اس نے نہایت پیار سے پوچھا اور اپنی ٹانگ نیچی کر لی۔

"بالکل ہوں" میں نے جل کر کہا۔ "لیکن آپ لوگ سلوک میرے ساتھ یونانیوں جیسا کر رہے ہیں۔" اِس دوران ایک اور دیہاتی مجھے پھلانگ کر چلا گیا۔ وُہ بھلا مانس نوجوان ترک میرے تیور دیکھ کر وہاں سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور میرا سامان اُٹھا کر مجھے ایک ڈبے میں لے گیا۔ "تشریف رکھیے یہ میری سیٹ ہے۔ چونکہ مَیں نے اگلے سٹیشن پر اُتر جانا ہے اِس لیے گارڈ سے کہہ کر یہ سیٹ آپ کے لیے مخصوص کروا دی ہے۔"

اب میرا جی چاہا کہ نعرہ لگا دوں پاک تُرک . . .

"اور ہاں" اس نے میرا سامان نشست کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم یونانیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا کرتے۔"

"مجھے اپنے رویّے پر ندامت ہے۔" مَیں نے سر جھکا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں سفر کے دوران ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔ اگلا سٹیشن آیا تو وہ اُتر کر چلا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب اکثر مسافر سو چکے تھے مَیں علی کو ڈھونڈنے کی غرض سے باہر نکلا اور پوری گاڑی میں گھوما۔ ایک غسل خانے کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے علی سگریٹ کے کش لگاتا ہوا مل گیا۔

"کوئی سیٹ ملی یا راہوں میں پڑے ہو؟" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا "ویسے غسلخانہ بالکل خالی ہے۔" مَیں نے اُسے ساتھ لیا اور اپنے ڈبے میں لا کر ایک کونے میں فکس اپ کر دیا۔

ہمارے ڈبے میں بھی تمام مسافر اناطولیہ کے دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن حضرات کی خاصیت یہ ہے کہ کسی بھی جگہ ہر پوزیشن میں بڑے اطمینان سے سو جاتے ہیں۔ ایک صاحب کونے میں اکڑوں کھڑے خراٹے لے رہے ہیں تو دوسرے سیٹ کے عین نیچے بستر بغیر محوِ خواب

ہیں۔ سفر کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ہاتھ لٹکائے آجاتے ہیں اور آتے ہی اپنے ڈھیلے ڈھالے سوٹ سمیت۔ خستہ حال ہیٹ کو آنکھوں تک نیچے کھینچ کر کسی بھی حالت میں سو جائیں گے اور منزل آنے تک خراٹے لیتے رہیں گے۔ اس دوران اگر شامتِ اعمال سے اُن کے پاؤں آپ کی قوتِ شامہ کے دائرے میں آجائیں تو وہیں بیٹھے اناطولیہ کے دیہات کی خوشبوؤں سے قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ گاڑی کی کھڑکیاں بالکل بند کر دیں گے اور کتنا ہی حبس کیوں نہ ہو جائے تازہ ہوا کو سم قاتل سمجھیں گے۔ کھانے کا وقت ہوا تو ایک جیب سے روٹی نکالی دوسری سے پیاز اور چٹخارے لیکر کھا گئے۔ روٹی کے ساتھ اگر شہتوت مل جائیں تو پوری عیاشی ہو گئی۔ اناطولیہ کے اِن دیہاتیوں کی جفاکشی اور فاقہ مستی دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ عثمان ترکوں نے کس کے بل پر ویانا کے دروازوں پر دستک دی اور گیلی پولی میں انگریزوں کا بھُرکس کس نے نکالا۔

صبح سویرے گاڑی "سیوا" پہنچی پلیٹ فارم پر بوتلوں میں بند کھٹی لسّی بک رہی تھی۔ وطن یاد آگیا۔

رات گئے "انقرہ" آیا۔ جیسے دیوالی کی رات ہو۔ لاکھوں دیئے ٹمٹما رہے تھے۔ گاڑی کا یہ طویل سفر بے حد صبر آزما اور اُکتا دینے والا ثابت ہوا۔ اناطولیہ کی خوشبوؤں کے علاوہ غسل خانے میسر اور پانی ندارد۔ ڈائیننگ کار موجود اور ڈنر غائب۔ ارض روم سے خرید کی ہوئی مچھلی اور پنیر کام آئے ورنہ نوبت فاقہ مستی تک پہنچتی۔ ہمیں گاڑی پر سوار ہوئے تینتیس گھنٹے بیت چکے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سُست رفتار گاڑی صدا یونہی چلتی رہے گی اور ہم کبھی بھی استنبول نہ پہنچ پائیں گے۔ دروغ بر گردنِ علی کہنے لگا کہ انقرہ سے ادھر شملہ پہاڑی کے حجم جتنی ایک پہاڑی چڑھتے چڑھتے انجن کی طاقت جواب دے گئی اور گاڑی کھسکتے کھسکتے پھر نیچے واپس آگئی۔ انجن نے ایک مرتبہ پھر زور لگایا لیکن پہاڑی کے عین وسط میں پہنچ کر گاڑی پھر۔۔۔ بہرحال علی کہہ رہا تھا مجھے اس بارے میں علم نہیں کیونکہ میں اُس وقت سو رہا تھا۔

بازنطائن۔ قسطنطنیہ۔ استنبول

"میں سمندروں کا سینہ چیر کر آج مقدّس شہر بازنطائن پہنچ گیا ہوں"

(YEATS)

دوسری صبح میں سو کر اُٹھا تو ہمارے ڈبے میں تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ میری آنکھیں ابھی تک نیند سے بوجھل تھیں۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اوپر کھسکا کر سر باہر نکالا اور ایک گہرا سانس لیا۔ ہوا میں سمندر کی سیلی خوشبو تھی۔ دُور افق پر ایک نیلی لکیر اُبھری اور سبز کھیتوں کو چیرتی ہوئی گاڑی کے ساتھ آ لگی۔ بحیرۂ مرمر، جس کے آخری سرے پر استنبول تھا۔

ایک جانب سرو کے لمبے درختوں اور سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور دوسری طرف نیلگوں بحیرۂ مرمر۔ مرمر کے کنارے لکڑی کے بنے ہوئے خوشنما کاٹج جن کے باغیچے سُرخ اور نیلے رنگ کے جنگلی پھولوں سے اَٹے ہُوئے۔ انگور کی بیلوں سے لدے ہوئے شرمیلے خاموش کُنج۔ سرو کے گہرے سبز اور نیم تاریک جھنڈ۔ ہر لمحہ خوبصورتی کا ایک نیا پہلو سامنے آ رہا تھا۔ ایک برف کی مانند سفید پیارا سا گھر نظر کے سامنے آیا۔ باغ میں پُرانی وضع کا سنگِ مرمر کا فوارہ۔ کُھلے آہنی دروازے کے پیچھے درختوں اور بیلوں کی سبز تاریکی لیکن بالکل سُنسان جیسے آسیب زدہ ہو۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ مرمر کی سطح ایک جھیل کی مانند پُرسکون تھی۔ "یالی" گھروں کے ہرے بھرے باغیچے نیچے پانی کی سطح تک چلے گئے تھے۔ ہر

گھر کا اپنا چھوٹا سا گھاٹ تھا جہاں صُبح کی ہلکی دُھند میں کشتیاں پانی میں ہلکورے لے رہی تھیں۔

"استانبول۔ استانبول" ریلوے گارڈ ہر کیبن کے دروازے پر دستک دیتا ہوا جا رہا تھا۔ ہماری گاڑی جب استنبول کے حیدر پاشا سٹیشن پہ رُکی تو سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ گندا اور غیر مؤثر سٹیشن۔ چالیس گھنٹے کی مسافت کے بعد زمین پر قدم رکھا تو یوں محسوس ہُوا جیسے جیل سے چھُوٹے ہوں۔ باہر نکلے تو باسفورس کا پانی قدم لینے کو آیا۔ ہلکی لہریں چھپاک چھپاک سٹیشن کی سیڑھیوں کو چھُو رہی تھیں۔ سامنے ٹیکسی یا ٹانگہ سٹینڈ کی بجائے سٹیمر کھڑے تھے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور عرشے پر سامان رکھ کر بیٹھ گئے۔ سٹیمر کا گھگھیایا ہوا بھونپو زور زور سے بجا اور ہم ایشیا سے جُدا ہو چکے تھے۔ دوسرے کنارے پر یورپ تھا۔ ترخم کی سرحد پر اپنا ملک چھوڑنے کا غم تھا اور یہاں اپنا برّاعظم چھُوٹنے پر افسوس ہو رہا تھا۔

میرے سامنے گنبدوں اور میناروں کا ایک شہر سمندر سے اٹھا۔ یہ شہر ماضی بعید میں بازنطینیوں کا بازنطائن۔ ماضی میں کانسطنطائن کا قسطنطنیہ اور حال میں عثمانی ترکوں کا استنبول کہلایا۔ ایک شہر تین عہد، تین روپ اور تین ہی حصے۔ ایک حصہ ایشیا میں جہاں سے ہم آ رہے تھے۔ دوسرا یورپ میں اسلامبول جو ہماری منزل تھی اور تیسرا الغلطہ جسے شاخ زریں اسلامبول سے جُدا کرتی ہے۔ ایک ہی شہر۔ ہمارے گرد آبنائے باسفورس میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایشیا اور یورپ کے درمیان درجنوں مسافر بردار کشتیاں رواں دواں۔ سامان سے لدے ہوئے بیڑے۔ مچھیروں کی لاتعداد کشتیاں۔ دُنیا کے ہر کونے سے آئے ہُوئے تجارتی جہاز اور پھر ہارن اور بھونپوؤں کی متواتر آوازیں۔ دنیا بھر میں کسی بھی شہر نے اپنے گرد پھیلے ہوئے سمندر کو اتنی خوبصورتی نہیں بخشی جو باسفورس کے حصے میں آئی ہے۔ وینس کی خوبصورتی کا انحصار ہی سمندر پر ہے مگر استنبول میں سمندر شاخ زریں کا کشکول ہاتھ میں لیے شہر سے حسن کی بھیک مانگ رہا ہے۔ میری نظروں کے سامنے اس حسین شہر کے طلسمی اُفقی خطوط اُبھر رہے تھے۔ آیا صوفیہ کا عظیم الجثہ گنبد۔ احمد مسجد کے چھ نازک اندام اور باریک مینار۔

ترک سلطانوں کا محل سرا۔ شاخ زریں پر پُل الغلطہ اور اس گھنے جنگل میں سینکڑوں لا مبے اور پتلے مینار ہر سو بکھرے ہوئے جیسے نیلے آسمان کے سینے میں تیز چمکتے ہوئے برچھے گڑھے ہوں۔ میرے لیے استنبول کی پہلی جھلک جوانی کے قربوں اور پہلی محبت کے احساسات سے زیادہ حسین اور ہیجان خیز ثابت ہوئی تھی۔

یہ سفر صرف دس منٹ میں کٹ گیا۔ دوسرے کنارے پر ہم نے دفتر معلومات سے کسی مناسب اور ستھرے ہوٹل کے بارے میں دریافت کیا تو کاؤنٹر پہ کھڑے نوجوان تُرک نے ہمیں "یوسل ہوسٹل" میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا۔ "پُل غلطہ کو پار کرکے سٹیشن کے ساتھ والی سڑک پر چلے جائیے۔ ہوسٹل آیا صوفیہ کی دیوار کے سامنے واقع ہے۔"

یوسل ہوسٹل نہایت آرام دہ اور صاف ستھرا تھا۔ گرم اور ٹھنڈا پانی۔ فلش سسٹم۔ گدّے دار نرم بستر۔ درمیان میں ایک جدید کیفے جس کے صحن میں انگوروں کی بیلیں تھیں۔ ہوسٹل کا انتظام تُرک طلبار کی ایک تنظیم کے ذمّے ہے جو اسے صرف سیّاحوں کی سہولت کے لیے رضاکارانہ بنیادوں پر چلاتی ہے۔ ہوسٹل کے دروازے کے ساتھ نوٹس بورڈ پر "ضرورت ہے" "برائے فروخت" کی سرخیوں کے نیچے کاغذ کے پرزوں پر بڑے دلچسپ اعلانات تحریر تھے۔

ضرورت ہے

"ایک نوجوان فرانسیسی سیاح کو سِکّم اور بھوٹان کے سفر کے لیے ایک لڑکی کی (پندرہ سے پینتیس سال)، انگریزی جانتی ہو اور معاشرے کے گھسے پٹے اخلاقی اقدار کی پابند نہ ہو۔ کار کے پٹرول کی قیمت بانٹنا ہوگی۔ باقی سب کچھ مفت۔"

یا پھر "دو ساتھیوں کی جو کسی یونانی جزیرے کی چٹانوں میں دو ماہ تک میرے ساتھ رہ سکیں۔ "طلسمی گھاس" کا انتظام میرے ذمّے ہوگا۔ تفصیلات کے لیے کمرہ نمبر فلاں۔"

برائے فروخت

بدھ کا ایک نادر مجسمہ جو نیپال کے ایک راہب خانے سے چرایا گیا ہے۔ استنبول

سے نیویارک تک کا ہوائی ٹکٹ۔ لمبے بالوں کی ایک وِگ۔ ڈالر چھپانے والی ایک کمر پیٹی"۔
یا پھر "خواتین کے استعمال شدہ زیر جامہ ملبوسات۔ اشتہار دہندہ افریقہ جا رہی ہے"۔
وغیرہ وغیرہ۔

جس کمرے میں ہمیں بستر الاٹ ہوئے وہاں چند اور غیر ملکی سیاح بھی براجمان تھے۔
مَیں نے بستر کے ساتھ لاکر میں سامان رکھا اور نہانے کے لیے چلا گیا۔ شاور کے گرم پانی سے
پچھلے تین روز کی تھکن بالکل دُور ہو گئی اور مَیں کمرے میں واپس آکر سو گیا۔ آنکھ کھُلی تو شام
ہو چکی تھی۔ کمرے کے دوسرے مکین باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میرے ساتھ والے
بستر پر ایک پاکستانی حضرت "استنبول کی شبینہ رنگینیاں" نام کا کتابچہ بڑی دلچسپی سے پڑھ
رہے تھے۔ مَیں نے اپنا تعارف کروایا تو کہنے لگے "اجی صاحب چھوڑیے سبھی یہی کہتے ہیں
کہ سیاحت پر نکلا ہوں لیکن چکر یورپ میں نوکری کا ہوتا ہے۔ بہر حال میری ملنیے تو ولایت
میں سمگل ہو جایئے ضروری پتے مَیں آپ کو دیئے دیتا ہوں۔ ویسے میں جرمنی سے مرسیڈس
گاڑیاں خرید کر بیروت میں بیچ دیتا ہوں۔ وارے نیارے ہو جاتے ہیں"۔

دوسری جانب علی ایک سکھ سے بات چیت میں مصروف تھا۔ "عالی صاحب"
وہ کہہ رہا تھا۔ "اِن دا فرانک فورٹ وِچ کاراں کا بزنس ہے جی۔ واہگرو کی کرپا سے"
(دو ہفتے بعد جب میں فرینک فرٹ پہنچا تو یہی سکھ حضرت وہاں کے یوتھ ہوسٹل میں جھاڑو
دے رہے تھے)

میرے اُوپر والے بستر پر ایک نہایت خوش شکل اور سنجیدہ سویڈش نوجوان تمباکو پینے کے
پائپ پر نہایت مشاقی سے چمڑا منڈھ رہا تھا۔ "کیا مَیں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ پائپ پر
چمڑا لگانے کا کیا مقصد ہے؟" مَیں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ مرسان پتھر کا بنا
ہوا ہے" اُس نے پائپ پر ایسے پیار سے ہاتھ پھیرا جیسے کوئی نادر مجسمہ ہو۔ "اس پر چمڑا منڈھ
کر چند روز کے باقاعدہ استعمال کے بعد اس کا رنگ کریم سے چمکتے ہوئے بھورے رنگ میں بدل

بدل جاتا ہے۔ پھر جبڑا اتار دیا جاتا ہے۔ صرف استنبول میں ملتا ہے۔

"اور اگر اس میں تمباکو کی جگہ چرس پی جائے تو ؟" اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہپّی نے پوچھا اور پھر خود ہی جھوم کر کہنے لگا۔ "بس رنگین ہی ہو جائے سب کچھ۔ ہری ادم" اس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

ہم اپنے کمرے کی رنگین دُنیا چھوڑ کر باہر نکلے تو کیفے کے صحن میں تیز موسیقی کی لے پر چار ہپّی بھالوؤں کی طرح ناچ رہے تھے۔ ہوٹل کے سامنے آیا صوفیہ کی دیوار کے دائیں طرف ڈھلوان گلی سے نیچے اُتر کر ہم باسفورس کے کنارے آگئے جہاں سارا شہر تفریح کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ بچّوں کا شور۔ کباب بیچنے والے۔ اخبار والوں کی صدائیں۔ چھوٹے لڑکے ہاتھ میں بوٹ پالش کے بُرش تھامے اِس انتظار میں کہ آپ کا دھیان دوسری طرف ہو اور وہ برشں آپ کے بُوٹ پر جما کر "ودلیرا" کا نعرہ لگا دیں۔ ساحل پر لنگر انداز کشتیوں اور سٹیمروں پر رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ سمندر میں بے شمار چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں تیل کے لیمپ جل رہے تھے۔ لہروں کی چھلک سے کشتیاں جھولتیں تو لیمپ کے بلند شُعلے پھڑ پھڑانے لگتے۔ مَیں نے اُوپر سے جھانک کر دیکھا تو ہر کشتی میں الاؤ جل رہے تھے جن کے اُوپر بڑے بڑے تھالوں میں مچھلی تلی جا رہی تھی۔ یہ مچھلی جال کے ذریعے کشتی کے دوسرے سرے پر پکڑی جا رہی تھی۔ مچھلی کا ایک خستہ ٹکڑا۔ ڈبل روٹی اور ایک اَن چھلا پیاز صرف دو لیرے میں۔ مَیں نے ایک سکّہ مانجھی کی طرف اُچھال دیا اور اُس نے اخبار کے کاغذ میں لپٹی مچھلی مجھے تھما دی۔

ساحل کے ساتھ سیڑھیاں طے کر کے ہم پُل غلطہ پر آگئے۔ بسیں اور کاریں گذرتیں تو پُل کے تختے دھم دھم بجتے۔ پُل کے نیچے مچھیرے بحیرہ اسود اور مَرمَرہ سے پکڑی ہوئی مچھلیاں فروخت کر رہے تھے۔ خریداروں کا ہجوم تھا۔ ہر سو روشنی اور زندگی کی گہما گہمی تھی۔ استنبول ایک مخصوص مزاج کا حامل ہے جو اس کی گندگی اور بُو سے اُبھر کر آپ کے سامنے آتا ہے اور

آپ کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے۔ تہران اپنی جدید ترین عمارتوں اور صاف شفاف سڑکوں کے باوجود اس خاصیت سے محروم ہے۔ پُل کو عبور کر کے ہم دوسری جانب آ گئے اور وہاں سے "تقسیم چوک" جانے والی بس پر بیٹھ گئے۔ کنڈکٹر ہمیں دیکھ کر مُسکرایا اور شہادت کی دونوں اُنگلیاں کا پنچ کھیلنے کے انداز میں جوڑ کر کہنے لگا "ترک - پاکستانی بھائی بھائی - کہاں جاؤ گے؟" مَیں نے ہنس کر کہا۔ "سُنا ہے ہوٹل ہلٹن کے اوپن ایئر برآمدے سے استنبول پریوں کا شہر لگتا ہے؟" چنانچہ اُس نے ہمیں "جمہوریت" میں اُتار دیا۔

دُنیا کے کسی بڑے شہر میں چلے جائیے لیکن ان جہاز نما ہوٹلوں کا اندرونی ماحول امریکی ہی ہو گا سوائے ملازموں کے رنگ و روپ کے۔ ہوٹل ہلٹن کے اوپن ایئر برآمدے سے نیلگوں سمندر کی آغوش میں سمٹا ہُوا استنبول واقعی پریوں کا شہر لگ رہا تھا مگر اس خوبصورتی میں بل کی آمد نے زہر گھول دیا۔

"ہلٹن میں دو پیالی کڑوی کافی کی قیمت برابر ہے باسفورس کی تلی ہوئی مچھلی کی پوری کشتی کے" علی نے فوراً حساب لگا کر بتایا۔

ہم یہاں سے اُٹھ کر "تقسیم چوک" کے پار جادۂ استقلال میں چلے گئے۔ یُوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے اب باسفورس کے کنارے سے اُکتا کر یہاں ہلا بول دیا ہو۔ مری کی مال روڈ کی طرح ہزاروں لوگ سجے سجائے چہرے پہنے بے مقصد گھوم رہے تھے۔ یہ استنبول کی سب سے مشہور اور مصروف ترین شاہراہ ہے۔ سینما، ریستوران، سٹورز اور نیون روشنیوں کی بھیڑ اور پہلو میں درجنوں تاریک گلیوں میں استنبول کی رنگینیاں۔ ایک کونے پر ایک تُرک نوجوان ہمارے ساتھ ہو لیا۔ "ڈالر چینج؟ گرلز؟ سٹرپ ٹیز؟" اس نے اپنی کاروباری فہرست سُنا دی۔

"یار یہ سٹرپ ٹیز کیا ہوتا ہے؟" علی کی آنکھوں میں چمک تھی۔

"ننگی لڑکیوں کا ناچ ہوتا ہے بیٹے۔" مَیں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"معافی بھئی" حلمی نے لاہوریوں کے خاص انداز میں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "میں نے سمجھا شاید کوئی کھانے کی چیز ہے۔"

استقلال کی رونق کم ہونے لگی تو ہم نے واپسی کی ٹھانی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ غلطہ کی قدیم آبادی ہے۔ ہم اینٹوں سے بنی ہوئی ڈھلوان گلیوں سے نیچے اترنے لگے۔ اس علاقے میں کبھی صرف جنوآ اور وینس کے باشندے آباد تھے۔ جب کبھی استنبول پر حملہ ہوتا یہ حضرات فوراً حملہ آور کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور کہتے کہ حضور ہم تو کاروباری لوگ ہیں۔ شاخِ زریں کے پار اسلامبول والوں سے آپ کا جھگڑا ہو تو ہو ہم آپ کے خادم ہیں ہمیشہ حملہ آور کا ساتھ دیتے بلکہ مناسب دام طے ہو جانے پر اپنے سپاہی بھی ساتھ کر دیتے چنانچہ اکثر فائدے میں رہتے۔ ان کی مہمان نوازی سے متاثر ہو کر زیادہ تر غیر ملکی بادشاہوں نے اپنے سفارت خانے اسی آبادی میں بنوائے۔ غلطہ کی آبادی کے عین درمیان ایک بلند اور بالا مینار ہے جسے جنوآ والوں نے بنوایا اور "مینارِ عیسےٰ" کا نام دیا۔ آج کل اس کی چوٹی پر آگ بجھانے والے عملہ کا دفتر ہے۔ شہر کے چوبی مکانات میں اکثر آگ لگتی رہتی ہے اور اس کی بلندی سے فوراً موقعہ کا تعین کر لیا جاتا ہے۔

مینار کے عین نیچے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو مالک باورچیوں والا سفید لمبا ٹوپ پہنے ہمارے پاس آگیا۔ "کیا کھائیے گا؟"

"اس علاقے کا خصوصی کھانا کونسا ہے؟" میں نے پوچھا

"آپ گولاش کھائیے جینوآ والوں کی خاص ڈش ہے۔" اس نے جھک کر کہا۔

گوشت کے ٹکڑوں اور مختلف سبزیوں کا بنا ہوا گولاش خوب تھا۔ ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو غلطہ کا پورا علاقہ سنسان تھا۔ ڈھلوان گلیوں میں تیزی سے چلتے ہم واپس پل کے پاس پہنچ گئے جہاں باسفورس کا ساحل اب بالکل خاموش پڑا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ پُلِ غلطہ پر بھی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ برقی روشنیاں کم ہونے کی بنا پر چاند کی سنہری

کرنیں اور زیادہ نکھر آئی تھیں۔ میں نے پُل پر کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ "شاخِ زریں" کی جانب دیکھا۔ استنبول کے دو حصوں غلطہ اور اسلامبول کے درمیان ایک رُو پہلا قالین بچھا تھا۔ چاندنی میں نہائی۔ چمکتی دمکتی شاخِ زریں۔ کسی زمانے میں پانی کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا دنیا کی محفوظ ترین بندرگاہ تھی۔ اُن دنوں پُل غلطہ ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اِس کی جگہ پندرہ سو فٹ لمبی ایک آہنی زنجیر شہر کے دونوں حصوں کو آپس میں ملاتی تھی۔ عام حالات میں یہ زنجیر سطحِ آب سے چند فٹ اونچی رکھی جاتی تاکہ اجازت کے بغیر کوئی بھی جہاز بندرگاہ کے اندر داخل نہ ہو سکے جہاز عام طور پر باسفورس میں کھڑے ہو کر اپنے جھنڈوں کی نمائش کرتے۔ اگر یہ دوست مُلک کے ہوتے تو کنارے پر لگی وزنی چرخیوں کو گھمایا جاتا۔ زنجیر ڈھیلی ہو کر سمندر کی تہ میں بیٹھ جاتی اور جہاز آسانی سے بندرگاہ میں داخل ہو جاتا۔ جہاز کے گذر جانے پر زنجیر دوبارہ کس دی جاتی۔

ہم پُل کے دوسری جانب سیڑھیوں سے نیچے اتر کر تھکے قدموں ہوسٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔

افرلیسیا کا صوفیہ۔ کانسطنطائن کا آبی محل

دوسری صبح ہم نے ناشتہ ہوسٹل کے کیفے میں ہی کیا، دیوار کے ساتھ جہاں انگور کی بیلیں چمٹی ہوئی تھیں ہم کرسیوں پر بیٹھے تُرک کافی کے کڑوے گھونٹ نگلنے کی کوشش کر رہے تھے، میرے سامنے میز پر استنبول کا تفصیلی نقشہ پھیلا ہوا تھا۔

علی نے جیب سے تُرک سگریٹوں کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا: "تُرک تمباکو خوشبو اور مزے کے لحاظ سے دُنیا بھر میں بہترین ہے۔" اس نے لائیٹر سے میرا سگریٹ سلگاتے ہوئے بالکل اشتہاری انداز میں کہا اور پھر نقشے پر ایک نظر ڈال کر پُوچھا "ویسے آج پروگرام کیا ہے؟" میں نے قلم سے نقشے پر نشان لگاتے ہوئے کہا "آیا صوفیہ۔ سلطان احمد مسجد اور کانسطنطائن کا آبی محل۔"

ہم ہوسٹل سے باہر نکل کر آیا صوفیہ کی قدیم دیوار کے سائے میں چلتے ہوئے وہاں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر واقع "ہپڈ روم" یعنی "رُومی کھیلوں کے وسیع میدان" میں پہنچ گئے، اس میدان میں اس شہر کی عظمت کی ابتدا ہوئی تھی، ہمارے پہلو میں "آیا صوفیہ"

کانسطنطائن کا آبی محل   ہپڈ رُوم کا میدان




کی عمارت تھی، اس کی مخالف سمت میں سلطان احمد مسجد کا دالان نظر آ رہا تھا اور بیچ کے میدان میں پرانے قسطنطنیہ کی چند یادگاریں آسمان کی وسعتوں کو چھو رہی تھیں، ۳۲۴ء میں یہ شہر جو اس وقت بازنطائن کہلاتا تھا رومنوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور بعد میں اس کا نام رومی شہنشاہ کانسٹنطائن کے نام پر قسطنطنیہ رکھ دیا گیا "کانسطنطائن کا شہر" اگرچہ ان دنوں روم زوال پذیر تھا مگر رومی تہذیب میں اب بھی زندگی کی حرارت موجود تھی، کانسطنطائن نے نیزے کی انی سے شہر کی وسیع تر حدود کی نشاندہی کی اور کہا "یہ شہر روم کی جگہ لے گا، اس کی سات پہاڑیوں پر روم سے عظیم تر عمارتیں اور وسیع تر باغات کی تشکیل ہو گی۔" چنانچہ رومی سلطنت کے خزانے "نئے روم" کی تعمیر کے لیے کھل گئے سات پہاڑیوں پر سنگِ مرمر کے چار سو محلات تعمیر کیے گئے۔ "نئے روم" کے شہر نے تمام سلطنت کے تاجروں، کاریگروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، مستطیل شکل کے اس وسیع میدان کے دونوں طرف بلند و بالا مجسمے نصب کیے گئے۔ یہاں پر "پیرس کی ہیلن" تھی، اس کونے میں ابوالہول کے آٹھ دیو زاد بُت کھڑے تھے، اس طرف خسروانہ روم کا نشان مادہ بھیڑیا مجسمے کے روپ میں جلوہ گر تھی، اور پھر پیتل کے بنے ہوئے چار خوبصورت گھوڑے جو ستونوں پر نصب تھے اور جنہیں صلیبی جنگوں کے دوران اہلِ وینس اکھاڑ کر لے گئے، آج بھی وینس کے سینٹ مارک چوک میں یہ گھوڑے قسطنطنیہ کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

۱۱ مئی ۳۳۰ء کو لاکھوں باشندوں کی موجودگی میں شہنشاہ کانسطنطائن نے اس میدان میں جہاں اب ہم کھڑے تھے نئے روم کا افتتاح کیا اور اسے رومی سلطنت کا دارالخلافہ قرار دیا، نئے روم نے اس خوشی میں چالیس روز تک جشن منایا یہاں تک کہ شہر میں موجود شراب کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا، بحیرہ مرمر کے کنارے تعمیر کردہ شاہی محلات کا صدر دروازہ بھی اسی میدان کی جانب کھلتا تھا، وہاں اب احمد مسجد کی عمارت

کھڑی ہے، اُس دور کی یادگاروں میں اب صرف مینا اسوزیدہ اور سانپوں کا مینار ہی باقی رہ گئے ہیں، سانپوں کے مینار پر سُلطان فاتح کے گُرز کے نشانات ہمیں مُسلمانوں کی فتح قسطنطنیہ کی یاد دلاتے ہیں۔

میں اور علی پارک میں رکھے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ کر" آیا صوفیہ" کے کھُلنے کا انتظار کرنے لگے، ہمارے ساتھ ایک مُعمّر تُرک اخبار پڑھنے میں مشغول تھا، وہ کبھی کبھی اخبار سے نظر ہٹا کر ایک چھوٹی سی بچّی کی طرف بھی نگاہ ڈال لیتا جو ہاتھ میں غبارہ لیے احمد مسجد کے کبوتروں کے پیچھے بھاگ رہی تھی" صوفیہ کا دروازہ کتنے بجے کھُلتا ہے؟ میں نے تُرک سے پُوچھا

" مجھے معلوم نہیں" اس نے اخبار تہ کر کے اپنی گود میں رکھ لیا اور صوفیہ کے عظیم گنبد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا" میں نے کبھی اندر جانے کی کوشش ہی نہیں کی، معبد کو صرف خُدا کی پرستش کے لیے وقف ہونا چاہیئے، چاہے وہاں صلیب رہے یا ہلال، اب تو یہ ملبے کا ڈھیر ہے میوزیم بنا دینے سے اس کی رُوح ختم ہو گئی ہے" بوڑھے نے اخبار کھولا اور پڑھنے میں مگن ہو گیا، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد صوفیہ کا دروازہ کھُل گیا، ہم نے ایک سلیرے کا ٹکٹ خریدا، اور صدر دروازے سے اس عمارت میں داخل ہوئے جس کے استنبول کی طرح تین رُوپ تھے، ماضی بعید میں عیسائیوں کا مُقدّس ترین گرجا، ماضی میں مُسلمانوں کی مایۂ ناز مسجد اور حال میں اتاتُرک کا سرد اور بے جان میوزیم، عظیم ہال میں خنکی اور تاریکی تھی، میری نظریں تاریکی کی عادی ہوئیں تو لاتعداد بھاری ستونوں، ایک بلند اور ہیبت ناک گنبد اور وسیع خلا کا احساس ہوا۔

رعایا کی اکثریت چونکہ عیسائی مذہب اختیار کر چکی تھی اس لیے رُومی شہنشاہ، کانسٹنطائن نے بھی سراسر سیاسی مصلحتوں کے تحت یہ مذہب اپنا لیا اور پہلا عیسائی رُومی شہنشاہ کہلایا، نئے مذہب کی ترویج و اشاعت کے لیے اس نے سانتا صوفیہ کی بُنیاد رکھی،

اور تعمیر کے دوران خود ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا، تقریباً تین سو برس بعد شہر میں ہنگاموں کے دوران یہ کلیسا آگ لگنے سے مکمل طور پر تباہ ہوگیا، بادشاہ وقت جسٹینین نے اس کی عمارت کو وسیع تر بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کرنے کا حکم دیا، یونان سے سنگِ مرمر اور سنگِ سُرخ کے ذخیرے آئے، اناطولیہ کے پہاڑوں سے نیلا اور کالا پتھر منگوایا گیا، دیوتا زئیس اور دیوی ڈائنا کے معبدوں کو اُجاڑ کر اُن کے نوادرات اس نئے معبد کی سجاوٹ کے لیے استعمال کیے گئے، عظیم گنبد کا اندرونی حصّہ سونے کی پتریوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس طرح جھاڑ اور فانوسوں کی روشنی طلائی چھت سے منعکس ہو کر سنگِ مرمر کے چمکتے ہوئے فرش پر پڑتی تو ساری عمارت سنہری ہو جاتی۔ عمارت کے مکمل ہونے پر جسٹینین صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو عین اسی جگہ جہاں میں کھڑا تھا وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا اور بے اختیار ہاتھ فضا میں بلند کر کے پکار اٹھا "اے سلیمان، میرا معبد تیرے ہیکل سے بھی عظیم تر ہے۔"

کہتے ہیں کہ جسٹینین نے معماروں کو حکم دیا کہ معبد مکمل ہونے پر بڑے گنبد کے نیچے یہ حروف کھودے جائیں "جسٹینین نے یہ کلیسا خدا کی عظمت کے لیے بنوایا" لیکن جب شہنشاہ کی نظر گنبد پر پڑی تو وہاں اس عبارت کی بجائے "افریسیا نے یہ کلیسا خدا کی عظمت کے لیے بنوایا" تحریر تھا، جسٹینین نے غضب ناک ہو کر معماروں سے اس تبدیلیٔ نام کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ اگرچہ انہوں نے جسٹینین کا نام ہی کھودا تھا مگر آہستہ آہستہ یہ دُھندلا پڑتا گیا اور افریسیا کا نام اُبھرتا گیا۔

"یہاں کون ہے جو افریسیا نام کی عورت کو جانتا ہے؟" شہنشاہ نے درباریوں کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا، سب خاموش کھڑے رہے، آخر کار کلیسا کے ایک خاکروب نے بتایا کہ اس نام کی ایک اپاہج بڑھیا کلیسا کی دیوار کے ساتھ ایک ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں رہتی ہے۔

شہنشاہ کے حکم پر بڑھیا کو حاضر کیا گیا۔

"تمہارا نام افریسیا ہے؟" جستینین نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

"عظیم شہنشاہ، یہ میرا ہی نام ہے" بڑھیا نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

"تم گنبد پر کھدے ہوئے اپنے نام کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں بالکل کچھ نہیں جانتی سرکار" بڑھیا کی آواز کانپ رہی تھی

"ایک مرتبہ پھر گنبد کی طرف دیکھو جہاں میرے نام کی بجائے غیبی طور پر تمہارا نام لکھا گیا ہے۔ جواب دو کہ تمہارا اس معبد کی تعمیر میں کتنا حصہ ہے؟"

"یہ کچھ بھی تو نہیں حضور میں تو اپاہج ہوں" اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"بالکل کچھ نہیں" جستینین نے چیختے ہوئے کہا "تم یہاں پاس ہی رہتی ہو سوچو اور غور کرو کیا تم نے معبد کی تعمیر کے لیے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کا نتیجہ گنبد پر تمہارے نام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے؟"

"ایک چھوٹی سی بات ہے سرکار ... لیکن اتنی چھوٹی سی بات ...."

بڑھیا نے بے تحاشا کانپنا شروع کر دیا۔

"ڈرو نہیں" جستینین نے نرمی سے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں۔

"میرا جھونپڑا اس معبد کی دیوار کے پہلو میں ہے، میں اپاہج و لاچار اپنے بستر پر پڑی ہوتی تو میرے کانوں میں گھوڑوں اور بیلوں کے کراہنے کی آوازیں آتیں" بڑھیا نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "یونان سے اس معبد کے لیے سنگِ مرمر کی بھاری سلیں باسفورس کی بندرگاہ پر اتاری جاتیں تو ان کو گھوڑوں اور بیلوں کی پیٹھ پر لاد کر یہاں تک لایا جاتا، یہ جانور جب میرے گھر کے سامنے والی چڑھائی چڑھتے تو پتھر کے بوجھ سے ان کے پاؤں پھسلتے اور ان میں سے کئی وہیں گر جاتے اور دوسرے بری طرح ہانپنے لگتے، میرا دل ان بے چارے جانوروں کی حالتِ زار پر بہت ہی کڑھتا مگر میں کر بھی کیا سکتی تھی، ایک روز بارش کے بعد جب پھسلن ہوگئی تو میں رہ نہ سکی اور

اپنا بستر گھسیٹ کر باہر لے آئی اور اس کے گدّوں میں سے بھوسا نکال کر ڈھلوان سڑک پر بچھا دیا، اس طرح پھسلن ختم ہو گئی اب میں اپنے جھونپڑے کے فرش پر بستر کے بغیر پڑی رہتی، لیکن میرے کانوں میں جانوروں کے کراہنے اور ہانپنے کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔"

جسٹینین اپنے تخت سے اُٹھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔" اس بڑھیا کو میرے محل میں پہنچا دیا جائے" اس نے حکم دیا" اور اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا جائے" اور پھر گنبد کی عبارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" افریسیا کا نام اسی جگہ رہے گا اس معبد کی تعمیر میں اس کا حصّہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ ہمارا "یوسل ہوسٹل" بھی اسی معبد کی دیوار کے ساتھ ہے جہاں کبھی اپاہج افریسیا کا جھونپڑا ہوا کرتا تھا، آج بھی دودھ اور سبزی کے چھکڑے جب علی الصبح باسفورس سے آنے والی ڈھلوان سڑک پر سے گزرتے ہیں تو ان کے کھینچنے والے گھوڑوں اور خچروں کے ہانپنے کی آوازیں ہوسٹل کے کمروں تک آتی ہیں، مگر اب اس جگہ کوئی افریسیا نہیں رہتی،

میں نے گنبد کی طرف دیکھا وہاں نیم تاریکی میں مجھے افریسیا کا نام کہیں نظر نہ آیا۔

جسٹینین کے دور کے بعد صوفیہ کی عظمت لاطینی لٹیروں کے ہاتھوں ختم ہوئی، انہوں نے سونا چاندی اور قیمتی پتھر اکھاڑ لیے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ کی صلیب کی لکڑی بھی اُٹھا کر لے گئے۔

اس اُجڑی ہوئی حالت میں بھی صوفیہ ایک عظیم معبد ہے، اس کے بھاری بھر کم ستون اور گنبد اس کی عظمتِ رفتہ کے واضح نشان ہیں، خاص طور پر گنبد اس طرح تعمیر کیا گیا ہے جیسے ہوا میں معلق ہو، اُونچی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں میں سے مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ سلطنتِ روم کے تمام شاہوں کی رسم تاجپوشی اسی نیم تاریک عمارت میں ہوا کرتی تھی، ہم نے وہ دروازہ بھی دیکھا جہاں سے سلطان محمد فاتح نے اس کلیسا میں قدم رکھا

اور پھر "یو پتر مریم" کے گیتوں کی بجائے "اللہ اکبر" کی صدائیں اس کے درو دیوار سے ٹکرائیں، عمارت کے چاروں کونوں پر مینار تعمیر کیے گئے، نئے ستونوں اور محرابوں کا اضافہ ہوا۔ دیواروں سے حضرت عیسٰی اور رُومی بادشاہوں کی شبیہوں کو مٹا دیا گیا، مراد سوئم نے مسجد کے دالان میں وضو کے لیے تالاب بنوائے اور گنبد پر طلائی چاند نصب کیا جو دور دور سے نظر آتا تھا' عبادت گاہ کی تبدیلی سے عبادت گاہوں کی پاکیزگی اور تقدس میں کوئی فرق نہ آیا، تُرک سلطان محل سرا سے چلتے اور جُمعہ کی نماز یہاں آکر ادا کرتے' پھر اسے جانے کس مصلحت کے تحت اتاترک نے میوزیم قرار دے دیا۔ یا محمدؐ' یا ابُوبکرؓ، یا عمرؓ یا عثمانؓ اور یا علیؓ" کے طُغروں کے نیچے جہاں عقیدت اور جذبے کے چراغ جلتے تھے وہاں اب تاریکی اور اداسی ہے' بُوڑھے ترک نے سچ کہا تھا" معبد کو صرف خُدا کی پرستش کے لیے وقف ہونا چاہیئے چاہے وہاں صلیب رہے یا ہلال۔"

ہم صُوفیہ سے باہر نکلے تو دُھوپ کی چمک سے آنکھیں چُندھیا گئیں' ہم ہیوڈروم کا میدان پار کر کے احمد مسجد کی دیوار کے ساتھ ایک کیفے میں دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھ گئے، کیفے کے مالک کی فرمائش پر ہم نے ترکوں کی مرغوب غذا شہد میں پکی ہوئی بتویاں اور کالنیکا کا پیلا دہی کھایا، اب ہمارا ارادہ کانسطنطائن کا آبی محل دیکھنے کا تھا' میں نے جیب سے نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا اور دیکھنے لگا۔ نقشے کے مطابق یہ محل ہمارے عین سامنے مینار سوزیدہ کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا میں نے ساتھ والی میز پر بیٹھے ترک نوجوان سے محل کے بارے میں دریافت کیا' وہ اس وقت دو امریکی لڑکیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور انہیں باسفورس کے کنارے اپنے "یالی کاٹج" میں قیام کرنے کی دعوت دے رہا تھا' پہلی مرتبہ شاید وہ میری بات سُن نہ سکا چنانچہ میں نے گلا صاف کر کے ایک مرتبہ پھر کوشش کی،

"کانسطنطائن کا آبی محل ....؟"



"میناۓ سوزیدہ کے ساتھ بنی ہوئی جھونپڑی میں چلے جاؤ" اس نے لڑکیوں سے نظریں ہٹائے بغیر بڑی رُکھائی سے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

جھونپڑی کے دروازے کے ساتھ ٹکٹ کی کھڑکی تھی جس کے پیچھے نیلی وردی میں ملبوس ایک بوڑھا ترک اُونگھ رہا تھا، میں نے کھڑکی کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اس کی آنکھوں کے سامنے اُنگلیاں نچائیں "ہیلو۔ بھائی وہ کانسٹنٹائن کا۔۔۔"

"دو لیرے، دو لیرے" اس نے میری بات سُنے بغیر ہانک لگائی، ٹکٹ خرید کر ہم جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئے، دروازے کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں، ہم نیم تاریکی میں آہستہ آہستہ نیچے اُترے، ہمارے سامنے کانسٹنٹائن کا زیرِ زمین آبی محل کھڑا تھا، تین سو چھتیس مرمریں یونانی ستون جو کمر تک گہرے سبز پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، محل کی چھت سے پانی کی بوندیں رِس رِس کر ستونوں کے اس وسیع تالاب میں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں جیسے جل ترنگ بج رہا ہو، سیڑھیوں سے قریب چند ستونوں پر بجلی کے قمقمے ٹمٹما رہے تھے لیکن اس سے پرے مکمل تاریکی تھی، یوں لگتا تھا جیسے ایک پُراسرار جھیل میں سینکڑوں ستون اُگ آئے ہیں، میں خوبصورتی اور خاموشی کی اس بوچھاڑ کے لیے بالکل تیار نہ تھا، بچپن میں بچوں کا ایک ناول "پانی کے بچے" پڑھا تھا، "ایسی جگہوں پر رہتے ہوں گے وہ بھی" میں نے سوچا، نم آلود اور بوسیدہ سیڑھیاں اُتر کر میں پانی کی سطح تک چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر ستونوں کے پیچھے آبی محل کے تاریک کونوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا "شڑاپ!" ایک آواز آئی، میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

"شڑاپ! شڑاپ!" میں نے غور سے سبز پانی کی تہ میں دیکھا، مچھلیاں، بیشمار مچھلیاں، لیکن ایران کی زیرِ زمین کاریزوں میں پلنے والی سفید اندھی مچھلیاں نہیں بلکہ خوبصورت رنگ برنگی گول گول آنکھیں مٹکاتی مچھلیاں، میں انہیں

قریب سے دیکھنے کے لیے اور آگے جھک گیا۔ "آگے مت بڑھو" علی نے اُوپر سے سرگوشی کی "لکڑی کے تختے کمزور ہیں"

"کمزور ہیں، کمزور ہیں" ستونوں کے تالاب میں آواز گونجی۔ میں واپس آگیا۔ ہم باہر آئے تو ایک گائڈ سیاحوں کی ایک ٹولی لیے نیچے جارہا تھا۔

"اور اب ہم کانسٹانٹن کے اُس آبی جزیرے کی طرف جارہے ہیں جہاں جیمز بانڈ کی فلم "فرام رشیا وِد لَو" کی شوٹنگ ہوئی تھی۔"

اندھی بُڑھیا اور کبوتر

استنبول کو بجا طور پر مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے، ساڑھے پانچسو سے زائد خوبصورت مسجدوں کا شہر، اگرچہ سُلطان فاتح کے زمانے سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آغاز تک ہر تُرک سلطان اور وزیر اعظم نے خوبصورتی اور پاکیزگی کے ان معبدوں کی تعمیر میں حصّہ لیا لیکن آج کا خُوش نظر استنبول بڑی حد تک سلیمان عظیم الشان کے معمار سنان کی کاوشوں سے وجود میں آیا، سنان سُلطان کے "جانثاروں" کی فوج میں شامل تھا اور اسی دوران اُسے مصر اور ایران جاکر وہاں کے فن کی تعمیر کے بارے میں جاننے کا اتفاق ہوا، وہاں سے واپسی پر سُلطان کے حکم سے اس نے مسجد سلیمانیہ کا نقشہ تیار کیا اور استنبول کی تیسری پہاڑی پر اس کی بُنیاد رکھی، سات سال تک ہزاروں مزدور اور معمار مسجد کی تعمیر میں مصروف رہے، مسجد کی ملحقہ عمارتوں میں ایک مدرسہ، شفا خانہ، سرائے اور بازار بھی شامل تھے،

تعمیر مکمل ہونے پر سنان نے سلیمان سے کہا کہ اے سلطان میں نے تیرے لیے ایسی مسجد بنائی ہے جو قیامت تک رُوئے زمین پر قائم رہے گی۔ فن تعمیر کے نقادوں کی رائے میں سلیمان کی مسجد سُلیمانیہ جسٹینین کے سانتا صوفیہ سے بھی بڑھ کر ہے اور اس رُو سے ہیکل سُلیمانی کی ہمّ مقابل بھی، سنان نے اپنی زندگی میں تین سو کے لگ بھگ عمارات کے نقشے تیار کیے اور ان کی تعمیر کروائی، ان میں مسجدوں کے علاوہ پُل، فوّارے مدرسے اور کارواں سرائیں بھی شامل تھیں۔

سلیمانیہ کے پہلُو بہ پہلُو سلطان فاتح، سلطان احمد، بایزید، رُستم پاشا اور سلطان سلیم کی مساجد بھی ترک فن تعمیر کے نادر شاہکار ہیں، ان میں سے ہر ایک کی تاریخ اور طرزِ تعمیر پر کئی باب لکھے جا سکتے ہیں، طوالت سے بچنے کے لیے میں یہاں صرف سلطان احمد مسجد کا ہی ذکر کروں گا۔

مسجد کے وسیع دالان میں داخل ہوتے ہی سامنے پانی کے نل نظر آتے ہیں جہاں عورتیں اور مرد نماز سے قبل وُضو کرتے ہیں، صدر دروازے پر چمڑے کا ایک دبیز پردہ لٹک رہا ہے جو مسجد کے اندرونی حصّے کو باہر کی تیز دُھوپ اور روشنی سے محفوظ رکھتا ہے، میں نے اپنے جوتے اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے اور پردہ اُٹھا کر اندر چلا گیا، مسجد کے اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان ہونے کا احساس ہوتا ہے، اس کی وجہ مسجد کے در و دیوار پر لگی ہوئی دیدہ زیب نیلی اینٹیں ہیں جن کی نسبت سے اسے "نیلی مسجد" بھی کہتے ہیں، پورا فرش خوش رنگ دبیز قالینوں سے ڈھکا ہوا ہے، کچھ لوگ نماز پڑھ رہے تھے اور چند قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے، زیادہ تعداد سیاحوں کی تھی جو محراب کی خوبصورتی اور نیلی اینٹوں کے نقش و نگار میں کھوئے ہوئے تھے۔

اس مسجد کا نقشہ سُلطان احمد کی خواہش پر معمار داؤد نے تیار کیا اور سانتا صوفیہ

کے بالمقابل جہاں کسی زمانے میں رُومی محلات تھے اس کی تعمیر شروع کر دی، مسجد میں فنِ تعمیر کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں، مثلاً اتنا بڑا گنبد صرف چار ستونوں کے سہارے کھڑا ہے اس طرح نماز کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بھی نکل آئی ہے، یہ مسجد اس لحاظ سے باقی تمام مسجدوں سے ممتاز ہے کہ اس کے چھ مینار ہیں جو مرکزی عمارت کے چار اور دالان کے دو کونوں پر واقع ہیں، چند علما نے احتجاج کیا کہ چونکہ مسجدِ حرام کے چھ مینار ہیں اس لیے کسی دوسری مسجد کے اتنے مینار تعمیر کرنا جائز نہیں، چنانچہ سلطان نے مسجدِ حرام کے میناروں میں ایک کا اضافہ کر کے انہیں سات کر دیا۔

میں مسجد سے باہر نکلا تو آیا صوفیہ کے پہلو میں جاتی ہوئی سڑک پر سیاحوں کا ہجوم تھا "محل سرا میں واقعی مشہورِ زمانہ عجائب گھر" ٹوپ کاپی" کے دروازے کھل گئے ہوں گے" میں نے سوچا مگر میں آج عجائب گھر یا محلات دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے استنبول کی ایک اور خوبصورت مسجد بایزید دیکھنے کا فیصلہ کیا، راستے میں" بازار" بھی پڑتا تھا چنانچہ کچھ عرصہ وہاں بھی گھومتا رہا، یہ ڈھکے ہوئے بازار مشرقِ وسطیٰ کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں میں پائے جاتے ہیں (اگرچہ استنبول یورپ میں ہے لیکن مزاج سراسر مشرقی ہے) اور ان میں دُنیا جہان کی چیزیں بکتی ہیں، تانبے کے برتن، زیورات، ملبوسات اور رنگی دست کاریاں، استنبول کے بازار میں آپ کو سوئڈ اور چمڑے کے کوٹ دُنیا بھر میں ارزاں ترین ملتے ہیں، اس کے علاوہ مرسان پتھر کے بنے ہوئے پائپ جو چند روز کی تمباکو نوشی کے بعد سفید سے چمکیلے بھورے رنگ میں بدل جاتے ہیں۔

تُرک لوگ جانوروں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا گاڑی کا کوچوان اپنے پاس چابک رکھنا بھی گناہ کبیرا سمجھتا ہے، اسی طرح استنبول کی تمام مساجد کے باہر آپ کو کبوتروں کے غول کے غول ملیں گے، چھوٹے بچے اور بوڑھی عورتیں کبوتروں



کا دانا بیچ رہے ہوتے ہیں، پچیس کروز کی قیمت میں دال کی ایک پڑیا خرید لیجیے کبوتروں کو دانا ڈال لیے اور ایک ترک روایت کے مطابق آپ کے بچھڑے ہوئے دوست مل جائیں گے، بایزید مسجد کے لاتعداد کبوتر آپ کو اس بوڑھی بیوہ کی یاد دلاتے ہیں جس کا کُل سرمایہ کبوتروں کا ایک جوڑا تھا جو اس نے مسجد کے افتتاح کی تقریب پر سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا، میں شام ڈھلے اسی مسجد کے دالان میں داخل ہوا تو صحن کے بیچ کالے کبوتروں کے ایک ڈھیر میں سے آواز آئی "کبوتروں کو دانا کھلایئے اور ثواب کمایئے"۔ میں نے دھندلکے میں سے غور سے دیکھا تو موٹے اور بھدے کبوتروں کے درمیان ایک بڑھیا بیٹھی دانا بیچ رہی تھی، اس کے سامنے دال کی ایک پوٹلی رکھی تھی جسے کبوتر چونچیں مار مار کر کھولنے کی کوشش کر رہے تھے، کالے اور سرمئی کبوتر اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور سوائے بڑھیا کے سفید بالوں کے اس کا سارا جسم اس غول میں ڈھکا ہوا تھا، پانچ چھ کبوتر بڑے مزے سے اس کے کبڑے کندھوں پر سوار تھے، کبھی کبھار کوئی کبوتر اس کے سر پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ زور زور سے سر ہلانے لگتی، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جسے وہ بار بار اپنے گرد گھماتی تا کہ کبوتر اس کا پیچھا چھوڑ دیں مگر وہ بڑی ڈھٹائی سے اس کے جسم اور دانے کی پوٹلی پر بیٹھے رہتے، میں نے جیب میں سے پچیس کروز نکالے اور بڑھیا کی طرف بڑھا دیئے، لیکن وہ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دھیان دیئے بغیر وہی صدا لگاتی رہی "کبوتروں کو دانا کھلایئے اور ثواب کمایئے"۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ بڑھیا دیکھ نہیں سکتی۔ وہ اندھی تھی، میں نے پچیس کروز اس کے سامنے پھینک دیئے اور جیب سے دس لیرے کا نوٹ نکال کر بڑھیا کا کمزور ہاتھ پکڑا اور اس کی ہتھیلی میں رکھ دیا۔ "میں ساری پوٹلی خرید دوں گا"۔ اس نے نوٹ لے کر بے یقینی سے فضا میں گھورا کبوتروں کو ہٹا کر پوٹلی میرے آگے کھسکا دی اور پھر اپنی چھڑی ادھر

اُدھر گھمانے لگی، میں نے پوچھا "مائی اب تم گھر کیوں نہیں جاتیں؟" "گھر؟" اس نے چھڑی اپنے سر پر گھماتے ہوئے حیرت سے پوچھا "میں تو یہیں رہتی ہوں، ان کبوتروں کے پاس" میں نے جھک کر دانے کی پوٹلی اُٹھائی اور اس کی جھولی میں ڈال کر مسجد دیکھے بغیر باہر آگیا۔

اور فصیل ٹوٹ گئی

ہماری بس ایدرنیوپل دروازے سے گزر کر بائیں ہاتھ مُڑ گئی، اب ہم قدیم استنبول کی حدود سے باہر آ چکے تھے، بس شہر کی پُرانی فصیل کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی، کسی زمانے میں شہر کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے یہاں تین فصیلیں ہوا کرتی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ ایک بیس گز چوڑی کھائی جو پانی اور کیچڑ سے پُر ہوتی تھی، ہر سو فٹ کے فاصلے پر حفاظتی مینار ایستادہ تھے جہاں دشمن پر آگ اور پتھر برسانے کی مشینیں نصب تھیں، پُرانی فصیل کے کچھ حصّے ابھی تک کھڑے ہیں مگر زیادہ حصّہ کھنڈر بن چکا ہے اور اہلِ شہر اسے ملبے کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں، حفاظتی کھائی اب کھیتی باڑی کے کام آتی ہے،

آج صبح حسبِ معمول جب ناشتے کے بعد میں کیفے کے صحن میں بیٹھا استنبول کا نقشہ دیکھ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے سُلطانوں کی مسجدیں اور شہنشاہوں کے کلیسا تو دیکھ ڈالے مگر استنبول کے پہلے شہید اور نبی اکرمؐ کے پیارے صحابی حضرت ایوبؓ انصاری کا مرقد بھی تو دیکھوں، یہ بس مجھے "آیوپ" یعنی ایوب مسجد کی طرف ہی لیے جا رہی تھی، ہم ابھی تک فصیل کے کھنڈروں کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے، پندرہ سو برس تک یہ توانا فصیلیں



ناقابلِ تسخیر کھڑی رہیں اور بالآخر سلطان محمد نے ان کا غرور خاک میں ملا دیا، مسلمانوں نے قسطنطنیہ ایک ہی حملے میں فتح نہیں کر لیا تھا بلکہ اس کے لیے انہیں سینکڑوں برس کی پیہم جدوجہد کرنی پڑی۔

سب سے پہلی مہم امیر معاویہ کے عہد میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی قیادت میں بھیجی گئی، محاصرے کے دوران سیف اللہ کا بیٹا وفات پا گیا اور ابوسفیان کو قائد چن لیا گیا، اس لشکر میں یزید بن معاویہؓ کے علاوہ حضرت ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے، محاصرہ چھ برس تک جاری رہا، اس دوران حضرت ایوب انصاریؓ بھی رحلت فرما گئے اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں استنبول کی فصیل کے پہلو میں دفن کیا گیا، اس بہادر سپاہی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے رومی جرنیل بھی جنازے میں شریک ہوئے، مسلمانوں کو چونکہ رومیوں کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا اس لیے یہ محاصرہ ناکام رہا۔

اس کے بعد خلیفہ سلیمان کے عہد میں مسالمہ کی قیادت میں ایک مرتبہ پھر شہر کا محاصرہ کیا گیا مگر اس بار بھی بری اور خاص طور پر بحری حملے ناکام رہے، مسلمانوں کے دونوں محاصروں کی ناکامی میں رومیوں کے مہلک ہتھیار "یونانی آگ" کا ہاتھ تھا جو ایک عیسائی کی ایجاد کردہ تھی یہ ایک خاص قسم کا تیل تھا جو ہوا لگتے ہی شعلوں میں بھڑک اٹھتا اور پانی کے اتصال سے یہ آگ اور تیز ہو جاتی، مسلمان بحریہ کے لیے یہ آگ تباہ کن ثابت ہوئی۔

جس وقت وحشی منگول ایشیا پر حملہ آور ہو رہے تھے تو اس سے بچنے کے لیے ایک جفاکش اور جری قبیلے نے دریائے فرات پار کیا اور وسط ایشیا کے سب سے بڑے شہر بروسا کو فتح کر کے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی، یہ عثمان ترک تھے، روایت ہے کہ سردار عثمان نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک تن آور درخت کے سائے میں پہاڑوں کے وسیع سلسلے ہیں، درخت کے تنے سے چار دریا دجلہ، فرات، ڈینیوب اور نیل ابل رہے ہیں، ان پہاڑوں اور دریاؤں پر مؤذن کی آواز گونج رہی ہے، فتح و کامرانی کی ان

نشانیوں میں سب سے عجیب بات یہ تھی کہ درخت کے تمام پتے قسطنطنیہ کی جانب جھکے ہوئے تھے اس شہر کی فتح عثمان ترکوں کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

ترکوں کے لیے صرف ایشیا ہی کافی نہ تھا انہوں نے بلقان کا تمام علاقہ بھی فتح کر لیا اور ادرین کو یورپی سلطنت کا دارالخلافہ قرار دیا، آہستہ آہستہ قسطنطنیہ کے گرد عثمان ترکوں کا گھیرا تنگ ہوتا گیا، ہر نئی فتح کے بعد شہر کے باشندوں کو ترکوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں نزدیک تر سنائی دینی شروع ہو گئیں، ۱۴۰۲ء میں یہ آواز شہر کی فصیلوں تک پہنچ گئی اور رومیوں کو یقین ہو گیا کہ قسطنطنیہ کی فتح کا سہرا سلطان بایزید کے سر ہی بندھے گا، لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا، امیر تیمور وسط ایشیائی سلطنتوں کو روندتا عثمان ترکوں کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، بایزید نے فوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور اپنی سلطنت بچانے کے لیے افواج کا رخ انگورہ کی طرف موڑ دیا، اس بہادر ترک کو میدان میں شکست ہوئی اور تیمور اُسے ایک آہنی پنجرے میں قید کر کے سمرقند لے گیا۔

ترک اس شکست سے بددل نہ ہوئے اور سلطان محمد اول نے چالیس برس کے قلیل عرصے میں فوج کی تنظیم نو کے بعد بیشتر علاقے دوبارہ فتح کر لیے، محمد اول کا پوتا سلطان محمد دوم اکیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا، سلطنت کا انتظام سنبھالتے ہی سلطان محمد نے اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے قسطنطنیہ کی فتح کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ باسفورس کے تنگ درّے کے ایشیائی کنارے پر سلطان محمد اول کا تعمیر کردہ قلعہ موجود تھا اب اس کے سامنے یورپی کنارے پر سلطان کی نگرانی میں "رومیلی حصار" تعمیر کیا گیا، اس طرح باسفورس کے دونوں کنارے ترکوں کے قبضے میں آ گئے اور یوں سمندر کے اس حصے میں غیر ملکی جہاز سلطان کو ٹیکس دے کر ہی گزر پاتے، یہ درّہ قسطنطنیہ کی شاہ رگ تھا کیونکہ تمام سامانِ رسد اسی راستے سے شہر کو جاتا تھا۔

دونوں طرفین اب پوری فوجی تیاریاں ہو رہی تھیں، تمام موسم سرما سلطان اپنے

انجینئروں اور سپہ سالاروں کی مدد سے شہر کے محاصرے کی منصوبہ بندی کرتا رہا، سرنگیں کہاں بچھائی جائیں؟ توپیں کس جگہ نصب ہوں؟ فصیل کا کونسا حصّہ کمزور ہے؟ اس دوران ادرنا میں ایک نیا اسلحہ خانہ کھولا گیا جہاں تین ماہ کے عرصے میں اربن نامی ایک انجینئر کے زیرِ نگرانی ایک ایسی توپ تیار کی گئی جو ساڑھے سات من کا گولہ پھینک سکتی تھی۔ اس توپ کو سات سو مزدوروں اور ایک سو بیلوں کی مدد سے گھسیٹ کر قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے لے جایا گیا۔

۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ کا یادگار اور آخری محاصرہ شروع ہوا۔ سلطان محمد بارہ ہزار جاں نثاروں، بیس ہزار گھڑ سواروں اور ایک لاکھ پیدل فوج کی معیت میں آگے بڑھا اور شہر کے سینٹ رومانس دروازے کے سامنے ترک عَلَم گاڑ دیا۔ ترک فوج کے خیمے شہر کے مغربی حصّے کے علاوہ شاخِ زرّیں کے شمال سے لے کر بحیرۂ مرمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ باسفورس کی جانب سلطان کی بحریہ تیار کھڑی تھی۔ محاصرے کو کئی روز گزر گئے مگر شہر کی فصیلیں نہ ٹوٹ سکیں۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ حملہ خشکی اور سمندر سے ایک ساتھ ہونا چاہیئے مگر مصیبت یہ تھی کہ بحریہ کے راستے میں بندرگاہ کے دہانے پر کسی ہوئی آہنی زنجیر تھی اور دوسری طرف خشکی تھی۔ جب تک جہازوں کو بندرگاہ میں پہنچانے کی صورت نہ نکلے محاصرہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطان نے اس ناممکن صورتِ حال کا ایک ایسا بیباکانہ اور انوکھا حل سوچا جس کی مثال آج تک بحری تاریخ میں نہیں ملتی۔ باسفورس اور بندرگاہ کے درمیان دس میل کا خشک علاقہ تھا جو الغلطہ کہلاتا ہے۔ راتوں رات لکڑی کے تختے بچھا کر بندرگاہ تک ایک راستہ بنا لیا گیا اور پھر بےشمار جانور ذبح کر کے ان کی چربی اِن تختوں پر مَل دی گئی۔ جہازوں کے تلے چرخیاں اور پہیے لگا کر انہیں سینکڑوں سپاہ اور جانوروں کی مدد سے گھسیٹ کر لکڑی کے اس چکنے راستے پر لا کھڑا کیا۔ رات کے پچھلے پہر جب سمندر سے تیز ہوا آئی تو بادبان کھول دیئے گئے اور

کچھ باد بانوں میں ہوا بھر جانے کی وجہ سے اور کچھ سپاہیوں اور جانوروں کے دھکیلنے سے یہ جہاز آہستہ آہستہ خشکی پر پھسلتے ہوئے خاموشی سے بندرگاہ میں اُتر گئے صبح کی پہلی روشنی میں رُومیوں نے جو کچھ دیکھا وہ ایک معجزے سے کم نہ تھا، حفاظتی زنجیر جوں کی توں تھی اور تُرکوں کے اسی جہازوں کے پھریرے ان کی بندرگاہ میں لہرا رہے تھے۔

شکست رُومیوں کا مقدّر بن چکی تھی، سُلطان نے اپنی بھرپور کوشش کی کہ رُومی ہتھیار ڈال دیں اور جان و مال کا زیاں نہ ہو مگر عیسائی ابھی تک کسی ایسے معجزے کے انتظار میں تھے جو انہیں "کافروں" سے بچائے گا، سانتا صوفیہ میں دن رات دُعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

۲۸ مئی کو سلطان نے اپنے آخری احکام جاری کر دیئے، بارہ گھڑسواروں نے ناقوس بجا کر پُوری فوج کو آگاہ کیا "شہر اور اس کی عمارتیں میری ہیں" سلطان نے فوج سے مخاطب ہو کر کہا "لیکن سونے اور چاندی کے خزانے تمہاری بہادری کا انعام ہوں گے میری سلطنت ایشیا اور یورپ میں پھیلی ہوئی ہے اور کل صبح قسطنطنیہ کی فصیل پر سب سے پہلے پہنچنے والا نوجوان میری اس سلطنت کے سب سے خوبصورت صُوبے کا حقدار ہوگا۔"

شب کی تاریکی میں گولہ بارُود، توپیں اور دوسرا سامانِ حرب اس کھائی کے کنارے اکٹھا کر دیا گیا جس کی دوسری طرف شہر کی فصیل کھڑی تھی۔

۲۹ مئی کو سورج نکلنے سے پہلے صبح کے دو بجے خشکی اور سمندر پر لاکھوں تُرکوں کے نعرۂ تکبیر کی صدا گُونجی اور فصیل پر یلغار شروع ہو گئی، سُلطان سب سے اگلی صفوں میں دس ہزار جانثاروں کے درمیان گرز ہاتھ میں لیے جوانوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہا تھا، بندرگاہ کی طرف سے بحریہ گولے برسا رہی تھی، ساری فضا میں بارُود اور خون کی مہک رچی تھی، اس نازک لمحے میں "جانثار" آگے بڑھے جو تُرک فوج کے بہترین دستوں پر مشتمل نوجوان تھے، طاقتور اور ناقابلِ شکست، سُلطان کے انعام کا پہلا حقدار حسن تھا دراز قد، تنومند اور نڈر حسن، ایک ہاتھ میں تلوار سونتے دوسرے میں ڈھال تھامے اپنے

تین ساتھیوں سمیت وہ بڑی بے خوفی سے فصیل پر چڑھنے لگا، اس کے ساتھی شہید ہوگئے مگر وہ بے خطر آگے بڑھتا رہا، ایک لمحے کے لیے اس کا قد آور جسم قسطنطنیہ کی ناقابلِ تسخیر فصیل کی بلندی پر دکھائی دیا اور پھر ساتھ ہی تیروں کی ایک بوچھاڑ اس کے سینہ ریشمی لبادے کو خون سے تر کر گئی، اس نے ایک گھٹنا ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی تو درجنوں برچھے اس کے خوبصورت جسم میں پیوست ہوگئے، حسن نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور ترک اس کی بے مثال شجاعت کی پیروی کرتے ہوئے دشمن پر پل پڑے، رومیوں کے قدم اکھڑنے شروع ہوگئے، ایک نیزا کانسٹنٹائن کے جسم میں پیوست ہوگیا اور وہ زخمی ہو کر اپنے سپاہیوں کی لاشوں کے ڈھیر تلے دب گیا، شہنشاہ کے مرتے ہی رومیوں کی مدافعت ختم ہوگئی، اِدھر فاتح فوج فصیل کے شگافوں میں سے شہر میں داخل ہوئی اور اُدھر بحریہ کے جوان فصیل توڑ کر ان سے آملے، ترپن دنوں کے محاصرے کے بعد قسطنطنیہ نے سلطان محمدؒ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے ساتھ ہی سلطنتِ روم کا گہنایا ہوا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا آج سے سلطان محمدؒ "فاتح" کے نام سے پکارا جانے لگا اور قسطنطنیہ استنبول کے نام سے، اسی شام سلطان محمدؒ فاتح سینٹ رومانس دروازے سے شہر میں داخل ہوا، اس کے پہلو میں وزراء، سپہ سالار اور جانثاروں کے دستے تھے، ان جانثاروں میں سے ہر ایک بقول ایک تاریخ دان کے ہرکولیس کی جسامت، اور اپالو کے خوبصورت جسم کا مالک تھا، فاتح نے شہر کی عجوبۂ روزگار عمارتوں پر ایک نظر ڈالی جو اب اُس کی ملکیت تھیں، ہپوڈروم کے میدان میں اس کی نگاہ سانپوں کے مینار پر پڑی اور اس نے طاقت آزمائی کے طور پر گرز مار کر اُس کا ایک حصہ منہدم کر دیا، سانتا صوفیہ کے دروازے کے باہر سلطان اپنے گھوڑے سے اُترا اور عیسائیت کے اس عظیم معبد میں داخل ہوا، کہتے ہیں کہ ایک ترک سپاہی کلیسا کا قیمتی سنگِ مرمر اُدھیڑنے میں مشغول تھا سلطان نے تلوار کے ایک ہی وار سے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا، اُس کے حکم سے سانتا صوفیہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا، ایک سپاہی نے

سب سے بلند گنبد پر کھڑے ہو کر اذان دی اور سلطان نے اس جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا کی جہاں رُومی شہنشاہوں کی رسم تاجپوشی ہوا کرتی تھی، مسجد صوفیہ سے سلطان شاہی محلات میں گیا جو اب ویران ہو چکے تھے۔ "شاہی محلوں میں مکڑی اپنا جالا بُن چکی ہے اور افراسیاب کے میناروں پر اُلّو پہرہ دے رہا ہے" سلطان نے اُجڑے ہوئے محلات کو دیکھ کر کہا۔

کانسطنطائن کی مسخ شدہ لاش جب لاشوں کے ڈھیر سے برآمد ہوئی تو اُسے اُس کے جُوتوں پر کندہ شاہین کے شاہانہ نشان دیکھ کر شناخت کیا گیا، فاتح نے اپنے حریف کو پورے شاہانہ احترام سے دفن کیا۔

فتح کے تیسرے روز سلطان نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ایوب انصاریؓ شہر کی فصیل کے ساتھ بندرگاہ کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے اپنے مدفن کا پتہ بتا رہے ہیں۔ اُن کی وفات کے سات سو اسّی برس بعد سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے پہلے شہید کا شاندار مقبرہ بنوایا اور اس کے پہلو میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی، میں اب حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کی جالی کے سامنے کھڑا تھا، جنہوں نے جوانی میں بدر اور اُحد میں دادِ شجاعت دیکر اسلام کے پودے کی آبیاری کی اور بڑھاپے میں قرآن سینے سے لگائے مدینے سے ہزاروں میل دُور اللہ کی راہ میں کام آئے، وہ اسلام کی خاطر پیہم جدوجہد پر یقین رکھتے تھے اور کون جانے یہ حضرت ایوبؓ کی بے قرار رُوح تھی جو ہر دَور میں مسلمانوں کو کشاں کشاں کھینچ کر اس شہر تک لاتی رہی، مزار کے گرد بیشمار عقیدت مند دعا میں مصروف تھے، میں نے فاتحہ پڑھی اور پھر مسجد کے اندر چلا گیا جہاں لوگ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، "اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں کام آئے ان کو مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے اپنے اللہ کے پاس"

حضرت ایوب انصاریؓ کے لیے ترک سلطانوں کی عقیدت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان سب کی رسم تاجپوشی ہمیشہ ایوب مسجد میں ہوا کرتی تھی اور ان کی تدفین مسجد کے پہلو میں واقع قبرستان میں، میں مسجد سے نکل کر جب اس قبرستان میں پہنچا تو سورج غروب

ہو رہا تھا اور پتھر کے کتبوں کے سامنے بلے ہو کر سڑک تک   آ رہے تھے، قبرستان کے ساتھ بلندی کی طرف ایک راستہ جاتا ہے جس کے آخر میں ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ "پیئر لوتی" کے نام سے مشہور ہے، مصنّف سیاح "پیئر لوتی" جس نے استنبول کے حسن میں ڈوب کر "آتے زادے" جیسی رومانوی تخلیق کی یہاں آیا کرتا تھا۔ سورج غروب ہونے پر شفق کی سرخی ہر سو پھیلی تو شاخ زرّیں بھی شاخِ سرخ میں بدل گئی، دُور اُفق پر آیا صوفیہ مسجد سلیمانیہ اور مسجد سلیم کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔

شہزادوں کے جزیرے

اگرچہ ہمیں استنبول آئے ہوئے کافی دن گزر چکے تھے مگر میرے لیے اس خوبصورت شہر سے جدائی کا تصور بعید دشوار ثابت ہو رہا تھا، علی صرف میرے اصرار پر اتنے روز ٹھہرا رہا ورنہ اُسے یہاں پر سوائے تُرک تمباکو اور جادۂ استقلال کے اور کچھ پسند نہ آیا تھا اور اب وہ ہر صورت یہاں سے جانے پر تُلا ہوا تھا، میں نے بھی مستقبل کی طویل سیاحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے روانگی کا فیصلہ کر لیا چنانچہ ہم یورپ کے لیے ٹکٹ خریدنے کے ارادے سے باسفورس کے کنارے واقع ریلوے سٹیشن پر چلے گئے، دفترِ معلومات میں اُجلے سفید بالوں والی ایک چاک و چوبند دادی اماں براجمان تھی جن کی شکل جاسوسی ناول لکھنے والی مصنفہ اگاتھا کرسٹی سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔

"بیٹو تم کہاں جاؤ گے؟" اُنہوں نے نہایت شفقت سے دریافت کیا۔

"میں تو ولایت جاؤں گا" علی نے خوش ہو کر کہا "اور میرا ارادہ اطالیہ تک جانے کا ہے" میں نے جواب دیا۔

"لنڈن کے لیے ڈائریکٹ اورنیٹ مرمرا ایکسپریس ہر شام ساڑھے سات بجے چلتی ہے ٹکٹ گھر سے پیشگی بکنگ کروا لیجئے۔"

سٹیشن کے بینک سے کرنسی تبدیل کروا کر ہم نے دُوسری شام کے لیے دو نشستیں ریزرو کروالیں لنڈن پانچسو چھیانوے لیرے اور وینس اطالیہ تین سو لیرے۔ "برائے مہربانی سفر سے پہلے بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور اطالیہ کے ویزے ضرور حاصل کر لیجیے" بکنگ کلرک نے ہمیں تاکید کی، مجھے چونکہ بعد میں سوئٹزرلینڈ بھی جانا تھا اس لیے سب سے پہلے ہم "پی آئی اے" کے دفتر سے مُتصل سوِس قونصل میں گئے، سُنہری بالوں والی خوش مزاج ریسپشنسٹ لڑکی نے پہلے ہمیں چائے پلوائی اور پھر پانچ منٹ میں ویزا تیار کر لیا، اطالوی قونصل نے فارم کیساتھ تین تصاویر کی بھی فرمائش کی چنانچہ استقلال کے ایک فٹ پاتھ سٹوڈیو سے تصویر کھچوا کر بھاگم بھاگ واپس پہنچے اور دو گھنٹے بعد ویزا مل گیا، یوگوسلاویہ والوں نے فارم پُر کروانے کا تردّد کیے بغیر مفت میں ویزے کا ٹھپّہ لگا دیا، بلغاریہ کے قونصل کے سامنے ویزا حاصل کرنے والوں کی ایک لمبی قطار تھی،

"پاسپورٹ، ویزا فارم اور دس لیرے جمع کرا دیں، اُمید ہے پرسوں تک ویزا تیار ہو جائے گا"

"لیکن ہم تو کل شام کی گاڑی پر جا رہے ہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"مجبوری ہے، دراصل بیشمار ترک مزدور چھٹیاں گزار کر واپس جرمنی جا رہے ہیں اس لیے کام کی زیادتی ہے، ہاں البتہ ایکسپریس ویزا ابھی مل سکتا ہے۔ دس لیرے زائد لگیں گے۔"

شام تک انتظار کے بعد ہمیں ایکسپریس ویزا فوراً مل گیا۔

آج استنبول میں ہمارا آخری دن تھا، دس بجے تک ہم نے اپنے سامان کی پیکنگ مکمل کر لی، گاڑی چونکہ شام ساڑھے سات بجے چلتی تھی اس لیے ہم نے سوچا کہ لگے ہاتھوں ہوسٹل سے متصل ترک سُلطانوں کا محل سرا بھی دیکھ لیا جائے جو ٹوپ کاپی اور سرا غلو کے نام سے بھی مشہور ہے، بازنطینیوں کے عہد میں یہاں گھنا جنگل تھا جسے سلطان فاتح نے ایک خوبصورت

باغ میں بدل دیا اور پھلدار درختوں اور پھولوں کے تختوں کے درمیان فوارے اور بارہ دریاں تعمیر کروائیں، محلات اور حرم سرا کا اضافہ بعد میں ہوا، ہم جب باب ہمایوں سے اندر داخل ہوئے تو سخت مایوسی ہوئی چند غیر مؤثر عمارتوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا، یہ مُراد سوئم کی خواب گاہ ہے، اس کمرے میں وی آنلسے مصر تک پھیلی ہوئی سلطنت کے فرمان جاری ہوتے تھے، یہ لائبریری تھی، یہاں شاہی باورچی خانہ تھا وغیرہ وغیرہ، اس کے علاوہ مختلف کمروں میں چھوٹے چھوٹے عجائب گھر تھے جہاں سونے چاندی اور جواہرات کی بہتات دیکھ کر کوفت ہوتی شروع ہوگئی، ٹوپ کاپی کا مشہور ہیرا بھی دیکھا جسے اُڑانے کی خاطر عالمی شہرت یافتہ چور حضرات موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں، ظاہر ہے اُن کو اس کے حجم کے بارے میں غلط اطلاعات ملی ہیں، مُرغی کے انڈے جتنا بھی نہیں۔

" یہ سلطان سلیمان کی طلائی تلوار ہے جس پر ایک ہزار سے زائد ہیرے جڑے ہیں"
گائڈ چند سیاحوں کو بتا رہا تھا۔

" اس سے سلطان صاحب بادام ہی توڑتے ہوں گے" علی نے اُکتا کر کہا " آدمی تو مر سے رہا" میں علی کو وہیں چھوڑ کر چینی ظروف کا کمرہ دیکھنے چلا گیا، وہاں سے واپسی پر جنگی سامان کے عجائب گھر کی طرف جا رہا تھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا بورڈ نظر آیا " لبادہ اس طرف ہے" مجھے تجسس ہوا کہ یہ لبادہ کیسا ہے جس کے لیے خاص طور پر یہاں بورڈ لگایا گیا ہے، چنانچہ میں علامتی نشانات دیکھتا ایک پُرانے کمرے تک چلا گیا، اندر بالکل خاموشی تھی، کمرے کے وسط میں شیشے اور لکڑی کا ایک کیس دھرا تھا، میں نے بلب کی ناکافی روشنی میں کیس کے اندر جھانکا۔ میرے ذہن نے احترام اور جذبے کی ایک ایسی معراج کو چھو لیا جو مجھ جیسے گنہگار کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، میری رُوح کے دردن خانوں میں عقیدت کی ایک ایسی لہر اُٹھی جس نے میری ہستی کو اپنے اندر سمو لیا، یہ میرے نصیب تھے کہ میں اپنی آنکھوں سے رسول اللہ کی مُہر رسالت دیکھ رہا تھا، حضورؐ کے مُقدّس ہاتھوں نے کتنی بار اسے چھُوا ہوگا

مہر کے ساتھ حضورؐ کے ایک فرمان پر مہر کا نشان بھی تھا، اس کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کی تلواریں بھی اسی کیس میں رکھی تھیں۔

کمرے کے پہلو میں ایک چھوٹا سا دروازہ نکلتا تھا جس کے ساتھ آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک اور نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا "لبادہ اس طرف ہے" نشان کا رُخ آہنی سلاخوں کی طرف تھا، کمرے کی چاروں دیواریں چھت اور فرش بیش بہا قالینوں کی کئی تہوں میں ڈھکے ہوئے تھے عین وسط میں ایک چھوٹا سا صندوق دھرا تھا، میری آنکھیں آہنی سلاخوں کو پار کر کے بند صندوق کے ڈھکنے سے ٹکرائیں، صندوق میں حضور صلعم کا لبادہ مبارک تھا جسے فخر دو عالم کے جسم مبارک کا قرب حاصل رہا تھا، کاش اس صندوق کا ڈھکنا کھلا ہوتا اور میری آنکھیں لبادہ مبارک پر بچھ جاتیں میں کتنی ہی دیر وہاں سلاخوں کو تھامے اپنی خوش بختی پہ نازاں کھڑا رہا، ساتھ والے کمرے سے سیاہ لباس میں ملبوس ایک ضعیف بڑھیا اپنے نوجوان پوتے کا سہارا لیے بڑی مشکل سے چلتی ہوئی آرہی تھی، اس کے جھرّیوں سے بھرپور چہرے پر ایک تقدس آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سلاخوں کے قریب آتے ہی بڑھیا نوجوان کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھی سر پر بندھا رومال ماتھے پر کھینچا اور گھٹنے ٹیک کر دیوانہ وار کبھی سلاخوں کو اور کبھی دیوار کو چومنے لگی "محمدؐ، محمدؐ، محمدؐ" وہ بار بار پکار رہی تھی۔

"دادی اماں میں تمہیں اس شرط پر یہاں لایا تھا کہ تم یہ فرسودہ روایات نہیں دہراؤ گی" نوجوان نے بڑھیا کو قدرے درشتی سے کہا اور بازو سے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بس اب نہیں کروں گی بیٹے" بڑھیا نے بے بسی سے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی اس کی بوڑھی آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور وہ اب تک صندوق پہ نگاہیں جمائے کھڑی تھی، قدیم اور جدید کے اس کٹھور امتزاج نے مجھے دکھی کر دیا۔

دروازے پر کھڑے محافظ نے مجھے بتایا کہ سلطان سلیم اول کی فتح مصر کے بعد یہ تبرکات

قاہرہ سے استنبول منتقل کر دیئے گئے، ان میں حضورؐ کا لبادہ مبارک، عصا مبارک اور مہر رسالتؐ بھی شامل تھیں، تبرکات کے لیے ایک خصوصی ہال کی تعمیر ہوئی۔ ہر سال ماہِ رمضان میں لبادہ مبارک کے ایک کونے کو بھگو کر نچوڑا جاتا اور نچڑا ہوا پانی بلور کی شیشیوں میں بند کر لیا جاتا اسی طرح مہر رسالت کاغذ کے پچاس پرزوں پر ثبت کی جاتی اور پھر شاہی خاندان کے علاوہ سلطنت کے تمام عہدہ داروں کو ایک ایک شیشی اور مہر کا نشان عید کے تحفے کے طور پر روانہ کیا جاتا۔

محل سرا کی فصیل کے اندر ہی "ٹرکش آرکیالوجیکل میوزیم" کی عمارت میں یونانی عہد کے نوادرات رکھے گئے ہیں۔ ہم سکندر اعظم کا خالی تابوت اور اپالو کے مندر کے چند ستون دیکھ کر چار دیواری سے باہر نکلے تو دھوپ کی شدت کا احساس ہوا، ابھی صرف بارہ بجے تھے اور ہماری گاڑی ساڑھے سات بجے شام چلتی تھی "اب کیا کیا جائے" میں نے سوچا، ایکدم مجھے خیال آیا کہ ایک روز ہوسٹل میں وہی مرسان پائپ والا سویڈش لڑکا بحیرہ مرمر میں واقع "شہزادوں کے جزیروں" کے بارے میں بیحد جذباتی ہو رہا تھا، اسے یقین تھا کہ یہ جزیرے سحر زدہ ہیں فیصلہ ہوا کہ اس بارے میں تحقیق کی جائے اور وہیں چلا جائے۔

غلطہ پل کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر ہم عین پل کے نیچے پانی پر تیرتے ہوئے لکڑی کے پلیٹ فارم پر آگئے، باسفورس میں لہریں اُٹھتیں تو پلیٹ فارم ہمارے قدموں تلے جھولنے لگتا پل کے نیچے مختلف سٹال تھے جن پر رسالے، مٹھائیاں، کباب اور تلی ہوئی مچھلی بک رہی تھی، ٹکٹ والی کھڑکی کے ساتھ بورڈ پر مختلف سمتوں کو روانہ ہونے والے سٹیمروں کے اوقات درج تھے مرمرہ کے جزیرے، گیلی پولی، باسفورس۔ ہم نے "پرنس آئی لینڈز" یعنی "شہزادوں کے جزیروں" کے لیے ایک بجے چلنے والے سٹیمر کے دو واپسی ٹکٹ خرید لیے، پلیٹ فارم کے ساتھ مچھیرے بحیرۂ اسود کی خاص مچھلی "سورڈ فش" بیچ رہے تھے۔ ساتھ ہی امریکہ بحریہ کا ایک جنگی جہاز لنگر انداز تھا، جزیروں کو جانے والا سٹیمر ساحل کے ساتھ لگا تو عرشے پر کھڑے

ملاحوں نے ایک چوبی تختہ پلیٹ فارم پر پھینک کر اوپر جانے کے لیے راستہ بنا دیا، ہمارے ساتھ کھڑے مسافروں نے تمام تکلفات بالائے طاق رکھ کر سٹیمر پر دھاوا بول دیا، بالکل ایسے ہی جیسے قندھار میں سینما کے دروازے کھلنے پر دیہاتی افغان داڑھیاں منہ میں دبائے سب سے پہلے ہال میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ پردہ سیمیں کے عین سامنے سیٹوں پر قبضہ جمایا جا سکے، پچھلی سیٹوں پر بیٹھنے سے وجنیتی مالا کے جسمانی خطوط میں کمی واقع ہو جاتی ہے، بہرحال یہاں لوگ عرشے پر بچھی آرام کرسیوں کو قابو کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں تاکہ سفر کے دوران دھوپ سینکی جا سکے، ہم بھی اسی دھکم پیل میں سٹیمر کے اندرونی حصے تک پہنچ گئے، تھوڑی دیر بعد سٹیمر نے بھونپو بجایا اور پل غلطہ کے ساحل سے پیچھا چھڑا کر باسفورس میں تیرنے لگا، یوں محسوس ہوا جیسے ہم بھی سلطان فاتح کے کسی جہاز میں سوار ہیں جو خشکی سے پھسل کر سمندر میں چلا گیا ہے، اردگرد کے سمندر میں حسب معمول خوب چہل پہل تھی۔ متعدد سٹیمر یورپ اور ایشیا کے "پھیرے" لگا رہے تھے، مچھیروں کی کشتیاں ڈول رہی تھیں اور ان کے درمیان ایک چٹان پر "لیانڈر کا مینار" کھڑا تھا۔

پادریوں نے شہنشاہ کانسٹنٹائن کو بتایا کہ اس کی خوبصورت بیٹی کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوگی، شہنشاہ نے شہزادی کی مستقل رہائش کے لیے باسفورس کے بیچ یہ مینار بنوا دیا تاکہ وہ سانپوں کی پہنچ سے باہر رہے، شہزادی سارا دن مینار کی بلند کھڑکی سے سمندر کو تکتی رہتی۔ شاہی محل سے روزانہ ایک سجی سجائی کشتی آتی اور شہزادی کو کھانے پینے کی چیزیں دے کر واپس چلی جاتی، ایک روز شہزادی نے چوری چھپے مینار کے قریب سے گزرتی ہوئی مچھیروں کی کشتی سے انگوروں کی ایک ٹوکری خریدلی اور اسی شب کالے انگوروں کے نیچے چھپے ہوئے موذی ناگ نے اسے ڈس لیا۔ مینار کے دوسری طرف فلارنس نائٹ انگیل ہسپتال واقع ہے۔ ہمارے بائیں ہاتھ محل سرا گزر رہا تھا جس کے عین نیچے ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہوا کرتی تھی، سلطان کسی جنگی مہم سے واپس آتا تو جہاز سے اتر کر سیدھا محل سرا میں داخل ہو جاتا، دراز قامت

حبشی خواجہ سرا ناپسندیدہ اشخاص کو بوریوں میں باندھ کر نیچے لے آتے اور کشتی میں رکھ کر باسفورس کے وسط میں ڈبو دیتے، پل غلطہ پر سے گزرنے والی ٹریفک کا شور اور باسفورس میں چلنے والے جہازوں اور سٹیمروں کے بھونپوؤں کی آوازیں اب دور ہوتی جا رہی تھیں، ہمارے سٹیمر نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی، سمندر کا پانی تیز دھوپ میں شیشے کی مانند چمک رہا تھا، دھوپ کی شدت کو سمندر کی نمی نے اپنے اندر سمو لیا تھا، اب سٹیمر کی اپنی دنیا جاگ اٹھی۔

درمیانی منزل نہایت پرسکون تھی۔ آرام دہ صوفے اور سمندر کے نظارے کے لیے شیشے کی گول کھڑکیاں، یہاں زیادہ تر بوڑھے اور شادی شدہ لوگ اونگھ رہے تھے اوپر عرشے پر اودھم مچا ہوا تھا، بڑے فریموں کی گول گول شیشوں والی عینکیں لگائے، منی سکرٹ پہنے چیونگم چباتی ہوئی مختلف قسم کی لڑکیاں، مسلمان نہیں لگتی تھیں۔ ایک لڑکا اکارڈین بجا رہا تھا، لہروں کا شور زیادہ ہو جاتا تو تمام لڑکے لڑکیاں تال کے ساتھ ساتھ تالیاں پیٹنے لگتے، چند لوگ تاش کھیلنے میں مصروف تھے، ایک کونے میں دو امریکن ملاح گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر بیئر کے ڈبوں کو منہ لگائے دھوپ سینک رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک جزیرہ آیا اور لوگ اترنے لگے، میں کیمرے سنبھال کر اٹھنے لگا تو ساتھ بیٹھی ہوئی ترک لڑکی نے کہا " ابھی بیٹھے رہو۔ آخری جزیرے پر اترنا۔ زیادہ خوبصورت ہے۔"

آخری جزیرہ واقعی ہی باقی جزیروں سے خوبصورت تھا، سمندر کی نیلاہٹ میں سرسبز اور شاداب درختوں کا ایک جھنڈ، خوبصورت سفید مکانات اور سرخ مٹی کی ایک لکیر جو ساحل کو چھو رہی تھی۔ ساحل کے ساتھ سڑک پر ریستوران اور قہوہ خانوں کے ویٹر سفید ڈنر جیکٹوں میں ملبوس ہاتھ میں مینو کارڈ تھامے سٹیمر سے اترنے والے گاہکوں کا انتظار کر رہے تھے، اکثر لوگ سٹیمر سے اتر کر ساحل سے پرے خوبصورت پہاڑیوں پر نگاہ ڈالے بغیر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر بیٹھ کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگے۔ اکارڈین بجانے والے لڑکے کے ساتھی چوک میں گھوڑا بگھیوں پر سوار ہو کر جزیرے کے کسی پرسکون گوشے کی تلاش میں جا چکے تھے۔



ہم بھی سٹیمر سے اُترے اور ساحل چھوڑ کر ڈھلوان سڑک پر چڑھتے ہوئے قصبے کے چھوٹے چوک تک آ گئے۔ ایک دکان کے باہر سوکھا گوشت، پنیر اور مچھلیاں لوہے کے کنڈوں سے ٹنگی ہوئی جھول رہی تھیں۔ دروازہ کھول کر اندر گئے تو دوکاندار نے مسکرا کر پوچھا "مسلمان؟"
ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "الحمدللہ" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلایا۔ "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ جزیرے کے کسی خوبصورت گوشے میں بیٹھ کر پکنک منائی جائے اس کے لیے ہمیں کچھ کھانے کی چیزیں درکار ہیں۔"

دوکاندار نے اپنے رومال سے اچھی طرح ہاتھ صاف کیے اور باہر جا کر گوشت کا بڑا ٹکڑا کنڈے سے اُتار لایا "کتنے کا؟" اس نے ایک آری ہاتھ میں لے کر پوچھا "دو لیرے" میں نے جواب دیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر علیحدہ رکھ دیا "نہیں پانچ لیرے" علی نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پانچ لیرے کا ٹکڑا خاصا بڑا تھا، اسی طرح پنیر، مچھلی، ڈبل روٹی اور اُبلے ہوئے انڈوں کی قیمتوں کا فیصلہ ہوا۔

"اور ہاں شراب۔" دوکاندار نے شلیف پر سجی رنگ برنگی بوتلوں میں سے ایک نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی "اسی جزیرے کے انگوروں سے بنی ہے۔"

"نہیں" میں نے ہنس کر کہا "ہمیں انگوروں کی بیلیں دیکھ کر ہی نشہ ہو جاتا ہے۔"

"ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ مسلمان!" اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور بوتل اٹھا کر واپس شلیف میں رکھ دی۔"

میں خوراک کا بنڈل اٹھا کر دکان سے باہر آنے لگا تو اس نے مشورہ دیا۔ "اس چوک سے دائیں ہاتھ مڑ کر پہاڑی کی چوٹی تک چلے جایئے، چوٹی پر چیڑ کے درختوں کا جھنڈ ہی جزیرے کا حسین ترین گوشہ ہے۔"

چوک کے گرد درجنوں قدیم وضع کی بگھیاں کھڑی تھیں، رنگین جھالروں اور گول پُھندنوں



سے مُزیّن، گھوڑوں کے ساز نہایت نفیس قسم کے تھے اور ان کے گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں، ہم نے ایک بگھی کرائے پر لے لی۔

"جزیرے کا پورا چکّر لگایئے گا یا صرف قمار خانے تک چلیے گا" کوچوان نے اپنی ٹوپی ماتھے پر سرکائی اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"فی الحال تو پہاڑی کی چوٹی کی طرف جانے والی سڑک پر مُڑ جاؤ" میں نے بل کھاتی ہوئی سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہُو ہُو" کوچوان نے نہایت پیار سے گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دی، بگھی حرکت میں آئی، تو چھنکتی ہوئی گھنٹیوں کی مسلسل موسیقی شروع ہوگئی جس میں گھوڑے کی ٹاپ تال کا کام دے رہی تھی۔

کسی زمانے میں جب تُرک شہزادے محل سرا کی کسی سازش میں ملوث پائے جاتے یا کسی وجہ سے سُلطان کے زیرِ عتاب آجاتے تو اُنہیں ان جزیروں میں نظر بند کردیا جاتا، اسی نسبت سے انہیں "شہزادوں کے جزیرے" کہا جاتا ہے، آج کل جب موسم گرما میں استنبول میں سخت تپش اور حبس کا دَور دَورہ ہوتا ہے تو لوگ ان جزیروں کا رُخ کرتے ہیں جہاں آب و ہوا خوشگوار اور ماحول پُرسکون ہوتا ہے۔

اب ہماری بگھی بلندی کی طرف جارہی تھی، سڑک کے دونوں طرف سفید رنگ کے خوشنما مکان تھے جن کے گرد چھوٹے چھوٹے باغیچے سُرخ، نیلے اور کاسنی پھولوں سے اَٹے پڑے تھے، دُھندلاتے ہوئے سنگِ مرمر کے پُرانے فوّاروں کے گرد خودرَو جنگلی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں، سَرو اور چیڑ کے گہرے سبز درخت مکانوں کی چھتوں تک چلے گئے تھے۔ سبزے اور خوشنما پھولوں نے مکانوں کا مکمّل گھیراؤ کیا ہوا تھا، سمندر سے نم ہوا کے جھونکے آتے تو جنگلی گلاب کی بیلیں دیواروں سے چھُوٹ کر سفید ادھ کھُلی کھڑکیوں میں جھانکنے لگتیں۔ ہر طرف ایک مکمّل اور سحر انگیز سکون تھا، ہماری بگھی کا سفید گھوڑا ایک مکانکی کھلونے کی مانند سر ہلاتا چلا جارہا تھا اور راس

کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں چھن چھن چھنک رہی تھیں۔ بیلوں کے جھنڈ میں سے ایک سینڈ کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک مَن موہنی صورت نے جھانکا۔ "چھن چھن کی اس موسیقی نے سحر توڑ دیا ہے" میں نے سوچا" اور سوئی ہوئی شہزادی جاگ اٹھی ہے"۔ شہزادی نے خوابیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کھڑکی دوبارہ بند کر لی، یکدم موسیقی بھی بند ہو گئی۔

"بگھی آگے نہیں جا سکتی" کوچوان نے باگیں کھینچ لیں" یہاں سے آپ کو پیدل جانا پڑے گا"۔

ہم نے کرایہ ادا کیا اور سڑک کو چھوڑ کر اوپر جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیے۔ چوٹی پر چیل اور سرد کا گھنا جنگل تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں خودرو جنگلی گھاس کی تہیں بچھی تھیں جس میں اکا دُکا زرد پھول بھی نظر آ رہے تھے، ہم اس چھوٹے سے جنگل کو پار کر کے دُوسرے کنارے پر چلے گئے، جہاں سے پھر ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی یہاں سے نجیرۂ مرمرا اور اس میں بکھرے ہوئے خوبصورت جزیرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گھاس پر اپنی سینڈ برساتی بچھا دی اور لیٹ گیا، علی خوراک کا بنڈل زمین پر رکھ کر سستانے لگا۔

"پکنک کے لیے جگہ کا انتخاب غلط ہوا ہے" میں نے تھوڑی دیر بعد وہاں سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں یہاں کیا قباحت ہے؟ علی نے جھنجھلا کر پُوچھا۔

"یہاں سے سامنے والے جزیرے کا ایک کونہ نظر نہیں آ رہا" میں نے برساتی سمیٹتے ہوئے جواب دیا اور درختوں کے جھنڈ کے ساتھ کھلی جگہ کی طرف چلا گیا۔

"یہ جگہ بہتر ہے" میں نے برساتی بچھاتے ہوئے کہا۔

"پکّی بات ہے نا؟" علی نے اکتاہٹ سے کہا" پھر کہو گے کہ سمندر میں فلاں کشتی کے بادبان کا زاویہ ٹھیک نہیں بن رہا۔

علی کی بے چینی بجا تھی ہم دونوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں گھاس پر لیٹ گیا اور سگرٹ سُلگا لیا، میرے کانوں میں

کہیں سے اکارڈین کی دل نواز موسیقی اور تالیوں کی مدھم سی آواز آئی، سٹیمر میں ہمارے ساتھ سفر کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی آس پاس کہیں پکنک منا رہے تھے، میرے سامنے چھوٹے چھوٹے جزیروں کے گرد نیلے سمندر میں بادبانی کشتیاں جھول رہی تھیں، اگر ان بادبانوں کے گلے میں نقرئی گھنٹیاں باندھ دیں تو؟ خوشگوار خنک ہوا کا ایک جھونکا چیڑ کے درختوں کو چھوتا آیا اور میرے نتھنوں میں ہریاول اور تازگی کی باس رچ گئی، میرے پپوٹے سبز ٹھنڈک کے اس احساس کو برداشت نہ کر سکے اور خود بخود بند ہونے لگے سفر کے اختتام پر جب سیاح پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اس کے ذہن کے نیلگوں سمندر میں چند لمحے خوابوں کے جزیرے بن کر ابھرتے ہیں، ایسے لمحے جو اس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتے ہیں، ان لمحوں کا جادو عمر بھر وقت کو زنجیر پہنائے رکھتا ہے، وادیٔ نیلم کی نیلی جھیلوں کی پہلی جھلک، ولائت میں کرسمس کی شام کو پہلی برفباری، جھیل جنیوا کے کنارے گئی رات والز کا پہلا سبق، ماسکو کے سرخ چوک میں روسی لوک دھنیں، کوہ آرارات کا برف پوش لبادہ اور اب ڈھلتی دوپہر میں چیڑ کے درختوں سے پرے نیلگوں بحیرۂ مرمر میں بکھرے ہوئے جزیرے۔ مجھے نیند آگئی۔ میری آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ قصبے کے چوک سے پرے ساحل پر استنبول روانہ ہونے والا آخری سٹیمر متواتر بھونپو بجا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے برساتی سمیٹی اور ہم دونوں نیم تاریک پگڈنڈی پر تیزی سے نیچے اترنے لگے، ہمارے سٹیمر کے اندر داخل ہوتے ہی ملاحوں نے لکڑی کی سیڑھی اٹھالی اور ہم اس سحر زدہ جزیرے سے ناطہ توڑ کر استنبول کی جانب روانہ ہو گئے،

سٹیمر پر اب بہت کم لوگ تھے درمیانی منزل کے آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے میں نے گول کھڑکی سے جزیرے پر آخری نظر ڈالی "شہزادوں کا جزیرہ" میرے لیے "خوابوں کا جزیرہ" بن گیا تھا جو میرے ذہن کے نیلگوں سمندر میں ہمیشہ ابھرتا رہے گا، تھوڑی دیر میں دور اندھیرے میں استنبول کی روشنیاں چمکنے لگیں۔ ہمارا سٹیمر دھیرے دھیرے غلطہ پل پر سے گزرنے والی لاتعداد کاروں کے شور کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یورپ اور ایشیا

کی لاتعداد روشنیاں باسفورس کے سمندر میں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔

سٹیمر غلطہ پل کے پلیٹ فارم کے ساتھ لگا تو سات بج رہے تھے، ہم سیدھے ہوسٹل پہنچے اپنا سامان سمیٹا اور "دالموش" ٹیکسی میں بیٹھ کر سٹیشن پہنچ گئے جہاں کسٹم کے عملے نے واجبی سی چیکنگ کے بعد ہمیں فارغ کر دیا۔



اورینٹ ایکسپریس

"اورینٹ مرمرہ ایکسپریس چلنے کے لیے تیار ہے" لاؤڈ سپیکر میں سے اناؤنسر کی آواز گونجی "ڈائرکٹ پیرس، لنڈن براستہ صوفیہ، بلغراد، ترلیست، وینس، میلان، لوزان اور پیرس۔"

ہمارے سامنے مشہورِ زمانہ اورینٹ ایکسپریس کھڑی تھی، پلیٹ فارم تقریباً خالی پڑا تھا،

"انجن کی پُشت میں لگے ہوئے ڈبے پیرس کے لیے ہیں، کہیں بھی بیٹھ جایئے گاڑی تقریباً خالی ہے" بوڑھے گارڈ نے ہمارے ٹکٹ چیک کرتے ہوئے بتایا، سامنے والے ڈبے کی کھڑکی میں سے دو موٹی جرمن لڑکیاں جھانک رہی تھیں۔

"یہیں بیٹھ جاتے ہیں" علی کے چہرے پر رونق آگئی۔

"نہ بیٹے یہ ڈبے تو میونخ جائیں گے۔ میں نے کہا نا انجن کے پیچھے والے ڈبے ہی پیرس کے لیے ہیں۔" گارڈ نے علی کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ گاڑی میں بین الاقوامی معیار کی سہولتیں میسّر تھیں، ڈبے نہایت

صاف ستھرے اور آرام دہ، شیشے کی بڑی کھڑکی اور اس کے اوپر خوبصورت پردے، روشنی گُل کیجیے تو ایک ننھی مُنّی بیڈ لائٹ خود بخود جل جائے گی اور پھر جگمگاتے ہوئے سفید غسلخانے، ہم نے سامان کھول کر پورے ڈبے میں سجا دیا، اگلے دو روز کے لیے یہ ہمارا گھر تھا، میں نے اپنا سونے کا تھیلا نشست پر بچھایا اور گاڑی کے چلنے والے راستے کی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔

پورے ساڑھے سات بجے اورینٹ ایکسپریس خاموشی سے رینگنے لگی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی شہر کی روشنیاں اور باسفورس کا سمندر نظروں کے سامنے آ گئے، مجھے صدیوں پہلے کا وہ دن یاد آ گیا جب حیدر پاشا سٹیشن سے نکلتے ہی میناروں اور گنبدوں کے ایک جنگل نے مجھے آغوش میں لے لیا تھا، میرے ذہن میں استنبول کی پہلی جھلک کے تاثرات اُبھرے جو جوانی کی کے فریبوں اور پہلی محبت کی گنگناتی کسک سے زیادہ حسین اور ہیجان خیز تھے اب میں چاہے کتنی بار ہی اس شہر میں کیوں نہ آؤں میرے احساسات میں وہ گرمی اور وارفتگی نہ ہوگی۔ جس طرح ادبی ذوق رکھنے والے ایک شخص سے پوچھا گیا کہ اگر وہ ایک مرتبہ پھر اس دنیا میں پیدا ہو تو نئی زندگی میں وہ کونسا ایسا تجربہ ہوگا جس کا اُسے انتظار رہے گا، اس نے جواب دیا، "لیو ٹالسٹائی کا ناول" جنگ اور امن" پہلی مرتبہ پڑھنے کا شاندار تجربہ" اسی طرح اگر مجھے بھی ایک نئی زندگی مل جائے تو میں استنبول کی پہلی جھلک کے احساسات سے روشناس ہونے کا بے چینی سے انتظار کروں گا، افسانوں اور کہانیوں کا شہر بازنطائن، قسطنطنیہ، استنبول، بچپن میں املا لکھتے وقت قسطنطنیہ ہمیشہ ہی غلط لکھا جاتا۔

گاڑی نے رفتار تیز کر دی اور ایک لمبا موڑ کاٹا، شہر کی آخری روشنیاں نظر سے اوجھل ہو گئیں۔

تھوڑی دیر میں ترک کسٹم آفیسر آیا اور پاسپورٹوں پر مہر لگا کر چلا گیا، اورینٹ ایکسپریس رات کی تاریکی میں بلغاریہ کی جانب بھاگی جا رہی تھی، میں نے اپنے سونے کے تھیلے کی زِپ کھولی اور نرم پَروں کی اس سفری رضائی میں گھس کر سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر گاڑی ترک، بلغار

سرحد پر رُکی تو ایک بلغار کسٹم آفیسر نے ڈبے کا دروازہ کھول کر روشنی دی " پاسپورٹ پلیز" میں نے وہیں لیٹے لیٹے کھونٹی پر ٹنگے کوٹ کی طرف اشارہ کر دیا جس کی اندرونی جیب میں ہم دونوں کے پاسپورٹ رکھے تھے، کسٹم آفیسر نے پاسپورٹ نکال کر دینے کے صفحات پر مُہر ثبت کر دی۔

" آپ کے آرام میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں " اس نے اکڑوں کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا اور روشنی گُل کرنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر نیند کوسوں دُور تھی۔ شیشے کی کھڑکی کے باہر بلغاریہ کے وسیع میدانوں میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی" میں نیلی ٹرین میں سفر کر رہا ہوں" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا، نیلی ٹرین جو کسی زمانے میں بلقان کی تاریخ میں رُومان اور اسرار کی ایک علامت بن گئی تھی، اس گاڑی میں بلقان کے شاہی خاندانوں کے فرد، سفیر، ایلچی اور طرح طرح کے مُشتبہ حضرات سفر کرتے اور دورانِ سفر سیاسی جھگڑے سفارتی بات چیت سے بڑھ کر خنجر اور گولی کی زبان سے بھی طے کر لیے جاتے، اگاتھا کرسٹی نے اپنے مشہور ترین ناول " اورینٹ ایکسپریس میں قتل" کا مرکزی خیال اِسی نیلی ٹرین سے لیا تھا۔ ایک شخص کا قتل جس میں ٹرین کے سارے مُسافر ملوث تھے، شاید اِس کی بُری شہرت کی وجہ سے ہی زیادہ لوگ اس پر سفر کرنا پسند نہیں کرتے، پورے ڈبے میں ہمارے سوا اور کوئی مُسافر نہ تھا میں نے ایک جُھرجُھری سی لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پچھلے پہر کی مدّھم چاندنی میں ہمارا کمرہ بھی بجد پُراسرار لگ رہا تھا، سامنے کی نشست پر علی بڑے اطمینان سے سو رہا تھا، میں نے اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور کھڑکی کا پردہ نیچے کر کے واپس اپنے تھیلے میں گھُس کر سو گیا۔

دوسری صبح آنکھ کھُلی تو گاڑی کا تمام عملہ راتوں رات تُرک سے بلغار میں بدل چُکا تھا، باہر مطلع اَبر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیتوں، باغوں اور کالی زرخیز زمین کے " اجتماعی فارموں " کا ایک سلسلہ تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا، گاڑی ایک

قصباتی سٹیشن پر رُکی تو چند بھاری بھرکم دیہاتی عورتیں سبزیوں کی ٹوکریاں اُٹھائے ہمارے ڈبے میں گھس آئیں، گاڑی دوبارہ چلی تو میں نے علی سے ناشتے کے بارے میں پوچھا جو اب ایک کونے میں دُبکا بیٹھا تھا، کہنے لگا "ابھی بھئے دو ورنہ صُلح کرنے پڑے گی اور اگر انہوں نے شکریہ کہہ کر قبول کرلی تو؟" دیہاتی عورتوں کے بھاری تن و توش کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجھے علی کی دلیل خاصی وزنی معلوم ہوئی۔

بلغاریہ کا دارالخلافہ صوفیہ آیا تو وہ سب اُتر گئیں۔ علی نے اطمینان کا سانس لیا اور ہم نے جلدی سے بریک فاسٹ اور لنچ ملا کر بقول صاحب لوگوں کے "برنچ" کرلیا، گاڑی صوفیہ کے صاف مگر صاف سُتھرے سٹیشن پر ایک گھنٹہ تک کھڑی رہی، اس اثنا میں صفائی کے عملہ نے ہمیں نکال باہر کیا اور کمرے کی ہر چیز کو جھاڑ پونچھ دیا، اس دوران علی سٹیشن پر ٹہلتا رہا اور چلتے پھرتے بیچنے والی چند بلغار لڑکیوں کے ساتھ گپ لگاتا رہا۔ واپس آیا تو میں نے ہنس کر پوچھا "کہو کچھ ہوا؟" مُنہ بنا کر کہنے لگا۔

"ہونا کیا تھا مجھے تو ان کی انگریزی کا ایک لفظ سمجھ میں نہیں آتا" میں نے اسے بتایا کہ بھائی انگریزی صرف ولایت میں بولی جاتی ہے یہ لڑکیاں بلغارین میں بات کر رہی ہوں گی۔

پچھلے پہر تین بجے کے قریب بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کا سرحدی قصبہ دِمتری گراڈ آگیا، یوگوسلاویہ کسٹم آفیسر دیر تک ہمارے پاسپورٹوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ "آپ میرے ساتھ کسٹم ہاؤس میں تشریف لائیے" اس نے پاسپورٹ وردی کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں کسٹم آفیسر کے ساتھ گاڑی سے نیچے اُترا تو باہر ابھی تک ہلکی ہلکی بُوندا باندی جاری تھی کسٹم ہاؤس سٹیشن کے آخری سرے پر تھا اور وہاں پہنچنے تک میرا سفید کُرتہ پاجامہ بالکل بھیگ چکا تھا، برآمدے میں ایک موٹا یوگوسلاو جو شاید کسٹم ہاؤس کا انچارج تھا بغیر فریم کے شیشوں والی عینک لگائے رجسٹروں پر جھکا خانہ پُری میں مصروف تھا، آفیسر نے سیلوٹ کیا اور ہمارے پاسپورٹ اس کے سامنے رکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا، موٹے یوگوسلاو نے رجسٹر بند کرکے ہمارے

پاسپورٹوں کا سرسری معائنہ کیا۔

"آپ کے پاسپورٹ یوگوسلاویہ کے لیے کارآمد نہیں ہیں" اس نے شستہ انگریزی میں کہا، دفعتاً مجھے خیال آیا کہ پاسپورٹوں پر ہم نے یوگوسلاویہ کی تصدیق تہران کے پاکستانی سفارتخانے سے کروائی تھی جو صرف پندرہ یوم کے لیے کارآمد تھی۔ یعنی یہ میعاد پانچ روز قبل استنبول میں ہی ختم ہو چکی تھی۔

"آپ کو یہاں سے واپس استنبول جانا پڑے گا۔ اپنا سامان اُتار لیجیے" اس نے دونوں پاسپورٹ میری طرف بڑھا دیئے اور رجسٹر کھول کر پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ صورت حال میرے لیے نہایت تشویشناک تھی، میں نے پاسپورٹ کھول کر ویزے کا صفحہ دیکھا تو اُس پر ٹھیک تین روز پہلے کی مُہر تھی، میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ "دیکھئے جناب" میں نے ویزا کی مہر پر انگلی جما کر موٹے یوگوسلاو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ استنبول میں آپ کے سفارت خانے نے ہمیں صرف تین روز قبل ویزا دیا تھا حالانکہ یہ پاسپورٹ آج سے پانچ روز پہلے ہی یوگوسلاویہ کے لیے کارآمد نہ رہے تھے، اب اگر ہم سے غلطی ہوئی تو قصوروار آپ کا سفارت خانہ بھی ٹھہرتا ہے" موٹے نے اپنی عینک کو انگلی سے ٹھوکا دے کر ناک پر درست کیا اور ویزے کی مُہر کو بغور دیکھنے لگا۔

"ہُوں" اس نے سر ہلا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل ہُوں" میں نے بھی اسی طرح سر ہلایا۔

کسٹم ہاؤس سے خلاصی کروا کے جب میں باہر پلیٹ فارم پر نکلا تو گاڑی کے اکثر مسافر کھڑکیوں سے سر نکالے مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے میری وجہ سے اورینٹ ایکسپریس تقریباً پندرہ منٹ لیٹ ہو گئی تھی، میں نہایت اطمینان سے بارش میں بھیگتا اپنے ڈبے کی طرف چلنے لگا اور ساتھ ساتھ کھڑکیوں میں سے جھانکتے مسافروں کو خوشدلی سے ہاتھ بھی ہلاتا رہا، سب منہ بنائے کھڑے رہے، کمرے کے اندر داخل ہوا تو جلی نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی "اتنی دیر کیا کرتے رہے ہو؟ مسافروں نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کہتے تھے تمہارا ساتھی شکل ہی سے نامی گرامی سمگلر لگتا

ہے 'چرس لائے ہو یا افیم؟' میں نے پوری تفصیل بتائی کہ کس طرح ہم استنبول واپس جاتے جاتے بچے ہیں تو اس کا غصّہ کافور ہو گیا بلکہ شکر لانے کے دو نفل بھی مان لیے جب تک گاڑی "دمتری گراڈ" کے پلیٹ فارم سے باہر نہ نکلی ہم دَم سادھے بیٹھے رہے مبادا اُس موٹے کسٹم آفیسر کو کوئی اور نکتہ یاد نہ آجائے، گاڑی یوگوسلاویہ میں داخل ہوئی تو پورا عملہ بھی بدل چکا تھا۔

یوگوسلاویہ بھی بلغاریہ کی طرح سرسبز و شاداب تھا، حدِ نگاہ تک ہریالی اور ریچھے پہاڑ، پھلدار درختوں اور سَرو کی قطاریں، جنگل، کھیت اور دَریا، گوریلا جنگ کے لیے نہایت موزوں علاقہ، دُوسری جنگِ عظیم میں ٹیٹو اور اس کے ساتھیوں نے اِنہی قدرتی مزاحمتوں کا فائدہ اُٹھا کر قابض فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے۔

رات کے نو بجے یوگوسلاویہ کا دارالخلافہ "بیوگراڈ" یا بلغراد آیا، شہر کی روشنیوں کے درمیان ایک بَل کھاتا ہوا دریا دکھائی دیا۔ نقشہ اٹھا کر دریا کے نام کا تعین کیا تو معلوم ہوا کہ "نیلی ٹرین" ابھی ابھی "نیلے ڈینیوب" پر سے گزُر رہی ہے۔

گاڑی بلغراد سے چلی تو ہم سونے کی تیاری کرنے لگے، اورینٹ ایکسپریس میں یہ ہماری دوسری شب تھی۔

دوسری صبح آنکھ کھُلی تو معلوم ہوا کہ "سیزانا" کے راستے اطالیہ میں داخل ہو چکے ہیں اور گاڑی "وِلّا آپ سینا" کے سٹیشن پر کھڑی ہے باہر بادل چھَٹ چکے تھے اور خوشگوار دھوپ چمک رہی تھی، اطالوی کسٹم آفیسر نے پاسپورٹوں پر مُہر لگائی اور مُسکرا کر پوچھا "سینور۔ الکوہل؟ سگریٹ؟"

"سگرٹ ہی۔ الکوہل نو" میں نے جواب دیا۔

"وِلّا آپ سینا" سے گاڑی نکلی تو ایڈری آٹک کا نیلا اور خوشگوار سمندر ساتھ ہو لیا "تریَسّت" آیا تو اکثر مسافر اُتر گئے یہ اورینٹ ایکسپریس کا پہلا مغربی یورپی سٹاپ ہے، صبح کی دھوپ میں پورا شہر چمک رہا تھا، تریَسّت جانے کے لیے گاڑی مرکزی پٹڑی سے ہٹ کر

ایک علیحدہ اور چھوٹی پٹڑی پر ہو جاتی ہے چنانچہ مسافر اتار کر گاڑی نے بیک گیئر لگایا اور تھوڑی دیر میں دوبارہ مرکزی پٹڑی پر آگئی۔ ایک مرتبہ پھر گاڑی کا پورا عملہ تبدیل ہو چکا تھا' بھورے بالوں والے یوگو سلاد کی بجائے اب پستہ قد اطالوی ٹکٹ چیک کر رہے تھے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سمندر اب ایک وسیع دلدل کی صورت میں گاڑی کے دونوں طرف بڑے اطمینان سے پھیلا ہوا تھا۔ کنڈکٹر ٹکٹ دیکھنے آیا تو میں نے اگلے شاپ کے بارے میں دریافت کیا۔

"دی نیزیا سینیور" اس نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو چوم کر کہا۔ میں نے کپڑے بدلے اور اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ علی اسی گاڑی پر سیدھا لنڈن جا رہا تھا مگر میں چند روز کے لیے وینس میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ سٹیشن آیا تو میں نے اپنا سامان ڈبے سے نکال کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ علی خاموشی سے کھڑا سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ہم دونوں کے لیے جدائی کا یہ لمحہ بیحد کٹھن ثابت ہو رہا تھا لاہور سے یہاں تک کی رفاقت ختم ہو رہی تھی" اچھا دوست اب انشاء اللہ واپسی پر وطن میں ملاقات ہو گی" میں نے افسردگی سے علی کی طرف ہاتھ بڑھایا' وہ میرے ہاتھ کو نظر انداز کر کے مجھ سے لپٹ گیا" میں تو کہتا ہوں میرے ساتھ لنڈن چلو۔ اب اکیلے کہاں مارے مارے پھرو گے" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر مسکرا دیا۔ "خدا حافظ" میں نے اپنا سفری تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا "چھ ماہ بعد لاہور کی مال روڈ پر ملاقات ہو گی انشاء اللہ" اس نے ایک سگرٹ سلگا کر میرے منہ سے لگا دیا" ترک تمباکو خوشبو اور مزے کے لحاظ سے دنیا بھر میں بہترین ہے۔" باہر جانے کے پھاٹک سے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو علی ابھی تک وہیں کھڑا تھا میں نے سٹیشن کے ایک کونے میں واقع سیاحوں کے لیے دفتر معلومات سے کیمپنگ کی جگہ کا پتہ دریافت کیا تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی خوش رو اطالوی حسینہ نے شہر کا ایک تفصیلی نقشہ نکالا اور ایک جگہ سرخ پنسل سے نشان لگا کر مجھے تھما دیا۔ "لیڈ دکیمپنگ میں چلے جائیے۔"



وینس میں موت بھی خوبصورت ہے

سٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا تو پانی میں گرتے گرتے بچا، ٹریفک سے بھری پڑی تارکول کی سڑک کے بجائے سامنے وینس کی سب سے بڑی نہر "گرینڈ کنال" رواں تھی۔ جس جگہ بسوں اور ٹیکسیوں کا اڈہ ہونا چاہیئے تھا وہاں سٹیمر اور نازک گنڈولے پانی میں جھول رہے تھے، ایک سٹیمر مسافروں سے پُر ہو جاتا تو بھونپو بجا کر "گرینڈ کنال" کے پانیوں میں تیرنے لگتا اور اس کی جگہ دوسرا سٹیمر لے لیتا۔ میں نے ٹکٹوں کی کھڑکی کے اندر جھانکا۔

"مجھے لیڈو کیمپنگ جانا ہے ٹکٹ دے دیجئے"

گنجے اطالوی نے میری طرف تین ٹکٹ بڑھا دیئے۔

"لیکن مجھے تو صرف ایک ٹکٹ درکار ہے۔ اُدنو" میں نے اُنگلی نچا کر کہا۔

"ایک ٹکٹ تمہارے لیے، ایک سوٹ کیس کا اور ایک سامان کے تھیلے کا۔" میرے احتجاج کا جواب ملا۔

سٹیمر کے عرشے پر بےشمار سیاح کھڑے تھے جو کیمروں میں نظر جمائے گرینڈ کنال کے دونوں طرف

گزرنے والے محلات اور خوبصورت مکانوں کی تصویریں بنا رہے تھے میں پچھلے حصے میں چلا گیا۔

لیڈو کیمپنگ " ایڈری آٹک " سمندر کے کنارے درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں، واقع تھی ابھی مئی کا آخیر تھا اس لیے کیمپنگ میں وہ گہماگہمی نہ تھی جو جولائی اگست کے ٹورسٹ سیزن کا خاصہ ہوتی ہے۔

یورپ میں ہوٹلوں کے ہوشربا کرائے میرے جیسے سیاح کے لیے سوہانِ رُوح بن جاتے ہیں، اگر سفر ایک دو ہفتوں کا ہو تو شائد جیب اجازت دے دے مگر طویل سفر کے لیے متبادل انتظام نہایت ضروری ہو جاتا ہے، اس مصیبت کا واحد حل کیمپنگ ہے، یورپ کے کونے کونے میں ہزاروں " کیمپنگ سائٹس " بکھری پڑی ہیں۔ خاص طور پر مشہور شہروں اور پُر فضا مقامات پر تو ان کی بہتات ہے اگر کیمپنگ درمیانے درجے کی بھی ہو تو وہاں صاف ستھرے غسل خانے اور کھانے پینے کی اشیا کے لیے ایک دکان تو ضرور ہوتی ہے، اول درجے کی کیمپنگ میں نہانے کا تالاب، ریستورنت، سٹور اور دوسرے تمام لوازمات ملیں گے جو آپ کو اس سے کئی گنا زیادہ پیسے خرچ کرکے ایک اچھے ہوٹل میں دستیاب ہوتے ہیں، کیمپنگ میں داخل ہو کر دفتر میں اپنا نام پتہ درج کروائیے اور پھر مناسب جگہ تلاش کرکے اپنا چھوٹا سا گھر آباد کر لیجئے اگر آپ کسی " بین الاقوامی کیمپنگ کلب " کے رُکن ہیں تو جگہ ملنے میں آسانی رہتی ہے اور کرائے میں بھی تخفیف کر دی جاتی ہے، ماحول اتنا دوستانہ ہوتا ہے کہ کئی لوگ اپنی پوری چھٹیاں کیمپنگ کی جگہ میں ہی گزار دیتے ہیں اور شہر کا رُخ تک نہیں کرتے، چند سال پیشتر میں فرینکفرٹ جرمنی کے سٹیشن پر اُترا تو تلاش کے باوجود کہیں بھی رہائش کا بندوبست نہ ہو سکا، تمام رات بارش میں بھیگتا اور سردی سے ٹھٹھرتا رہا، دوسری صبح دکانیں کھلنے پر میں نے ایک خیمہ، سونے کا تھیلا، ربڑ کا گدا اور کھانا پکانے کا سامان خرید لیا، وہ دن اور آج کا دن مجھے کہیں بھی غریب الوطنی کا احساس نہیں ہوا، جہاں کہیں شام ہوئی تو نزدیکی کیمپنگ کا رُخ کیا یا وہیں کہیں مناسب جگہ تلاش کرکے اپنا خیمہ جما دیا، لیڈو کیمپنگ کے دفتر میں

اپنا پاسپورٹ بطور ضمانت جمع کروا کے میں نے سمندر کے کنارے اپنا خیمہ نصب کر لیا۔ استنبول سے وینس تک کے طویل سفر نے مجھے تھکا دیا تھا اور میں اب دوبارہ شہر تک جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کیمپنگ کے ریستوران میں کھانا کھا کر ساحل کی طرف چلا گیا جہاں بیشمار مرد اور عورتیں ریت پر اوندھے منہ لیٹے دھوپ سینک رہے تھے، نہانے میں کسی کو بھی دلچسپی نہ تھی، ہر ایک یہی کوشش تھی کہ کسی طرح جسم "براؤن" ہو جائے۔ دو خواتین ایک دوسرے کو "ٹین لوشن" ملنے میں مصروف تھیں، جس طرح ہمارے ہاں رنگ گورا کرنے کی کریمیں دھڑا دھڑ بکتی ہیں اسی طرح یورپ میں "ٹین لوشن" یعنی رنگ بھورا کرنے کی کریم کی بے حد مانگ ہوتی ہے یورپ کے ٹھنڈے ملکوں یعنی سکینڈے نیویا، جرمنی، ولایت وغیرہ میں ہلکی بھوری رنگت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ حامل حال قریب میں ہی ہسپانیہ یا اطالیہ کے حسین ساحلوں کی ریت چھان کر واپس لوٹا ہے اور یہ قابل فخر کارنامہ گنا جاتا ہے۔ قدوی پر چونکہ دھوپ سینکنے کا اثر افریقہ سے واپسی ظاہر کرتا ہے اس لیے "دھوپ میں نہانے" کا ارادہ ترک کر کے ساحل کے سامنے ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ اسی رات کیمپنگ میں پارٹی ہوئی اور خوب دھما چوکڑی مچی بلکہ ہم نے بھی مچائی۔

اگلی صبح تیار ہو کر کیمپنگ سے باہر نکلا تو دروازے پر شہر جانے والی بس تیار کھڑی تھی کشادہ سڑک کے دونوں طرف بلند قامت درختوں کی قطاریں تھیں اور ان سے پرے خوبصورت باغات اور یورپ کے امیر ترین آدمیوں کی شاہانہ رہائش گاہیں تھیں "پلازا ڈیل سینما" کے چوک میں اُتر گیا جہاں ہر سال وینس کا مشہور فلمی میلہ منعقد ہوتا ہے۔ چوک کے ساتھ ہی میونسپل قمار خانے کی عمارت ہے۔ جو باہر سے ہو بہو کلیسا لگتی ہے۔ یورپ میں اکثر قمار خانے میونسپل کمیٹیوں کے تحت چلائے جاتے ہیں، اس طرح پبلک بھی خوش رہتی ہے اور کمیٹی والے تھرڈ ایکس اور بریڑھی ٹیکس کی بدنامی مول لیے بغیر خاصی رقم اکٹھی کر لیتے ہیں، یہاں پر ادھر کا مال صرف اِدھر کے اصول پر سختی سے عمل ہوتا ہے، ویسے شہر والوں کا کچھ نہیں بگڑتا عام طور

پر غریب سیاح ہی مارے جاتے ہیں۔

میں ایک دفعہ مانٹی کارلو کے قمار خانے میں دس دس روپے کے پانچ پیٹھے جیب میں ڈال کر اس شان سے داخل ہوا تھا جیسے آج تو قمار خانے کے بینک کا دیوالیہ پٹا کر ہی باہر نکلوں گا، رُولیٹ کی چند میزوں کا چکر لگانے پر معلوم ہوا کہ ہر کرسی پر یا تو کسی یونانی جہاز راں کمپنی کا مالک بیٹھا ہے اور یا پھر کوئی مہاراجہ جو بوریوں کے حساب سے سو سو روپے کی مالیت کے پیٹھے داؤ پر لگا رہے تھے میں چپکے سے بار میں چلا گیا اور ایک اورنج جوس پیا دو پیٹھے یعنی بیس روپے، سگرٹ خریدے ایک پیٹھہ، باہر نکلتے ہوئے دربان نے سلام کیا تو میں نے باقی دو پیٹھے اس کی نظر کر دیئے' اس نے جھک کر یوں دروازہ کھولا جیسے میں کسی ریاست کا "کراؤن پرنس" ہوں۔

ڈینس کا یہ حصہ جہاں پلازا ڈیل سینما اور قمار خانہ واقع ہے "لیڈو" کہلاتا ہے جس کی سب سے بڑی سڑک سانتا ماریا کے دونوں طرف فیشن ایبل ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی قطاریں ہیں' باقی شہر کے برعکس اس حصے میں کاروں اور بسوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں' سانتا ماریا کے سامنے گھاٹ پر ہر پانچ منٹ بعد "موٹو سکافو" یعنی موٹر بوٹ سان مارکو چوک کے لیے چلتی ہے فاصلہ تقریباً ایک میل کے قریب ہوگا' انتظار گاہ کے ساتھ خودکار ٹکٹ کی مشینیں لگی تھیں۔ میں نے آدھ لیرے کا سکہ سوراخ میں ڈالا تو مشین کے نچلے حصے نے ٹکٹ یوں اُگل دیا جیسے کوئی شرارتی بچہ ببل گم کو پھونک مار کر اپنے ہونٹوں پر پھیلا لے' لیڈو اور سان مارکو چوک کے درمیان بالکل باسفورس ایسی رونق تھی، تیز موٹر بوٹوں اور سیٹمروں کے بیچ سُست رفتار نازک گنڈولے بالکل ساکن لگ رہے تھے' اور ان سے پرے ڈینس کا آبی شہر ایک دیو قامت گنڈولے کی مانند پانی پر جھول رہا تھا، کئی صدیاں پیشتر وینیتی قبیلے کے لوگ وحشی حملہ آوروں سے بچنے کے لیے پہاڑوں اور میدانوں کو چھوڑ کر چند بے آباد ساحلی جزیروں پر آباد ہوگئے، آہستہ آہستہ ان جفاکش کسانوں کی محنت نے ایک ایسے

شہر کو جنم دیا جو اطالیہ کی طاقتور ترین ریاست بن گیا۔ اس کے باشندے تجارت کی خاطر دُنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے، مشرق کو جانے والی تمام اہم آبی شاہراہوں پر اہلِ وینس کا قبضہ تھا، مشرق سے کمائی ہوئی اور متعدد بار لوٹی ہوئی دولت نے نہروں کے کنارے سنگِ مرمر کے محلات اور عالی شان گرجوں کی تعمیر میں مدد دی دولت کے ساتھ فنونِ لطیفہ کو بھی فروغ حاصل ہوا، بیلینی اور ٹنٹیان نے انہی نہروں کے کنارے شاہکار تخلیق کیے۔

ہماری موٹر بوٹ سان مارکو کے گھنٹہ گھر کے سامنے والے گھاٹ پر پہنچ کر رُک گئی اور میں تیز نیچے اُتر کر "ڈوجے محل" کے برآمدے میں چلنے لگا، سامنے سینٹ مارک کا کلیسا تھا جس کے نام پر اس چوک کو پکارا جاتا ہے، وینس کے دو تاجروں نے سینٹ مارک کی لاش کو سکندریہ سے یہاں منتقل کیا اور پھر اس کی قبر کے لیے یہ شاندار کلیسا تعمیر کیا، کلیسا کے مشرقی طرز کے گنبد اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اہلِ وینس قسطنطنیہ کے گرجوں کے گنبدوں سے بیحد متاثر تھے تیرھویں صدی میں ایک قانون بنا دیا گیا جس کے تحت شہر سے باہر جانے والے ہر تاجر کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ سفر سے واپسی پر کلیسا کے لیے کوئی نہ کوئی ساتھ لائے اس قانون کا بہت فائدہ ہوا، کلیسا جو پہلے خالی پڑا تھا دنوں میں طرح طرح کے نوادرات سے پُر ہو گیا، گیلری میں گھوڑوں کے وہ چار مجسمے بھی نصب ہیں جو صلیبی جنگ کے دوران قسطنطنیہ سے لوٹ لائے گئے تھے۔

سان مارکو چوک کے گرد برآمدوں میں بنے ہوئے کئی قہوہ خانے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، اکثر قہوہ خانوں کے اپنے آرکسٹرا ہیں جن کے موسیقار سرِ شام چوک میں کرسیاں بچھا کر کلاسیکی موسیقی کا الاپ شروع کر دیتے ہیں، یہاں خوب رونق تھی، گھنٹہ گھر اور کلیسا کے سامنے خوش پوش اطالوی نوجوانوں کے غول کے غول بے مقصد گھوم رہے تھے، سیاحوں کی ٹولیاں آتیں تو ان میں سے چند ایک اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ان کی گرد

کو ٹٹولتے کسی خوبصورت لڑکی کے پیچھے ہو جاتے، نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہ ہونے پر کمال ڈھٹائی سے سیٹیاں بجاتے واپس آکر اپنے غول میں شامل ہو جاتے، درمیانی عمر کے اطالوی بھی سیڑھیاں پر بیٹھ کر ہر آنے جانے والی سیاح عورت کو ہیٹ اٹھا اٹھا کر سلام کر رہے تھے، یورپ کے ہر بڑے چوک کی طرح یہاں بھی کبوتروں کی بھرمار تھی، جنہیں دیکھ دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنے محلے کی مسجد کے امام یاد آجاتے جن کے پاس میں پڑھنے جایا کرتا تھا ہر جمعہ کی نماز کے بعد وہ غلیل لے کر شاہی قلعہ کی طرف چلے جاتے اور شام تک پانچ چھ کبوتر مار لاتے، ان کبوتروں سے "ماءاللحم" قسم کا کوئی کشتہ تیار کیا جاتا۔ مولوی صاحب اور ان کی غلیل وینس کے سان مارکو چوک میں پہنچ جائیں تو ماءاللحم کے کریٹ تیار کیے جا سکتے ہیں۔

چوک کے احاطے میں سے ایک تنگ دروازہ مرسیریا سٹریٹ کو نکلتا ہے اس تنگ اور بل کھاتی ہوئی گلی کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی نفیس اور دیدہ زیب دکانیں اور سٹور ہیں جن کے شوکیسوں میں اطالیہ کے نرم چمڑے کی مصنوعات، چینی اور گلاس کے بنے ہوئے ظروف، سلک کی ٹائیاں اور دوسری ملبوسات کمال خوبصورتی سے سجی ہیں، دکانوں کے اشتہار اور بورڈ بھی صناعی کا بہترین نمونہ ہیں زیادہ تر خریدار سیاح ہوتے ہیں جنہیں چیز کے ساتھ شوکیس کی سجاوٹ کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے، تمام وینس میں میکانکی ذرائع آمد و رفت کے استعمال پر پابندی ہے شہر کے مختلف حصوں میں آنے جانے کے لیے سٹیمر، سپیڈ بوٹ اور وینس کی پتلی اور لمبی کشتیاں گنڈولے استعمال ہوتے ہیں مرسیریا سٹریٹ کے عین درمیان چلتے ہوئے مجھے بعید الجھن ہوئی، ہر آن یہی دھڑکا لگا رہتا کہ ابھی پیچھے سے مٹھے پنجابی "بچ موڑ توں" کا نعرہ لگے گا اور ٹن ٹن کرتے لاہوری تانگے کا "بم" میری کمر میں آلگے گا۔ انسان اجنبی ماحول میں جا کر بھی اپنے فطری شعور کا تابع رہتا ہے، میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میاں یہ وینس کی مرسیریا سٹریٹ ہے گوالمنڈی کا چوک نہیں جو گھبرائے پھرتے ہو۔ بہر حال تھوڑی دیر میں میں بھی اس شست رو ہجوم کے دوسرے افراد کی طرح بڑے سکون سے گلی کے درمیان

میں چلنے لگا اور گاہے گاہے نفیس شوکیسوں میں بھی تاک جھانک کرنے لگا کچھ دیر اسی طرح بے مقصد گھومنے کے بعد اپنی ضرورت کے لیے ایک نہایت ہی خوبصورت سٹور میں جاکر ٹوتھ پیسٹ اور بلیڈ خریدے تو سیلز گرل ٹائپ کاؤنٹر چھوڑ کر باہر نکل آئی اُس کی کالی بھوری آنکھیں میری لہراتی پوستین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ اور کندھے ہلا ہلا کر مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی اس کی شُدھ اطالوی میری سمجھ سے باہر تھی جب بھی وہ فقرے کے اختتام پر سانس لینے کے لیے رُکتی تو میں کندھے سکیڑ کر مُسکرا دیتا" میرے کچھ پلّے نہیں پڑ رہا"

تھوڑی دیر میں سٹور کی آدھی سیلز گرلز اپنا کام چھوڑ کر ہمارے گرد جمع ہو چکی تھیں ان میں سے ایک صاحبہ نے جنہیں انگریزی میں شُدھ بدھ تھی مترجم کے فرائض سنبھال لیے اور مجھ سے کہنے لگیں کہ اس لڑکی کو تمہارا کوٹ بیحد پسند ہے کیا تم اسے بیچنا پسند کرو گے؟ میری طرف سے معذوری کا اظہار ہوا تو اُدھر سے فرمائش ہوئی کہ میں ذرا پہن کے دیکھ لوں، میں نے پوستین اتار کر لڑکی کو پہنا دی، وہ بالکل گڑیا لگ رہی تھی، کاؤنٹر پر لگے ہوئے قدِآدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے آپ کو مختلف زاویوں سے جانچنے لگی، وہ بالکل چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ اس کے کاؤنٹر کے آگے بیشمار گاہک ہاتھوں میں اپنی ضرورت کی اشیا تھامے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ ایک گاہک نے جو شاید جلدی میں تھا تنگ آکر اُسے ہاتھ کے اشارے سے واپس کاؤنٹر پر آنے کو کہا۔

"منتو" گڑیا نے پلٹ کر بڑے غصّے سے کہا اور پھر ایک بار اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر بڑے اطمینان سے پوستین اُتار کر مجھے واپس کر دی "گراسیا سینور" اس نے اپنا خوبصورت گدگدا ہاتھ آگے کر دیا میں نے ہاتھ ملایا اور جلدی سے باہر آگیا، پوستین میں قراقلی کھال کی ہلکی بُو کے ساتھ گڑیا کے جسم کی بھینی بھینی مہک بھی شامل تھی۔

پوری صبح وینس کی گلیوں اور بازاروں میں گھومنے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر سان مارکو چوک میں آگیا جہاں اب دوپہر ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ رہ گئے تھے، یہ اطالویوں کے

قیلولہ کا وقت تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں "لاانجلو" قہوہ خانے کے باہر برآمدے میں بچھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو مشہور اطالوی کھانے "قیمے اور سویّوں" کا آرڈر دے دیا۔ قہوہ خانے کے اندر شاید اور لوگ بھی ہوں مگر برآمدے میں لگی اکثر میزیں خالی پڑی تھیں سوائے ایک کے جس پر ایک اُدھیڑ عمر اطالوی سُرخ شراب کا گلاس سامنے رکھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا میں نے جیب سے یورپ کا نقشہ نکالا اور اپنے آئندہ سفر کا راستہ طے کرنے لگا۔ وینس سے یورپی ممالک کے لیے تین بڑے راستے نکلتے تھے، پہلا مارسیلز فرانس کے راستے ہسپانیہ، دوسرا پیرس سے گزر کر ولایت تک اور تیسرا سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ڈنمارک اور سویڈن کے راستے ناروے تک جو شمالی یورپ کے آخری کونے پر واقع تھا ان راستوں میں سے مَیں نے آخرالذکر کا انتخاب کیا۔ ولایت اور ہسپانیہ بعد میں دیکھا جائے گا، میں نقشے پر سُرخ لکیریں کھینچنے میں مگن تھا کہ ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک دراز قد بوڑھے نے مجھ سے مُخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس کے ہمراہ درمیانی عمر کی ایک سنجیدہ خاتون اور سنہری بالوں والی ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ غالباً وہ مجھ سے اطالوی میں گفتگو کر رہا تھا۔

"مُعاف کیجئے گا میں اطالوی زبان نہیں جانتا" میں نے خوش دلی سے انگریزی میں جواب دیا۔

"بہت خوب! میں تمہیں اطالوی سمجھ رہا تھا" بوڑھے نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "دراصل میں تم سے ویٹر کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ جانے کہاں چلا گیا ہے" مجھے بھی احساس ہوا کہ وہ "قیمہ اور سویّاں" بھی ابھی تک نہیں آئے۔

"میں قہوہ خانے کے اندر جا کر دریافت کرتا ہوں" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "کہیں قیلولہ کرنے نہ چلا گیا ہو۔"

"شکریہ شُکریہ" بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے اندر جا کر مالک سے بات کی کہ پچھلے پہر اکثر لوگ صرف سستانے کے لیے برآمدے کی کرسیوں پر آ بیٹھتے ہیں اور ویٹر ان کے آرام میں مُخل نہیں ہوتے۔

"آپ باہر تشریف رکھیئے میں آرڈر لینے کے لیے خود حاضر ہوتا ہوں" مالک نے مینو کارڈ ہاتھیں لیتے ہوئے جُھک کر کہا۔ واپس باہر آیا تو بُوڑھے نے مجھے اپنی میز پر بیٹھنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کرلی اور پھر اُس نے اپنا تعارف کروایا" ہم یورپ کے دس دن کے ٹور پر آئے ہوئے ہیں، میں ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔ میرا نام فراسٹ ہے جان فراسٹ، اور یہ ہیں مسز فراسٹ" سنجیدہ خاتون نے مُسکراکر اپنے سر کو ہلکی سی جُنبش دی "اور یہ ہے میری لڑکی ربیکا۔ ہارورڈ میں ہی طالبعلم ہے" میں نے ربیکا کی طرف دیکھا۔ وہ ہماری گفتگو سے بے نیاز ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے سان مارکو چوک کے کبُوتروں کو دیکھنے میں مگن تھی،

"ہیلو" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"ہائے" اس نے بے دِلی سے ماتھے پر پڑی ہوئی سنہری لٹ کو ہاتھ سے ایکطرف کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اپنا تعارف کروایا تو دونوں میاں بیوی نے میرے سفر کے بارے میں بیحد دلچسپی کا اظہار کیا اور لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔ اکیلے سفر کرتے اکتا نہیں جاتے؟ وینس میں کتنے روز ٹھہرو گے؟ امریکہ کیوں نہیں جاتے؟ اتنی دیر میں ویٹر ہمارا کھانا لے آیا اطالوی سویاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں اور کسی طرح کانٹے اور چھُری کی زد میں نہ آرہی تھیں۔ میں نے ربیکا کی جانب دیکھا وہ بڑی بیدلی سے سلاد کا ایک پتا کانٹے پر اٹکائے مُنہ بسورے بیٹھی تھی اس کی نظریں اب بھی کبُوتروں کا پیچھا کررہی تھیں۔

"کاش ہمارے پاس بھی اتنا وقت ہوتا کہ ہم تمہاری طرح یورپ کی سیاحت کرسکتے" خاتون کے لہجے میں تأسف تھا" ہمارے سفری ایجنٹ نے یہ ٹور ترتیب دیا ہے، دس روز میں پانچ یورپی دارالخلافے اور چھٹا وینس۔ آج صبح ہم پیرس میں تھے اور کل روم کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ ربیکا تو اس سفر کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہورہی ہے۔ کیوں ڈارلنگ؟" اس نے پیار سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں ممی" لڑکی نے کبوتروں سے نظریں ہٹائے بغیر تیزی سے جواب دیا، کافی کے بعد بل آیا تو بوڑھے نے میرے انکار پر بھی زبردستی میرے حصّے کی رقم بھی ادا کر دی۔

" تم بُرا نہ مناؤ تو ایک بات کہوں؟" ہم میز سے اُٹھنے لگے تو خاتون نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

" یہ تو بات پر منحصر ہے" میں نے ہنس کر جواب دیا " بہر حال فرمائیے"

" اگر تم آج شام فارغ ہو تو ......" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا " تو پھر تم دونوں اکٹھے شہر کی سیر کے لیے کیوں نہیں چلے جاتے؟ میرا مطلب ہے تم اور ربیکا"

" ممی" لڑکی کے لہجے میں دُرشتی تھی۔

" ربیکا میں نے غلط کہا تھا کہ تم اس سفر کے ہر لمحے سے لُطف اندوز ہوتی رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے سفر کے دوران تم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مسکرائیں ..... آج شام مستنصر کے ساتھ وینس کا خوبصورت شہر دیکھ آؤ تو طبیعت بہل جائے گی۔ کیوں مستنصر؟ اس نے پُر اُمید نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اب جو صورتِ حال پیدا ہوئی وہ میرے لیے قطعی طور پر خوشگوار نہ تھی خاتون اور اس کے خاوند کے شریفانہ برتاؤ کے مدِ نظر میں انکار بھی نہ کر سکتا تھا اُدھر وہ محترمہ منہ پُھلائے بڑی لاپرواہی سے میز سے ڈبل روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے چُن چُن کر کبوتروں کو ڈال رہی تھیں۔

" مجھے تو شاید کوئی اعتراض نہ ہو" میں نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا " مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی بیٹی کو اس پروگرام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔"

" ربیکا پلیز" بوڑھے نے اس گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا

" چلئے جیسے آپ کی مرضی۔ میں شام سات بجے اسی قہوہ خانے میں پہنچ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے نا؟ اس نے اُکتاہٹ سے مجھے پوچھا۔

میں نے بیوقوفوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر انہیں خُدا حافظ کہہ کر واپس کیمپنگ

میں آگیا۔ وینس کی دوپہر قدرے گرم تھی، میں نے اپنا جامۂ غسل تن کیا اور اپنے خیمے کے سامنے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ سمندر کا نمکین پانی بے حد خوشگوار اور فرحت بخش تھا۔ تھوڑی دیر نہانے کے بعد میں اپنے خیمے میں آکر سو گیا۔

میری آنکھ کھُلی تو باہر شام ہو رہی تھی اور پورے سات بج چکے تھے" اوّل تو وہ آنے گی ہی نہیں" میں نے خیمے میں لیٹے لیٹے سوچا" بالفرض محال اگر آ بھی گئی تو ایک اکتائی ہوئی منہ بسورتی لڑکی کے ساتھ شام گزارنا کچھ ایسا خوش آئند خیال نہیں" بہرحال میں وینس کی شام توہر صورت دیکھنا چاہتا تھا اس لیے کیمپنگ کے "استری روم" میں اپنے بھورے کارڈرائے کے کوٹ کو لاہور سے وینس تک کی شکنوں سے پاک کیا۔ سوٹ کے ساتھ سفید رنگ کا ہائی نیک سوئیٹر پہنا اور ریڈو کے گھاٹ سے موٹو سکافو پر بیٹھ کر سان مارکو چوک میں اُتر گیا۔ چوک میں اب پھر خوب رونق تھی۔ اکثریت سیاحوں کی تھی جو مختلف قہوہ خانوں کے برآمدوں میں بجنے والی موسیقی سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ صُبح والے نکمّے اطالوی نوجوان اب بھی اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور سیاح لڑکیوں پر آوازے کس رہے تھے۔ پورا چوک بجلی کے بڑے قمقموں سے روشن کیا گیا تھا، خاص طور پر ڈوجے پیلس اور کلیسا بیحد بھلے لگ رہے تھے' میں لوگوں کی بھیڑ سے بچتا تیز تیز قدم اُٹھاتا لا اینجلو قہوہ خانے تک پہنچا تو برآمدے میں رکھی تمام میزیں سیاحوں سے پُر تھیں۔ یہاں بھی ایک آرکسٹرا پورے زور و شور سے" زوربا دی گریک" کی دُھن بجا رہا تھا۔ میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی لیکن کہیں بھی سنہری بال نظر نہ آئے۔ ربیکا وہاں نہیں تھی۔ میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا کم از کم میں نے تو اپنا فرض پورا کیا اب وہ خاتون جانیں اور ان کی چہیتی لڑکی' میں واپس جانے کے لیے پیچھے مُڑا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔

" تم پورے پینتالیس منٹ دیر سے آئے ہو۔"

موسیقی کا شور مدھم ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے پورا سان مارکو چوک خالی ہو چکا ہے اور

اُس کے بیچ صرف ربیکا کھڑی مُسکرا رہی ہے۔ سُنہری بالوں سے ملتا ہوا پھُولدار لباس اور اس کے اُوپر ہلکا زرد کوٹ پہنے وہ بیحد خوبصورت لگ رہی تھی۔

"دیر سے آنے کی معذرت بھی نہیں کر سکتے؟" اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اوہ بالکل" میں نے قدرے گھبرا کر اس کے بیٹھنے کے لیے ایک خالی کُرسی آگے کر دی۔

"دراصل" اس نے اپنا کوٹ اُتارتے ہوئے کہا "تم صرف ممّی کی وجہ سے مجھ سے ملنے آ گئے ہو؟"

"تم بھی تو اپنی مرضی سے نہیں آئیں" میں نے اُس کا کوٹ لے کر پاس کھڑے ویٹر کو تھما دیا۔

"یہ بات تو نہیں" وہ کُرسی پر بیٹھ کر ماتھے پر پڑی سنہری لٹ کو ہتھیلی سے سمیٹتے ہوئے بولی میری ممی بہت سویٹ ہیں۔ ہم سفر کے دوران جہاں بھی جاتے ہیں ان کی بھرپُور کوشش ہوتی ہے کہ میں اُکتا نہ جاؤں اور خوب خوش رہوں۔ لیکن اس کوشش میں وہ کئی مرتبہ بہت آگے نکل جاتی ہیں جیسا کہ آج دوپہر ہوا۔ تم نے ان کی باتوں سے جانے کیا تاثر لیا ہوگا؟"

"فرض کرو کہ ممّی ڈیڑ کا اس مُلاقات کے طے کرنے میں کوئی ہاتھ نہ ہوتا۔ کیا پھر بھی تم مجھ سے ملنا پسند کرتیں؟"

نہیں کیا؟" میں نے پورے پینتالیس منٹ یہاں تمہارا انتظار کیا" اس نے اپنے لمبے ناخنوں سے سفید میز کے رنگ کو کھُرچتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ہنستی ہوئی شرارت تھی۔

"بات ہوئی نا" میں نے ویٹر سے جواب تک بڑے تحمّل کے ساتھ وہیں کھڑا ہمارے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا ربیکا کا کوٹ واپس لے کر اپنے کندھے پر ڈالا اور کرُسی سے اٹھ کھڑا ہوا "کسی ایسی جگہ چل کر بیٹھا جائے جہاں سکوں ہو۔ یہاں تو لوگوں کے شور اور تیز موسیقی کی وجہ سے بات کرنی بھی مشکل ہو رہی ہے۔"

"بالکل درست" ربیکا نے میری تجویز کو پسند کرتے ہوئے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ویٹر نے

بڑے ادب سے کرسی پیچھے کھینچ لی۔ میں نے پانچسو لیرے کا ایک نوٹ اس کی ہتھیلی میں رکھ دیا۔
"گراسیا سینور" وہ کمر تک جھک گیا۔

ہم ہجوم میں گزر کر کلیسا کی سیڑھیوں کے پاس پہنچے تو وہاں بیٹھے نوجوان اطالویوں میں سے ایک نے میری طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھا اور منہ میں انگلیاں گھسیڑ کر بڑے زور سے سیٹی بجادی۔ ربیکا نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ اور میرے قریب آکر میرا بازو تھام لیا۔ ہم چوک کے دالان میں سے گھستے ہوئے تنگ دروازے سے گزر کر مرسیریا سٹریٹ میں آگئے اور وہاں تھوڑی دیر نفیس شوکیسوں میں جھانکنے کے بعد "گرانڈ کنال" کے سب سے بڑے اور خوبصورت پل ریالٹو کے پاس آ نکلے۔ پل کے پہلو میں نہر کے عین کنارے پر ایک پرسکون قہوہ خانے کو سیڑھیاں جارہی تھیں۔ کنارے پر ہری بھری بیلوں کے جھنڈ میں میزیں لگی تھیں جن پر چند لوگ بیٹھے کافی اور گرانڈ کنال کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم نیچے اترے تو ایک ویٹر نے ہمارا استقبال کیا "بانو سیرا سینور۔ سینوریتا۔ آپ اندر ہال میں بیٹھنا پسند کریں گے یا باہر گرانڈ کنال کے کنارے میز سجادی جائے؟"

"سینوریتا کی پسند؟" میں نے اطالوی ویٹر کی نقل اتارتے ہوئے ربیکا کے سامنے جھک کر کہا۔

"نہر کے کنارے" اس نے سر ایک طرف جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سنہری لٹ پھر ماتھے پر آگئی۔ ہماری میز کے ساتھ ہی ریستورنٹ کا چھوٹا سا گھاٹ تھا جہاں درجنوں نازک — اور سجے ہوئے گنڈولے جھول رہے تھے۔ ان میں سے اکثر ان لوگوں کی ذاتی ملکیت تھے جو ریستوران میں شام کے کھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میز بڑی نفاست اور سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ مرینو کے بنے ہوئے شیشے کے گلدان میں سرخ رنگ کے درجن بھر پھول بڑے قرینے سے ترتیب دیئے گئے تھے ان کے درمیان دو لمبی اور پتلی موم بتیوں کی لو شام کی ہلکی ہوا میں تھرتھرا رہی تھی۔

"آج صبح ہم لوگ مرینو گئے۔ اس چھوٹے سے جزیرے میں چند کاریگر ایک بھٹی اور سامان کے

مذوجزر سے شاہکار تخلیق کر رہے تھے، شیشے کا اتنا خوبصورت کام میں نے کہیں دیکھا" ربیکا نے اپنی لمبی انگلیوں سے گلدان پر اُبھرے ہوئے نقوش کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا" تمہارا کیا خیال ہے مرینو کا بنا ہوا یہ گلدان خوبصورت ہے نا؟"

"ہاں ہے۔ لیکن شاید اتنی خوبصورت انگلیاں مرینو کے کاریگر صدیوں میں بھی تخلیق نہ کر سکیں" اس نے ایک دم گلدان سے ہاتھ کھینچ لیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرا مسرت سے دمک رہا تھا۔

"تم اب اطالویوں کی طرح جھوٹی مگر خوبصورت باتیں کر رہے ہو۔"

"میں صرف خوبصورت باتیں کر رہا ہوں۔"

ریستوران کے ہال کے اندر موسیقاروں نے اطالوی لوک دھنیں چھیڑ دیں۔ ویٹر مینو کارڈ لے کر آیا۔ تمام کھانوں کے نام اطالوی اور فرانسیسی میں لکھے تھے

"سکول میں پڑھی ہوئی تھوڑی بہت فرانسیسی آج کام آئیگی" اس نے مینو کارڈ کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا" سوّیاں اور قیمہ؟ نہیں وہ تو تم نے آج دوپہر کھایا تھا۔ ہاں! مینڈک کی تلی ہوئی ٹانگیں" میں اُبکائی لیتے لیتے بچا۔ فیصلہ چاول کے سوپ اور بھنی ہوئی مچھلی پر ہوا۔

ہمارے سامنے گرانڈ کنال ایک عظیم شاہراہ کی مانند ٹریفک سے پُر تھی۔ کاروں اور بسوں کی بجائے سٹیمر اور گنڈولے لہروں پر رواں تھے۔ فرق اتنا تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران سڑک پار کرنے والوں کو بچانے کا تردد نہیں کرنا پڑتا تھا کبھی کبھار کوئی تیز رفتار سٹیمر گزرتا تو چھلکتی ہوئی لہریں کناروں کو پاٹ کر ہماری میز تلے بچھ جاتیں۔ ربیکا نے اپنے سنہری جوتے اتار کر ویٹر کے حوالے کر دیئے "گیلی زمین کے مَس میں کتنی آسودگی ہے" اس کے ہونٹ لذت کے ایک انجانے احساس کی شدت سے بھنچ گئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کافی منگالی اور دیر تک وہاں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے یوں لگتا تھا جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے سے آشنا ہیں اور یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں ہے، وہ بیحد خوش نظر آرہی تھی۔ آج دوپہر "لا اینجلو" قہوہ خانے میں بیٹھی منہ بسورتی اداس لڑکی

سے یکسر مختلف۔

"آج مینو ڈینس کتنا پھیکا اور بے کیف نظر آ رہا تھا، مجھے سان مارکو چوک کے کبوتر بھی بھدے اور موٹے لگ رہے تھے بالکل ان اطالوی لفنگوں کی طرح جو ہر سیاح لڑکی کے پیچھے تیر کی طرح جاتے ہیں"

"صرف خوبصورت سیاح لڑکی کے پیچھے" میں نے لقمہ دیا۔

"تم اب پھر اطالویوں کی طرح ...." اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور ہنس کا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

موسیقار اب اندر ہال سے فارغ ہو کر ہماری میز کے گرد ہو گئے۔

"سینیوریتا کون سی دُھن سننا پسند کریں گی؟" موسیقاروں کے گنجے اور پستہ قد لیڈر نے وائلن کا سرا ٹھوڑی تلے دبا کر پوچھا۔

"اریوی ڈاچی روما" ربیکا نے مچل کر فرمائش کی۔ گنجے موسیقار نے دوسرے سازندوں کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور تین وائلنوں کی مدھ بھری گونج فضا کو چیرتی ہوئی سارے ماحول پر حاوی ہو گئی دُھن مدھم ہوتی تو گرانڈ کنال کی لہروں کا شور ابھر آتا۔

"یہ تو روم سے جدائی کی دُھن ہے اور تم کل صبح وہاں جا رہی ہو؟"

اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں سنجیدہ ہو گئیں "یہی تو میں بھول جانا چاہتی تھی" اس نے اداس ہو کر کہا "مستنصر تم کل ہمارے ساتھ روم کیوں نہیں چلتے" اس نے ایکدم خلاف توقع میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا، ہم دونوں جی بھر کے روم کی سیر کریں گے۔ صبح کو دیا وینتو میں گھومیں گے۔ پچھلے پہر ہسپانوی زینوں پر بیٹھ کر پھول بیچنے والوں کی صدائیں سنیں گے اور شام کو ... شام کو ہم "تریوی فوارے" کے شفاف پانی میں سکے ڈالیں گے تاکہ ہم دوبارہ روم واپس آئیں کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"یوں لگتا ہے جیسے پچھلی مرتبہ تریوی فوارے" میں ڈالے ہوئے چند سکوں کا اثر ہو گیا ہے اور میں دوبارہ روم جاؤں گا۔"

"تو پھر تم چلو گے نا" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"نہیں ربیکا، وینس کی اس حسین شام نے مجھے ایک لمحہ کے لیے بھلا ہی دیا تھا کہ میں ایک بیاہا ہوں، چاہتے ہوئے بھی میں تمہاری یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔"

"تم شاید مجھے پسند نہیں کرتے" اس نے آہستہ سے کہا اور اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔

"یہ بات نہیں۔ شاید تم ایک مرتبہ اور کہو تو میں سچ مچ تمہارے ساتھ چل دُوں مگر اس سے کچھ نہیں بدلے گا۔ میں کبھی نہ کبھی تو واپس چلا ہی جاؤں گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "میں اب یہاں نہیں بیٹھنا چاہتی" اور پھر مُسکرا کر اس نے گنجے وائلن نواز کا شکریہ ادا کیا "دُھن بیحد خوبصورت تھی" وائلن نواز نے مُسکرا کر سر ہلایا اور ہال کے اندر چلا گیا۔ ہمیں میز سے اٹھتا دیکھ کر گھاٹ پر کھڑے ایک گنڈولے کا مانجھی ہمارے پاس آگیا۔ "سینور اور سینوریتا گنڈولے کی سیر کرنا پسند کریں گے؟" اس نے اپنا گول کناری کا ہیٹ سر سے اوپر کرتے ہوئے پُوچھا۔ گرانڈ کنال میں تیرتے ہوئے چند گنڈولوں کے علاوہ سٹیمروں اور سپیڈ بوٹوں کی آمد و رفت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ٹریفک کی کمی کی وجہ سے پانی کی سطح پُرسکون تھی یہاں پر دستور ہے کہ گنڈولے والے نہر کے کنارے سے گزرنے والے مشہور اور تاریخی عمارتوں کے نام بُلند آواز سے گا کر سُناتا ہے "برنارڈ ومحل دائیں ہاتھ" اس نے تان لگائی "سینی محل بائیں طرف" اس نے ہاتھ ہلا کر سُر میں کہا۔

"یہ کسی طرح چپ نہیں ہو سکتا" ربیکا نے بیزاری سے کہا۔

"میرے ایک پسندیدہ مصنف کے تجربے کے مطابق اس کا علاج ایک سگرٹ ہے" چنانچہ اسے سگرٹ پیش کیا گیا اور وہ فوراً چپ ہو گیا۔

ربیکا ابھی تک کونے میں بیٹھی کُڑھ رہی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے" میں نے قدرے بشاش ہو کر کہا "کہ پورے وینس میں ایک سو پندرہ جزیرے ہیں جنہیں ایک سو ساٹھ نہریں اور چار سو محرابی پُل آپس میں ملاتے ہیں" یہ نادر معلومات بے اثر ثابت ہوئیں اور ربیکا اسی طرح مُنہ پھُلا کر بیٹھی رہی۔ میں نے ہمت نہ ہارتے ہوئے پھر

کوشش کی"، اور پھر نہر کے کنارے شاندار سامنے والے محل میں ہی مارکو پولو نے چین سے واپسی پر ایک شاندار دعوت دی۔ دعوت کے بعد اس نے اپنا بوسیدہ لبادہ اُٹھا تو اس کے اندر بیش قیمت جواہرات ٹنگے تھے اہل وینس اتنی مُدّت بعد اسے پہچان بھی نہ سکے۔

"اس کو بھی تمہاری طرح سیاحت کا خبط تھا" اس نے جل کر کہا۔

"بالکل۔ خوب آدمی تھا" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"تبھی جیل میں جا کر مرا تھا!"

مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہوں۔ اب میرے کڑھنے کی باری تھی، تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا "ناراض ہو گئے ہو؟"

وہ مُسکرا رہی تھی۔

"نہیں تو"

وہ کھسک کر میرے ساتھ آ گئی "مجھے معاف کر دو۔ میں بہت بیوقوف ہوں" ہمارا گنڈولا گرینڈ کنال سے دائیں ہاتھ مُڑ کر ایک چھوٹی سی نہر میں داخل ہو گیا جہاں مکمل تاریکی تھی گنڈولا کوئی موڑ مڑتا تو کہیں کہیں کنارے پر واقع پُرانے مکانوں کی اَدھ کھلی کھڑکیوں میں سے ہلکی روشنی آ رہی ہوتی جس سے تاریکی قدرے کم ہو جاتی۔ قدرے نیچے پل آتے تو گنڈولے والا اپنا لمبا بانس کشتی میں لٹا کر خود جُھک جاتا۔ ہر پُل کی محراب کے وسط میں قدیم وضع کی ایک لالٹین روشن تھی تاکہ کشتیوں کو نیچے گزرنے میں آسانی ہو۔ ڈوجے پیلس کے ساتھ "آہوں کے پُل" کے نیچے سے گزر کر ہم کھلے سمندر میں آ گئے۔ یہاں خنکی نسبتاً زیادہ تھی۔ وہ سرک کر اور قریب آ گئی بغیر آستین کے لباس میں اس کی دُودھیا باہوں سے وینس کے سنگ مرمر کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

"ہم سان مارکو چوک میں اُتر جاتے ہیں وہاں سے تمہارا ہوٹل قریب ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں اس وقت "لیڈو" کے لیے آخری موٹر بوٹ جا چکی ہو گی۔ میں تمہیں وہاں تک





چھوڑ آئی ہوں۔

سمندر کے اس حصے میں لہریں تیز تھیں جن کی وجہ سے مانجھی کو گنڈولا چلانے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی ہمارے پاس سے سیاہ مخمل میں لپٹے چھ گنڈولے بڑی آہستگی سے گزر گئے درمیان والے گنڈولے میں ایک سیاہ تابوت رکھا تھا جس پر پھولوں کی ایک چادر بچھی تھی پانی کی سطح پر تیرتا یہ خاموش اور اداس قافلہ" سان مشل" کے قبرستان کی جانب رواں تھا۔

"وینس میں موت بھی خوبصورت ہے" ربیکا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے

لیڈو کے ساحل پر گنڈولا رک گیا۔

"وینس کی یہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی"

"اور میں..... اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے خنک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" روم کے "ترپوی فوارے" میں سکے ڈال کر دعا کروں گی کہ ہم دونوں پھر وینس میں ہی ملیں۔

میں نے اس کے ماتھے پر پڑی سنہری لٹ کو بڑے پیار سے ایک طرف کیا اور گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر ساحلی دیوار پر آ گیا۔ گنڈولے والے نے اپنے لمبے بانس سے ساحل کی دیوار کو دھکیلا اور گنڈولا واپس سان مارکو کی طرف تیرنے لگا۔

جب موسم بہار میں ابابیلوں کی ڈاریں
"کیپس ترانو" کے ساحل کو واپس لوٹیں گی
یہ وہی دن ہوگا.....
جب تم میرے پاس لوٹ آؤ گے۔"

(ایک اطالوی لوک گیت)

الپس کے آسیب زدہ قصبے

برقی ریل گاڑی ایک فراری سپورٹس کار کی مانند اطالیہ کے شہر میلان کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ تیز رفتار مگر پُرسکون۔ مَیں نے آج صبح وینس سے سوئٹزرلینڈ کے دارالخلافے برن تک کا ٹکٹ کٹا لیا تھا۔ جس کے راستے میں میلان بھی پڑتا تھا۔ یورپ میں ریل کا ٹکٹ تین ماہ کے لیے کارآمد رہتا ہے۔ اس دوران آپ اپنی منزل کے راستے میں کسی بھی مقام پر اُتر سکتے ہیں اور پھر بعد میں وہیں سے سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ مَیں ہمیشہ اس سہولت کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتا تھا جہاں کہیں بھی کوئی قصبہ یا شہر نظر کو بھایا وہیں اُتر گئے۔

اب میرا خیال تھا کہ اگر میلان میں کوئی خاص بات ہوئی تو آج شب وہیں گزرے گی۔ گاڑی دُھند میں لپٹے ہوئے ایک خوبصورت شہر کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی۔ یہ ویرونا تھا۔ "شیکسپیئر کی جولیٹ بھی تو اسی شہر میں رہتی تھی" مجھے خیال آیا" اور ایک جولیٹ اس وقت روم کے "ترِیوی فوارے" میں سکے ڈال رہی ہو گی۔" دُھند اور اُداسی آپس میں مدغم ہو گئے۔

میلان آیا۔ بلند و بالا جدید عمارتوں پر ٹیلی ویژن کے ایریل جنگلی گھاس کی طرح

اُگے ہوئے تھے۔ بے پناہ ٹریفک اور موسلا دھار بارش۔ یورپ کے اکثر بڑے شہر اندر سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں۔ شیشے۔ لوہے اور سیمنٹ کے بنے ہوئے دیوزاد ڈربے جو انسان سے اُس کا بے ساختہ پن چھین کر اُسے ناکارہ کر دیتے ہیں۔ "نہیں یہاں پڑاؤ نہیں ہو سکتا، سوئٹزرلینڈ ہی چلا جائے تو بہتر ہے" مَیں نے سوچا۔

گاڑی جونہی میلان سے باہر نکلی بُلند پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دُھند کا ایک سیلاب چوٹیوں سے اُتر کر نچلی وادیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اطالوی سلسلۂ کوہ الپس تھا۔ اب ہم "جھیل مگوری" کے کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ دُھند سے ڈھکے ہوئے ننھے منے گاؤں آتے اور گاڑی رُکے بغیر فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے گذر جاتی۔ کسی جگہ لمحہ بھر کے لیے دُھند صاف ہوتی تو جھیل کا نیلا پانی اور سرسبز جزیرے نظروں کے سامنے آ جاتے۔

"ڈومسڈولا" کا قصبہ اطالوی اور سوِس سرحد پر واقع ہے۔ کسٹم آفیسرز نے پاسپورٹ چیک کیے اور ہم سوئٹزرلینڈ میں داخل ہو گئے۔ الپس کا سلسلۂ کوہ اب اپنی قومیت بدل کر اطالوی سے سوِس ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی طویل سرنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گاڑی ایک سرنگ سے نکلتی اور دو چار سو گز تازہ ہوا میں سانس لے کر پھر دم سادھے ایک اور سُرنگ میں جا گھستی۔ آخر میں سمپلان سرنگ آئی جس کی لمبائی سَوا بارہ میل ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی گاڑی کی تمام روشنیاں جل اُٹھیں۔ دوسرا سرا آیا تو اکثر مسافر اونگھ رہے تھے۔ مَیں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گاڑی ایک قصباتی سٹیشن کے پلیٹ فارم کے اندر داخل ہو رہی تھی یہ "برگ" تھا۔ سوئٹزرلینڈ کا پہلا قصبہ۔ "برن پہنچنے تک رات ہو جائے گی۔ اور اتنے بڑے شہر میں رات کے وقت رہائش کی جگہ تلاش کرنے میں دِقت ہو گی" مَیں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ "یہ قصبہ خوبصورت ہے کیوں نہ ایک دو روز کے لیے یہیں رُک جاؤں۔" گاڑی کھڑی ہوئی تو میں سامان کا تھیلا کاندھے پر ڈال کر پلیٹ فارم

کوہ الپس



پر اُتر گیا۔ "دفترِ معلومات" سے کیمپنگ کا پتہ پوچھا اور سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا خوبصورت بازار نیم تاریکی میں بارش سے بھیگا کھڑا تھا۔ سوس طرزِ تعمیر کے قدیم چوبی مکان۔ دیدہ زیب دکانیں جو کوہ پیمائی اور برف پر پھسلنے والے سامان سے بھری پڑی تھیں۔ بازار کے خاتمے پر پورے قصبے کو آغوش میں لیے گردن میں بل ڈال دینے والا ایک بلند برف پوش پہاڑ کھڑا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی دھند میں روپوش تھی۔ یکدم ہوا کا ایک سرد تھپیڑا آیا، پھر دوسرا، معلوم ہوا کہ یہاں دن رات ایسی ہی خنک ہوا چلتی رہتی ہے۔

برگ سوئٹزرلینڈ کے بلند ترین پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ الپس میں کوہ پیمائی کیلئے کوہ پیما اپنی مہموں کا آغاز اسی قصبے سے کرتے ہیں۔ بازار سے گذر کر میں ایک ندی کے کنارے چلتا ہوا کیمپنگ تک آ گیا جو اُس سفید ریش پہاڑ کے عین دامن میں واقع تھی جو مجھے سٹیشن سے نظر آیا تھا۔ کیمپنگ کی مالکہ نے بتایا کہ اس موسم میں میں پہلا مسافر تھا جو وہاں قیام کی غرض سے آیا تھا۔ میں نے اپنا خیمہ ندی کے کنارے سیب کے ایک درخت کے تلے نصب کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کیمپنگ کی مالکہ کو مجھے موسم کا پہلا مسافر کہنے کی بجائے پہلے بیوقوف کا خطاب دینا چاہیے تھا۔ تیز ہوا کے تھپیڑے پہاڑ پر جمے گلیشیئر پر سے پھسلتے نیچے کیمپنگ کے میدان میں آتے اور میرے خیمے کو چیرتے مجھے یخ کر جاتے۔ ہراتی پوستین اوڑھ کر سونے سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ تمام رات ٹھٹھرتا رہا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں اپنے خیمے سے باہر آ گیا۔ کیمپنگ کے میدان کی سبز گھاس پر کورے کی سفید تہیں جمی ہوئی تھیں۔ غسل خانے میں گیا تو پانی کاٹنے کو آیا چنانچہ منہ دھونے کی سرد جنگ شہادت کی انگلی بمشکل پانی میں بھگو کر دونوں آنکھوں میں سُرمچو کی مانند پھیر لینے سے ہی جیت لی گئی۔

میں ہراتی پوستین اپنے گرد سختی سے لپٹائے جب ناشتے کے لیے برگ کے قصبے میں آیا تو گنبدوں والے قلعے کے پہلو میں ایک چھوٹے سے قہوہ خانے کے علاوہ سارا بازار

بند پڑا تھا۔ الپس کے دیہاتی لباس میں ملبوس ایک لڑکی قہوہ خانے کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھی میزوں کرسیوں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔

"گُٹن مارگن ہیرن" اُس نے مجھے دیکھ کر کہا اور ایک کرسی آگے کر دی۔

"گڈ مارننگ" مَیں نے ٹھٹھرتے ہوئے جواب دیا۔ بھلا اس کُہر آلود یخ بستہ صُبح میں اچھائی کی کونسی بات تھی۔ "مَیں اندر بیٹھنا پسند کروں گا" مَیں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "باہر سردی ہے۔"

قہوہ خانے کے اندر صورتِ حال بہتر تھی۔ میز پر دھرا مینو کارڈ فرانیسی اور جرمن زبان میں تھا۔ مَیں نے کھانے کے ناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف قیمتوں پر نظر ڈالی۔ پندرہ بیس روپوں سے کم قیمت کا کوئی کھانا نہ تھا۔ ویٹرس ہاتھ میں کاغذ پنسل لیے میرے سر پر کھڑی مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو جو کچھ کھانا ہے جلدی سے کہو مجھے صُبح صُبح اور بھی کام ہیں۔ مَیں نے ایک نظر مینو کارڈ پر درج قیمتوں پر ڈالی اور پھر اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا۔

"ہاں جناب۔ کیا پسند کریں گے؟" اُس نے جھک کر پنسل کا سکّہ کاغذ پر جما دیا۔

"دام بہت ہیں" مَیں نے سر کھجا کر کہا۔

"وہ تو ہیں" اُس نے اکتاہٹ سے جواب دیا اور پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھا تو پھر ٹابلر چاکلیٹ اور الپائن دودھ کی ایک بوتل" مَیں نے سوئٹزرلینڈ میں پیٹ بھرنے کا ارزاں ترین نُسخہ آزمایا۔

"دُودھ کی بوتل؟" پنسل ویٹرس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ یورپ کے اکثر مُلکوں میں دودھ یا تو بچّوں کی غذا کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے اور یا پھر کافی اور چائے کا رنگ بدلنے کے لیے ٹپکایا جاتا ہے۔ دودھ کے لیے میری رغبت یہاں اکثر لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ یہ ویٹرس محترمہ بھی اب اسی مرحلہ سے گذر

رہی تھیں۔

"ہاں دودھ کی بوتل" مَیں نے اُس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "سُنا ہے ایلپس کی گائیں موسمِ بہار میں گھاس کی بجائے وادیوں میں بکھرے ہوئے خوش رنگ پھول کھاتی ہیں اور اُن کے دودھ میں اِن پھولوں کی مہک ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی" اس نے روکھے پن سے کہا "مَیں نے آج تک دودھ نہیں پیا۔"

چاکلیٹ اور دودھ کے ناشتے کے بعد جب مَیں قہوہ خانے سے باہر نکلا تو قصبے کی اکلوتی سڑک پر آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ سکول کے بچّوں کا ایک گروہ چمڑے کی نیکروں اور بھاری اونی سویٹروں میں ملبُوس سامان کے تھیلے کاندھوں پر اُٹھائے ندی کے پُل کے پار جا رہا تھا۔ اُن کا رُخ اُس بل کھاتی سڑک کی طرف تھا جو ایلپس کے بُلند پہاڑوں میں جاتی تھی۔ ایلپس کے دیہاتی کسان چھکڑوں پر دودھ کے کنستر اور سبزیوں کی ٹوکریاں لاد کر قصبے میں لا رہے تھے۔ چھکڑوں کو پستہ قد موٹے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ جن کے نتھنوں سے سردی کی وجہ سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ بازار کی دکانیں اور قہوہ خانے کھل چکے تھے۔ سامنے "ٹورسٹ آفس" کا بورڈ آویزاں تھا۔ مَیں سڑک پار کر کے اندر چلا گیا۔ ایک دُبلی پتلی عینک زدہ لڑکی کاؤنٹر پر بکھرے رسالوں اور کتابچوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ دروازہ کُھلنے کی آواز پر اُس نے سر اُٹھایا اور ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ میرا اِستقبال کیا۔

"گُٹن مارگن" اُس نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "فرمائیے مَیں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

مَیں نے بھی ہونٹوں پر برابر کی پھیکی مسکراہٹ سجائی اور پوچھا۔ "مَیں قصبے اور اس کے گرد و نواح کے قابلِ دید مقامات کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

"برگ کا قلعہ جو پندرھویں صدی میں تعمیر ہوا اور قدیم ٹاؤن ہال" لڑکی نے کاؤنٹر

سے چند رنگین کتابچے اُٹھا کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
برگ کا قلعہ شیشے کی بڑی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا تھا۔ چار گنبدوں والی اِس غیر مؤثر چار دیواری کو قلعے کا پُر ہیبت نام دینا سراسر زیادتی تھی۔ قدیم ٹاؤن ہال بھی یونہی سی عمارت تھی۔

"اور کچھ" مَیں نے "بلند ایلپس" نامی کتابچے کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔
"اِس کے علاوہ کیمپنگ کے ساتھ والی سڑک ایلپس میں گھرے خوبصورت دیہات اور برف کے وسیع تودوں تک جاتی ہے۔ شاید آپ وہاں جانا پسند کریں۔ وہاں کے لیے بسیں سٹیشن کے باہر ہر ایک گھنٹے بعد چلتی ہیں۔"
مَیں سٹیشن کی طرف جانے کی بجائے سیدھا اُس سڑک پر چل دیا جس پر تھوڑی دیر پہلے مَیں نے سکول کے بچوں کو جاتے دیکھا تھا۔ مَیں آج عام ذرائع آمد و رفت کی بجائے "ہچ ہائکنگ" کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا۔
دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب فوجی محاذ سے چند روز کی چھٹی پر گھر کی راہ لیتے تو عام طور پر اُن کی جیب خالی ہوتی۔ وہ اپنے شہر یا قصبے جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر انگوٹھے سے اشارہ کرتے تو احسان مند ہم وطن فوراً اپنی کار روک کر انہیں اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور کسی قسم کے معاوضے کے بغیر جلد از جلد منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے۔ جنگ ختم ہوئی تو اِس طریقِ کار کو شہریوں اور خاص طور پر نوجوان سیاحوں نے اپنا لیا۔ کار یا ٹرک ڈرائیور عام طور پر اِس لیے لفٹ دے دیتا ہے کہ اُسے طویل سفر کے دوران خوشگوار رفاقت کی تلاش ہوتی ہے یا پھر اُن دنوں کی یاد میں جب وہ خود اِسی طریقے سے سفر کیا کرتا تھا۔ اِدھر سیّاح بسوں اور ٹرینوں کے کرایوں سے بچ جاتا ہے۔ "ہچ ہائکنگ" میں فوائد کے ساتھ قباحتیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً آبادی سے دُور سڑک کا کوئی ایسا کنارہ تلاش کرنا جہاں کاریں آسانی سے رُک سکیں۔ منزل پر پہنچنے کی بجائے کسی انجان جگہ پر سفر کا اختتام، لیکن میرے نزدیک

یہ قباحت ہی ہائکنگ کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے اور اِسے باقی تمام ذرائع سفر سے ممتاز کرتی ہے۔ جہاں ایک عام سیاح بس یا گاڑی پر سفر کرتے ہوئے گرد و پیش کی خوبصورتیوں سے بے خبر ایک بڑے شہر سے دوسرے بڑے شہر پہنچ جاتا ہے وہاں "ہچ ہائیکر" گرد و نواح کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ کئی بار انجانے مُلک کے ایسے کونوں اور جھتوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ مُلک کے باشندوں کے ساتھ قریبی رابطہ بے شمار تجربات کو جنم دیتا ہے اگرچہ کبھی کبھی حادثات سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی برس پیشتر جب میں پہلی مرتبہ ہائکنگ کے لیے سڑک کے کنارے کھڑا ہُوا تو مَیں انگوٹھے کا اشارہ دیتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ جانے کوئی ڈرائیور رُکتا بھی ہے یا نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ایکدم ایک دیوزاد ٹرک مجھ سے کچھ فاصلے پر جا رُکا۔ مجھے بالکل یقین نہ آیا کہ وہ میرے لیے ہی رُکا ہے اور میں بھاگ کر اُس میں سوار ہونے کی بجائے وہیں بُت بنا کھڑا رہا۔ مجھے تذبذب میں پا کر ڈرائیور نے ٹرک بیک کیا اور کھڑکی میں سے سر نکال کر بڑے غصّے سے کہنے لگا "کہیں چلنا ہے یا یہاں پر پکنک منانے کیلیے کھڑے ہو؟"

مَیں آج برسوں بعد پھر اس طریقے سے سفر کرنے والا تھا۔ مَیں سڑک کے ایک موڑ کے پاس ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں کاریں باقی ٹریفک راستے میں حائل ہوئے بغیر بڑی آسانی سے رُک سکتی تھیں مگر یہاں مصیبت یہ تھی کہ پہاڑوں میں جانے والی اِس سڑک پر کاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود مجھے کوئی لفٹ نہ ملی۔ میرے بائیں ہاتھ بلند پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا جس کی چوٹیاں دُھند کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر سڑک کے دائیں ہاتھ چند کھیت تھے جن میں بھوسے کی بڑی بڑی گانٹھیں ایک خاص ترتیب سے پڑی تھیں۔ ایک کسان جس نے رنگ برنگے پَروں والا الپائن ہیٹ پہن رکھا تھا ان گانٹھوں کو اُٹھا اُٹھا کر لکڑی کے بنے ہوئے

گودام کی طرف لے جارہا تھا۔ اُسی کھیت کے ایک کونے میں دس بارہ سال کا ایک لڑکا ایک ہاتھ میں پانی کی بالٹی اور دوسرے میں ایک کھُردرا برش لیے بھورے رنگ کے ایک فربہ گھوڑے کو نہلانے میں مصروف تھا۔ کھیت سے بھوسہ اُڑ اُڑ کر لڑکے کے سنہری بالوں میں اٹک جاتا تو وہ برش گھوڑے کی پشت پر رکھ کر اپنے لمبے بالوں میں ایک مرتبہ اُنگلیاں پھیرتا اور دوبارہ کام میں جُت جاتا۔ اِن کھیتوں سے پرے ندی کے کنارے ایک خوش نظر مکان تھا۔ مکان کی کھڑکیوں میں سُرخ رنگ کے پھولوں کے گملے دھرے تھے۔ سیب کے جنگلی درخت صحن سے شروع ہو کر پانی کی سطح تک چلے گئے تھے۔ مکان کا دروازہ کھُلا اور ایک صحت مند عورت ہاتھ میں بالٹی لیے باہر نکلی۔ اُس کی نظریں سامنے سڑک کے موڑ پر پڑیں جہاں مَیں کولہوں پر ہاتھ رکھے اُسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی اور پھر سیب کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی ندی کے کنارے چلی گئی۔ یکایک میرے بہت ہی قریب کار کا ہارن زور زور سے بجا۔ مَیں نے مڑ کر دیکھا تو سفید رنگ کی ایک کار میرے پاس کھڑی تھی۔

"کہاں چلو گے ؟" کار کی ڈرائیور نے پوچھا۔ وہ درمیانی عمر کی ایک خوبصورت عورت تھی

مَیں نے کار کا دروازہ کھولا اور اگلی نشست پر اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"اِس بارے میں ذہن بالکل خالی ہے۔ کہیں بھی اُتار دیجیے گا"

"تمہارا سامان کہاں ہے ؟"

"برگ میں۔ مَیں شام تک واپس چلا جاؤں گا"

"میں "گراقن" کے قصبے تک جا رہی ہوں" اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا "تو میں اُتار دوں گی"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ اِس سے پہلے بھی کبھی اِس طرف آئی ہیں ؟" مَیں نے گفتگو شروع کرنے کی خاطر پوچھا۔

"نہیں۔ کبھی نہیں" اِس کے لہجے میں سوگواری تھی۔

"کیا آپ گرافن میں اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہی ہیں ؟"

"ہاں بچھڑے ہوئے عزیزوں سے" یہ کہتے ہوئے وہ بے حد اُداس ہو گئی۔

نیچے وادی میں اور اُس سے پرے پہاڑوں پر سوئٹزرلینڈ کے دیہی وضع کے گھر "شیلے" بکھرے پڑے تھے۔ یہ گھر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ مجھے یاد آیا کہ پہلے زمانوں میں اِن گھروں کے مکین وادی کے پار اپنے "ہمسایوں" کو ایک خاص طریقے سے پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ لکڑی کے بنے ہوئے گزوں لمبے قرنے کو زور سے پھونکا جاتا اور پوری وادی اِس کی بھیانک آواز سے گونج اُٹھتی۔ ہمسایوں کو میلوں دور قرنے کی آواز کے زیر و بم سے پیغام کا اندازہ ہو جاتا۔ برف باری اور شدید طوفان کے دوران جب پیغام رسانی کے دوسرے وسائل ختم ہو جاتے تو وادی کے لوگ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے قائم رکھنے کے لیے اسی طریقے پر انحصار کرتے۔ اِسے "یوڈلنگ" کہا جاتا ہے۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے اُس کے گرد کے تمام پہاڑوں پر بے پناہ دُھند تھی۔ کہیں جگہ دُھند صاف ہوتی تو قصبوں کے دیدہ زیب کلیساؤں کے سُرخ گنبد نظر آ جاتے۔ بلندی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دُھند میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ہم بھی اِس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ونڈ سکرین کے سامنے دُھند کی لہریں اُٹھ رہی تھیں عورت نے کار کی روشنیاں جلا لیں اور رفتار آہستہ کر دی۔ کبھی کبھی گائیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی سُریلی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی۔ پہاڑ کی کسی ڈھلوان پر چرتی ہوئی گائیں ہماری نظروں سے اوجھل تھیں۔

"گرافن" کے قصبے کے وسیع اور پتھریلے چوک میں عورت نے کار روک لی اور فوارے کے ساتھ کھڑے ایک موٹے دیہاتی سے کچھ دریافت کیا۔ دیہاتی نے کلیسا کے پہلو سے نکلتی ہوئی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔ عورت نے کار اُسی جانب موڑ دی۔ قصبے کے دوسری طرف پہاڑوں پر بے پناہ برف تھی۔ پگھلتی ہوئی برف کا پانی سڑک کی سطح پر بہہ رہا تھا۔

"یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا" عورت نے سڑک پر سے نظریں

ہٹائے بغیر کہنا شروع کیا۔ "آج سے پورے چھ سال قبل رات کے پچھلے پہر وہ سامنے والا برفانی تودہ پہاڑ سے پھسلا اور پورے گاؤں کو اپنی سرد باہوں میں سمیٹ لیا۔ سینکڑوں لوگ برف تلے دب کر ہلاک ہو گئے۔ اُن میں میرا منگیتر بھی تھا۔"

"مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اب میں اُس کی سوگوار خاموشی کا سبب جان چکا تھا۔

"وہ انجینئر تھا اور اس علاقے میں ایک سڑک تعمیر کر رہا تھا۔ حادثے کی خبر سُن کر بیشمار لوگ اس بدقسمت قصبے کو دیکھنے آئے اور مرنے والوں کی آخری رسوم میں شرکت کی۔ میں اپنے آپ کو شادی کے سفید لباس کی بجائے سیاہ ماتمی لباس پہننے پر آمادہ نہ کر سکی اور وہیں جینوا میں اپنے سکول روم میں بیٹھی روتی رہی۔ میں اب بھی اُسی سکول میں پڑھاتی ہوں۔ آج اُس حادثے کی برسی ہے اور میں پہلی مرتبہ اُس کی قبر دیکھنے جا رہی ہوں۔"

کار نے ایک موڑ کاٹا تو دوسری جانب سڑک کے بیچ خطرے کے سُرخ نشان کا تختہ نظر آیا۔ تختے کے ساتھ کھڑے پولیس کے سپاہی نے ہمیں ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کیا۔

"رات کو برف کا ایک تودہ پھسلنے سے سڑک بالکل بند ہو چکی ہے۔ آپ واپس چلے جائیں۔" سپاہی نے کار کی کھڑکی کے قریب آ کر کہا۔

عورت کو شاید سپاہی کی بات کا اعتبار نہ آیا اور وہ کار سے باہر نکل آئی۔ واقعی ہم سے چند گز کے فاصلے پر برف کی ایک دیوار ہمارا راستہ روکے ہوئے تھی۔

"یہاں سے حادثے میں مرنے والوں کا قبرستان کتنی دور ہے؟" عورت چلتی ہوئی برف کے تودے کے پاس پہنچ گئی۔

"کم از کم پانچ میل۔ وہاں پیدل جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ہر طرف برف ہی برف ہے۔"

عورت نے اپنے بائیں ہاتھ کا گرم دستانہ اتارا اور مٹھی بھر برف اُٹھا کر اُسے اپنے

گالوں پر رگڑنے لگی۔

"مادام آپ اِس تودے سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ابھی یہ حرکت میں ہے۔" سپاہی نے آگے بڑھ کر عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے برف کی سفید دیوار کو گھورتی رہی اور پھر کار میں واپس آگئی۔ اُس کے ماتھے پر اور بالوں میں پانی کے قطرے اٹکے ہوئے تھے۔

"اور ہاں مادام" سپاہی نے جُھک کر کھڑکی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "موسم بہار میں جب برف پگھلنے لگتی ہے تو خاص طور پر اِس علاقے میں برف کے تودے پھسلنے لگتے ہیں۔ آپ آئندہ موسمِ گرما میں آئیں۔"

عورت نے رومال سے پانی کے قطرے ماتھے سے پونچھے اور دستانہ پہن کر کار سٹارٹ کر دی اور ہم واپس گرافن آگئے۔ پتھریلے چوک کے فوارے کے پاس ابھی تک وہ موٹا دیہاتی کھڑا تھا۔ ہم کار سے باہر نکلے تو وہ ہمارے پاس آگیا اور عورت سے جرمن میں گفتگو کرنے لگا۔

"یہ دیہاتی کہہ رہا ہے کہ سامنے والا کلیسا حادثے میں مرنے والوں کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔" عورت نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور کلیسا کی جانب چل پڑی۔ مَیں بھی اُسکے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اُس نے کوٹ کی جیب سے ایک سیاہ رومال نکالا اور سر پر اوڑھ کر ٹھوڑی تلے گرہ دے لی۔

"مَیں ذرا اندر جا رہی ہوں" اُس نے مُڑ کر کہا۔ "تم بھی اگر آنا چاہتے ہو تو چلے آؤ۔"

دیودار کی لکڑی کا بنا ہوا کلیسا اندر سے بالکل سنسان اور تاریک تھا۔ اگرچہ اسے تعمیر ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا مگر ابھی تک لکڑی کی کرسیوں اور بنچوں میں سے دیودار کی ہلکی ہلکی مہک آرہی تھی۔ سامنے دیوار پر مقامی باشندوں کا لکڑی سے تراشا ہوا حضرت عیسٰے کا مجسمہ نصب تھا اور اُس کے عین نیچے ایک چوبی تختے پر حادثے میں ہلاک ہونیوالوں

کے نام کندہ تھے۔ عورت نے میز پر پڑے موم بتیوں کے بنڈل سے ایک موم بتی اُٹھائی اور قیمت کی صندوقچی میں ایک سکہ ڈال کر مجسّمے کے قدموں تلے چلی گئی جہاں پہلے سے ہی لاتعداد موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اُس نے اپنی موم بتی روشن کی اور اُسے اُن سب کے درمیان میں رکھ دیا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں خاموش کھڑی رہی اور پھر گھٹنے ٹیک کر سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے عبادت میں مصروف ہوگئی۔

مَیں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی سا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ مَیں اِس عورت کا غم اور تقدّس بانٹنے سے قاصر تھا اِس لیے دبے پاؤں چلتا ہوا باہر آگیا۔ کلیسا کی طرح قصبہ بھی سُنسان پڑا تھا۔ یہاں کی بیشتر آبادی کسانوں پر مشتمل تھی جو صُبح سویرے نچلی وادیوں میں اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے چلے جاتے تھے اور رات گئے لَوٹتے تھے۔ کلیسا کے پہلو میں ایک وسیع اور سرسبز میدان تھا جہاں صرف چند روز پہلے برف کی تہیں تھیں مگر اب سارا قطعہ کروکس، سالویا اور اینی مُون کے الپائن پھولوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ میدان کے عقب میں سوئٹزرلینڈ کی سب سے بلند چوٹی "میٹر ہارن" ایک نوکیلے سینگ کی مانند دُھند اور بادلوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ اِن بلندیوں پر ایک سیاہ اور ہیبت ناک قسم کی خوبصورتی تھی جیسے ایک بے حد حسین عورت کی دِلکش ہنسی میں اُس کے نوکیلے اور خون آلود دانت دِکھائی دینے لگیں۔

"ٹَن۔ ٹَن" کلیسا کا گھڑیال بجنا شروع ہوگیا اور اِس کی گمبھیر آواز گرد کے پہاڑوں اور وادیوں میں گونج گئی۔ "جانے اس گھڑیال کے بجنے میں کس کی موت کا پیغام ہے" مَیں نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ اِن اونچے پہاڑوں میں گھڑیال کی آواز ہمیشہ کسی حادثے یا موت کا پتہ دیتی ہے۔ دُھند جو اَب تک چوٹیوں پر اٹکی ہوئی تھی نیچے قصبے تک آگئی اور تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہوگئی۔ مَیں نے برساتی کا کالر اونچا کر کے گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلیسا کے لمبے برآمدے میں آگیا۔

"میں اُس کی کھوپڑی دیکھ کر آئی ہوں"۔ عورت نے کلیسا سے باہر قدم رکھتے ہی مجھ سے کہا۔

"کھوپڑی!" میں اُچھل پڑا۔ گھڑیال اب زور زور سے بج رہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آج سے چند روز پیشتر حادثے میں مرنے والوں کی قبریں کھود کر اُن کی کھوپڑیاں اِس کلیسا میں رکھ دی گئی ہیں۔ ایلپس میں رواج ہے کہ قبرستانوں کا رقبہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کر سکتا اس لیے جب بھی قبریں زیادہ ہو جائیں تو پُرانی قبروں کھود کر ہڈیاں ایک مشترکہ قبر میں دفن کر دی جاتی ہیں اور کھوپڑیاں قصبے کے کلیسا کے تہ خانے میں واقع ایک خصوصی "کھوپڑیوں کے کلیسا" میں سجا دی جاتی ہیں۔ ہر کھوپڑی پر نام کی چِٹ چسپاں کر دی جاتی ہے۔"

"سُبحان اللہ"

"کیا کہا تم نے؟"

مَیں نے ترجمہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"مَیں نے آج اپنے منگیتر کی کھوپڑی دیکھ لی ہے۔ اب مَیں چین سے زندگی بسر کر سکوں گی"۔ وُہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔

مَیں جب بھی سوئٹزرلینڈ کے خوبصورتی سے ترتیب دیئے ہوئے رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ قبرستان دیکھتا تو دل سے ہُوک اُٹھتی کہ بس ایں جا است۔ آدمی مرے اور ایلپس کے دامن میں کسی نفیس قبرستان میں دفن ہو جائے۔ آج معلوم ہوا کہ یہ سلیقہ آدمی کا مردہ خراب کر کے برقرار رکھا جاتا ہے اور تدفین کے چند سال بعد یار لوگ پیلچے لے کر آدھمکتے ہیں کہ مردہ صاحبان اُٹھیں اور کھیر کھائیں۔ یہاں کے قبرستانوں کی ہری بھری گھاس اور پھولدار جھاڑیوں سے میانی صاحب کی دھول اور کیکر کے درخت بدرجہا بہتر ہیں۔ کم از کم وہاں قیامت تک مُردہ صاحبان کو آرام کرنے کا موقعہ تو مل جاتا ہے۔

"تم چاہو تو مَیں تمہیں واپس برگ بھی لے جاسکتی ہوں کیونکہ مَیں نے آج شام تک ہرصورت جنیوا پہنچنا ہے۔" عورت نے اپنے بیگ سے کار کی چابی نکالتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ"۔ مَیں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن میں ابھی تک کھوپڑیاں ناچ رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔ تم ایک اچھے رفیق ثابت ہوئے ہو" اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "شام ہونے کو ہے بہتر ہے کہ ہم ابھی روانہ ہو جائیں اور مکمّل تاریکی چھانے سے پہلے ہی نیچے وادی تک پہنچ جائیں۔"

بوندا باندی ابھی تک جاری تھی البتہ گھڑیال بجنا بند ہو چکا تھا۔ وہی موٹا دیہاتی جو پہلے فوارے کے پاس کھڑا تھا اب ایک شراب خانے کے برآمدے میں کھڑا ہاتھ میں ایک خوبصورت مگ لیے بارش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم کار میں بیٹھنے لگے تو اُس نے ہماری طرف دیکھ کر مگ والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور مسکرانے لگا۔ یہ بات بے حد حیران کُن تھی کہ گرافن میں مَیں نے سوائے ایک سپاہی کے جو برف کے تودے کے پاس کھڑا تھا اور اِس موٹے دیہاتی کے کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔

واپسی پر صرف اُترائی تھی جو زیادہ پُر خطر تھی۔ دُھند اور بارش کی وجہ سے سڑک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی موڑ پر دُھند زیادہ گہری ہو جاتی تو مَیں کار سے اُتر کر آگے آگے چلنا شروع کر دیتا اور اشارے سے عورت کی رہنمائی کرتا۔ اب تاریکی بھی زیادہ ہو چلی تھی اور ابھی ہم برگ سے کافی فاصلے پر تھے۔ مَیں نے کار کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑک کے ساتھ بائیں ہاتھ پر برف کا ایک عظیم تودہ بالکل جھانک رہا تھا۔ یک دم زور کا دھماکہ ہوا اور ساتھ ہی عورت نے پوری قوت سے کار کی بریک لگا دی۔ دھماکے کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

"ضرور کہیں برف کا تودہ پھسلا ہے۔" عورت نے دوبارہ کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

برگ پہنچ کر اُس نے مجھے سٹیشن کے پاس اُتار دیا اور خود جنیوا جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ مَیں وہاں سے پیدل کیمپنگ کی طرف آرہا تھا کہ سرخ گنبدوں والے قلعے پر نظر پڑی پُرانا اور آسیب زدہ جیسے بدروحوں کا مسکن ہو۔ "ٹن ٹن" ٹاؤن ہال کے گھڑیال نے نو بجائے اور مَیں ٹھٹک گیا۔ قلعے کی جانب دیکھا تو ایک گنبد دُھند میں غائب۔ یاد وحشت۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی دروازے میں سے سیاہ چُغہ پہنے کاؤنٹ ڈریکیولا برآمد ہو جائے گا۔ میرے قدم اور تیز ہو گئے۔ کیمپنگ میں پہنچا تو سیب کے درخت کے نیچے میرے اکلوتے خیمے کے علاوہ پورا میدان سنسان پڑا تھا۔ مَیں ابھی تک اِس کیمپنگ میں آنے والا پہلا مسافر ہی تھا۔ مالکہ اپنا دفتر بند کر کے قصبے کو واپس جا چکی تھی۔ مَیں کپڑے بدلے بغیر ہی اپنے سونے کے تھیلے میں گھس گیا اور زِپ اوپر چڑھا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ساری رات عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ کبھی گھڑیال زور زور سے بجتے اور کبھی کھوپڑیاں دھما دھم میرے خیمے پر برستیں۔ ڈر کے مارے سردی کا احساس بھی جاتا رہا۔ صُبح اُٹھ کر باہر آیا تو خیمے کے ساتھ ساتھ کھوپڑیوں کی بجائے ڈھیروں جنگلی سیب بکھرے پڑے تھے جو رات تیز ہوا چلنے سے درخت کی شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے خیمے پر گرتے رہے اور مجھے خواہ مخواہ خوف زدہ کرتے رہے۔ مَیں نے جلدی سے اپنا خیمہ اکھاڑا اور لپیٹ کر سامان کے تھیلے میں رکھ لیا۔ کیمپنگ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میں سیدھا سٹیشن پر آیا، اور سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت بَرن جانے والی پہلی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

برگ سے برن دو گھنٹے کی مسافت پر ہے اور اس دوران گاڑی ایک سرسبز شاداب وادی کے وسط میں سے گذرتی ہے۔ وادی کے آخری کناروں پر برف پوش پہاڑوں کی قطاریں کھڑی ہیں اور ان کے ساتھ پُرسکون نیلی جھیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ شیشے کی بڑی کھڑکی سے پَرے نیلے۔ سفید اور سبز رنگ اِس تیزی سے گذرتے ہیں جیسے کسی رنگین تصویر دار کیلنڈر

کے اوراق خود بخود تیزی سے الٹتے جائیں۔ راستے میں تھن اور انٹرلاکن جیسے خوبصورت شہر آتے ہیں۔ "یینگ فرا" یعنی "نئی دلہن" کی برف پوش چوٹی کا ایک رُخ نظر آتا ہے۔ جھرنوں آبشاروں اور پارے کی مانند چمکتی ندیوں کا تو حساب ہی نہیں۔ زمین کے اِس چھوٹے سے ٹکڑے پر قدرتی نظاروں کی بہتات نے اسے لیزلی سٹیفن کو "پلے گراونڈ آف یورپ" کا نام دینے پر مجبور کر دیا۔ شاید اسے مختصر مصوّری کا ایک شاہکار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ سوئٹزرلینڈ کے حُسن میں نفاست کے ساتھ ساتھ معصومیت اور لڑکپن بھی ہے۔ ایسی نفاست جیسے انسان نے اپنی تفریحِ طبع کے لیے ایک خاص منصوبے کے تحت ترتیب دیا ہو۔ لیکن یہاں وادیٔ نیلم کا وحشی حُسن اور گھمبیرتا مفقود ہے جہاں انسان قدرتی نظاروں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

برن کے سٹیشن پر بے حد گہما گہمی تھی۔ مَیں "دفترِ معلومات" سے کیمپنگ کا پتہ دریافت کر کے سٹیشن سے باہر نکلا تو مجھے یاد آیا کہ فرٹنز بھی برن میں ہی رہتا ہے۔ کئی سال پیشتر وہ مجھے پیرس میں ملا تھا جہاں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ چھٹیاں گذار رہا تھا۔ کچھ عرصہ تو خط و کتابت جاری رہی مگر چند سالوں سے مجھے اُس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ وہ برن میں ہی قیام پذیر ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے۔ سٹیشن کے ہال میں لگے ہوئے فون بوتھ سے مَیں نے انکوائری کا نمبر ملایا اور انہیں فرٹنز کا پتہ بتا کر اُس کے فون نمبر کے بارے میں دریافت کیا۔ نمبر ملنے پر میں نے فون کیا تو دوسری طرف سے آواز آئی "کیپفر انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ" مَیں نے سوچا شاید غلط نمبر مل گیا ہے۔ "یہاں کوئی فرٹنز صاحب کام کرتے ہیں؟" مَیں نے بے دلی سے پوچھا۔ "آپ شاید ہماری کمپنی کے ڈائرکٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔" اُدھر سے جواب آیا۔ "فون انہیں ملا دیں تو پھر پتہ چلے گا۔" مجھے یقین تھا کہ فرٹنز جیسا لاابالی نوجوان نوادرات کی دکان تو کامیابی سے چلا سکتا ہے مگر کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا ڈائرکٹر؟ ناممکن۔

"فرٹنز کیپفر بول رہا ہوں۔" فون میں سے آواز آئی۔

میرا اندازہ غلط تھا فرِٹز واقعی بُرن کی سب سے بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔
"کہاں سے بات کر رہے ہو؟ سٹیشن سے؟ تو پھر وہیں ٹھہرو میں آ رہا ہوں"۔ اُس نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میری آمد پر اُس نے قطعاً حیرت کا اظہار نہ کیا۔ تھوڑی دیر میں فرِٹز اپنی کار میں آگیا اور بڑی گرمجوشی سے ملا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟ کتنی دیر ٹھہرو گے؟ میں نے دفتر سے فون کر کے تمہارے لیے ہوٹل میں کمرہ مخصوص کروا دیا ہے" اُس نے ایک ہی سانس میں لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔

"برگ سے۔ تین روز۔ میں ہوٹل کی بجائے کیمپنگ میں ٹھہرنا پسند کروں گا" میں نے بھی سلسلہ وار جوابات دے دیے۔

"تم شاید اخراجات سے گھبراتے ہو" اُس نے تیزی سے کہا۔ "اس کا فکر مت کرو۔ ہوٹل کا کرایہ میری کمپنی "تفریحی بجٹ" کے کھاتے میں ڈال دے گی۔ یہ بجٹ اگر ہم خرچ نہ کریں تو ویسے ہی ٹیکس کی صورت میں حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے"۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کیمپنگ کے دوران سخت زمین پر سونے کے بعد ایک صاف ستھرے نرم بستر پہ دراز ہونے کا خیال بے حد خوش آئند تھا۔

ہوٹل بُرن کی مشہور سڑک "مارک گاسے" میں واقع تھا۔ صدر دروازے کے باہر لمبے کوٹ اور بو ٹائی میں ملبوس ایک دربان نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا دھول سے اَٹا ہوا سامان کا تھیلا اُس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور ہم دونوں ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ "تم جلدی سے تیار ہو جاؤ میرے والدین اور چھوٹی بہن تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ تمہیں ٹریلیا تو یاد ہے نا؟"

ہم کمرے میں پہنچے تو فرِٹز نے دربان کو بخشیش دے کر دروازہ بند کر دیا۔ "شاید تم نے سُنا نہیں ٹریلیا یاد ہے نا؟" اُس نے میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ کہا۔ دراصل میں ٹریلیا کو ہی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر یکایک میری نظروں میں

آج سے کئی برس پیشتر کی ایک پستہ قد لڑکی گھوم گئی۔ کالے بال۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بالکل ہوس نہ لگتی تھی۔ بلا کی پھرتیلی اور عجائبات و نوادر جمع کرنے کی شوقین۔ پیرس میں سارا وقت فلی مارکیٹ کے کھوکھوں میں الا بلا ڈھونڈتے گذارتی۔ "ژیلیا کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیسی ہے وہ؟"

"قدرے موٹی ہو گئی ہے۔ دو ماہ کے لیے شادی شدہ بھی رہی ہے اور اب میری بزنس پارٹنر بھی ہے۔"

"ژیلیا اور شادی شدہ؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں سسلی کے ایک نواب گھرانے کے صاحبزادے پر فدا ہو گئی تھیں محترمہ۔ دو روز اکٹھے کھانے پر گئے اور تیسرے دن ناشتے سے پہلے شادی رچالی۔"

"پھر علیحدگی کیسے ہو گئی؟"

"ژیلیا کو سسلی پسند نہیں آیا۔ کہتی ہے وہاں گرد اور گرمی بہت ہے۔ بہر حال تم جلدی سے نہا لو، میں تمہاری تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں۔" اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "کاروبار میں پڑھنے لکھنے کی عیاشی کا موقعہ کم ہی ملتا ہے۔" فرنٹز کی سرخ آنکھیں اور چہرے کی تھکن بتا رہی تھیں کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے سونے کی عیاشی کا موقعہ بھی کم ہی ملتا تھا۔

میں تولیا لے کر غسل خانے میں گیا تو وہاں درجنوں صابن اور جھانوے پڑے تھے۔ ایک کونے میں تولیوں کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ میں نے اپنا تولیہ باہر پھینک دیا اور دروازہ بند کر کے نلکے کی ٹونٹی کھول دی۔ گرم پانی کی دھار نے برگ کے طوفانی تودوں کی خنکی اور سرد ہواؤں کا اثر جسم سے نچوڑ کر رکھ دیا۔

ہوٹل سے نکل کر ہم سیدھے فرنٹز کے دفتر پہنچے۔ دفتر کی جدید سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل پر وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہائش رکھتا تھا۔ اس کے والدین بے حد خلوص

کے ساتھ پیش آئے۔ ٹریلیا میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی سوائے اِس کے کہ وہ اَب عینک لگاتی تھی اور صرف یورپی معیار کے مطابق قدرے موٹی ہوگئی تھی۔ وُہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی بڑی سنجیدگی سے اپنے سٹینو کو کوئی کاروباری خطوط لکھوا رہی تھی میرے "ہیلو" کہنے پر اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ ہلا دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

رات کو فرِٹز اور مَیں بَرن سے چند میل کے فاصلے پر ایک ریستوران میں گئے۔ دریا کے کنارے لگی ہوئی میزوں کے گرد شام کے لباس ملبوس بے شمار مرد اور عورتیں کھانا کھا رہے تھے۔ ماحول بے حد سنجیدہ اور اُکتا دینے والا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے لوگ وہاں صرف کھانے کی خاطر آتے ہیں اور انہیں دریا اور ساتھ والے گھنے جنگل سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنا بھی گوارہ نہ تھا۔ ایک نہایت سنجیدہ اور کرخت قسم کی ویٹرس نے ہمارا آرڈر لیا اور پنجوں کے بَل گھوم کر بغیر مسکرائے واپس چلی گئی۔

"یہ بَرن کا سب سے مہنگا اور بہترین ریستوران ہے لیکن یہاں زندگی مفقود ہے۔ صرف امیر ترین لوگ ہی یہاں کی قیمتوں کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ اِن کمبختوں کی شکلیں تو دیکھو۔ دنیا جہان سے اُکتائے ہوئے کرخت چہرے۔" فرِٹز پر لوزان کے انگوروں سے بنی ہوئی شراب کا اثر ہو رہا تھا جو اُس نے وہاں آتے ہی پینی شروع کر دی تھی۔

"اگر تمہیں یہ جگہ پسند نہیں تو یہاں آنے کی کیا تُک ہے؟" مَیں نے وِسٹی واٹر کی چسکی لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کسی چھوٹے ریستوران میں کھانا کھاتے دیکھا جاؤں تو میرا کاروبار آدھا ہو جائے۔ مجبوری ہے۔"

کھانے کے دوران فرِٹز ایک بوتل اور پی گیا۔

"جتنی میں پی چکا ہوں۔" اُس نے تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا مُنہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس کمبخت مچھلی کو میرے پیٹ میں تیرنا چاہیئے۔"

"بالکل" میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ دراصل میں فرٹز کے اچھے برتاؤ کے باوجود اُس کی رفاقت سے سخت اُکتا چکا تھا۔ وہ اُس ریستوران میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف نہ تھا۔ اُس کے چہرے پر بھی تھکن اور اکتاہٹ کے آثار تھے۔ کھانا کھاتے وقت اُس کا ذہن بھی کاروبار کی پیچیدہ گتھیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

"اوہو میں تو بھول ہی گیا تھا" اُس نے چھری کانٹا میز پر رکھ کر جیب میں سے ڈائری نکال کر ورق پلٹنے شروع کر دیئے۔ "بالکل بھول گیا تھا۔ مجھے کل ایک شپنگ آرڈر کے سلسلہ میں مارسیلز جانا ہے۔ میں ژیلیا سے درخواست کر دوں گا کہ وہ تمہیں برن کی سیر کرائے۔ پلیز بُرا نہ ماننا مجبوری ہے۔" اُس نے ڈائری جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ اُسکی یہ مجبوری کم از کم میرے لیے نہایت خوشگوار تھی۔

دوسری صبح میں ابھی سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔

"ہیلو" میں نے جمائی لے کر چونگے میں کہا۔ "مستنصر بول رہا ہوں"۔

"گڈ لارڈ" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "تم ابھی تک سو رہے ہو۔ فرٹز نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں برن کی سیر کے لیے صبح سویرے ہی لے جاؤں۔ فوراً تیار ہو کر نیچے ڈیسک پر آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔" ژیلیا کا لہجہ اتنا نپا تُلا تھا جیسے کوئی کاروباری تار لکھوا رہی ہو۔ میں کپڑے بدل کر نیچے گیا تو وہ ڈیسک کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا" میں نے معذرت کی۔

"تقریباً ساڑھے بارہ منٹ" اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور مجھ سے بالکل مردوں کی طرح ہاتھ جھٹک کر مصافحہ کیا۔

ہم ہوٹل کے باہر آئے جہاں فٹ پاتھ کے ساتھ اُس کی سفید مرسیڈیز کار کھڑی تھی۔ اگرچہ

آٹھ بج چکے تھے مگر کُہر کی وجہ سے شام کے دھندلکے کا گمان ہوتا تھا۔ سڑک اور دکانوں کے شوکیسوں کی روشنیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ ٹریلیا نے سُرخ اونی لباس پہن رکھا تھا اور وہ تقریباً تقریباً خوبصورت ہی لگ رہی تھی۔ مَیں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ عینک نہیں پہن رکھی۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگی "کار چلاتے وقت مَیں عینک نہیں پہن سکتی۔ اِتنی ساری ٹریفک نظر آتی ہے کہ مَیں بوکھلا جاتی ہوں"۔ وُہ کار نہایت تیز چلا رہی تھی۔ شاید عینک کے بغیر اُسے پوری سڑک بالکل خالی لگ رہی تھی۔

"ریچھ" بَرن کا امتیازی نشان ہے اور اگر اِسے "ریچھوں کا شہر" کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ہوٹلوں، دکانوں اور بڑے چوک میں جھنڈے لٹک رہے ہیں تو اُن پر ریچھ کی تصویر۔ دریا کے کنارے کلیسا کے فوارے کے گرد ریچھوں کے مجسّمے اور پھر نائیڈک پُل کے پاس ایک گڑھے میں سچ مچ کے جیتے جاگتے درجنوں ریچھ جنہیں اہلِ شہر دن رات الا بلا کھلاتے رہتے ہیں۔ یہ شہر ۱۸۴۸ء میں ملک کا صدر مقام قرار پایا۔ وُہ دِن اور آج کا دِن اِس کی ہیئت میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ شہر کے اُفقی خطوط پر آپ کی نظریں جدید وضع کی ہونق عمارتیں دیکھ کر دُکھنے نہیں لگتیں بلکہ یوں گمان ہوتا ہے جیسے ملک کے صدر مقام کی بجائے کسی پُرسکون پہاڑی قصبے میں آنکلے ہوں۔ اب بھی ہر چوک میں پُرانی وضع کے خوبصورت فوارے اور نَل موجود ہیں جہاں آب رسانی کی جدید سہولتیں مروّج ہونے سے پہلے شہر کی عورتیں نہانے دھونے کے علاوہ گھریلو استعمال کے لیے پانی بھرنے بھی آیا کرتی تھیں۔ پُرانے بازاروں میں دکانیں سڑک سے اونچی ہیں اور اُن کے ساتھ لمبے برآمدے ہیں جہاں ایک زمانے میں صرف شاہی خاندان کے افراد کو چلنے کی اجازت تھی۔ عوام کے لیے نشیبی سڑک تھی۔ پورے سوئٹزرلینڈ میں اور خاص طور پر بَرن میں یہ رواج ہے کہ ہر مکان یا فلیٹ کی کھڑکی میں لکڑی کے سفید مستطیل چوکھٹوں میں مٹی اور کھاد ڈال کر سُرخ پھول اُگائے جاتے ہیں۔ ایک خصوصی سوس طرز کے مکان کی کھڑکی کا تصوّر

اِن سُرخ پھولوں کے بغیر ممکن نہیں۔ موسمِ بہار میں پھول صرف گھریلو باغیچوں اور عوامی باغوں میں ہی نہیں کھلتے بلکہ شہر کی ہر کھڑکی سے جھانک رہے ہوتے ہیں۔

پونے بارہ بجے ژیلیا نے کار کا رُخ بڑے گھنٹہ گھر کی جانب موڑ دیا جہاں بے شمار سیاح منہ اُٹھائے گھڑیال کو دیکھ رہے تھے۔

"بارہ بجے یہاں تماشہ ہوتا ہے" ژیلیا نے کار سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

بارہ بجے تو گھڑیال کے پہلو میں ایک کھڑکی کھلی۔ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے ریچھ نکلے اور ٹن ٹن کی آواز پر سر ہلاتے پورا چکر کاٹ کر پھر کھڑکی میں غائب ہو گئے۔ ان کے بعد مُرغے۔ مُرغیاں اور موٹے پادری آئے اور تماشہ دِکھا کر گھڑیال کے اندر چلے گئے۔ بچّوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ "یہ گھڑیال ۱۵۱۷ء میں تعمیر ہُوا تھا"

ژیلیا نے کار سٹارٹ کی اور ہم فیڈرل پیلس کے چوک میں آ گئے۔ اندر گئے تو معلوم ہُوا کہ سوِس پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے اِس لیے سوئٹزرلینڈ کے اکلوتے جنگی ہیرو "ولیم ٹیل" کا مجسمہ دیکھا اور باہر آ گئے۔

اُسی شام ژیلیا نے مجھے اپنے فلیٹ میں کھانے پر مدعو کیا۔ فلیٹ کیا تھا پُورا عجائب گھر تھا۔ دیواروں پر افریقہ کے قبائلی دیوتاؤں کے قدِ آدم مجسّمے۔ مصری فراعنہ کی شبیہیں۔ مراکو کا بنا ہوا چمڑے کا فرنیچر۔ سُرخ ایرانی قالین۔ ڈریزڈن کے چینی ظروف۔ ڈمارک کے میز پوش، بُل فائٹنگ کی درجنوں تصاویر۔ اور پھر بے شمار ساکن اور خاموش گھڑیاں۔ ایک کونے میں ہاتھی دانت کی میز پر مختلف ملکوں کی موسیقی کے ریکارڈ رکھے تھے۔ یہاں تک کہ غسل خانے میں چیکوسلاوکیا کا بلوریں فانوس لٹک رہا تھا۔ ژیلیا کے فلیٹ پر نوادرات کی دکان کا شائبہ ہوتا تھا۔

"کاروبار کے سلسلے میں مجھے اکثر ملک سے باہر جانا پڑتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ مجھے شروع سے ایسی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔" اس نے اپنا کوٹ اُتار کر دیوار پر آویزاں

ہرن کے سینگوں پر ٹانگ دیا۔ "تم یہاں بیٹھو میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں" اُس نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ مَیں اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ باورچی خانے میں بھی ایک فانوس لٹک رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم دیر تک موسیقی سُنتے رہے۔

"مَیں سارا دن مشین کی طرح کام کرتی ہوں" ثریلیا کہہ رہی تھی۔ "دفتر سے واپسی پر صرف موسیقی ہی مجھے سکون پہنچاتی ہے اور وُہ بھی خالصتاً مشرقی موسیقی۔ سب سے پہلے ہم نے رومانیہ کی لوک دُھنیں سنیں جن میں مشرقیت جھانکتی اور چلی جاتی۔ پھر مشرقِ وسطیٰ کے نغمے۔ عبدالوہاب کی ترتیب دی ہوئی موسیقی پر عبدالحلیم حافظ اور فیروزہ کی تانیں۔ ایران کا پیراہنِ گُل۔ آخری نغمے نے مجھے چونکا دیا۔ 'جب سے گئے پیا لاگے ناہیں اکھیاں' نورجہاں نغمہ سرا تھی۔

"تمہیں بھی نورِ جی ہان پسند ہے" ثریلیا نے پوچھا۔

"صرف پسندیدگی تو نہایت عام ساجذبہ ہے" مَیں نے ہنس کر جواب دیا۔ اجنبی ماحول میں اس جانی پہچانی آواز نے وطن سے دُوری کا احساس اور بھی شدید کر دیا۔

"مجھے اب چلنا چاہیے" مَیں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا ارادہ ہے کہ مَیں کل صُبح جرمنی کے لیے روانہ ہو جاؤں۔"

"مَیں تمہیں ہوٹل تک چھوڑ آتی ہوں" اُس نے میز پر سے کار کی چابیاں اُٹھائیں اور عینک اُتار کر جیب میں رکھ لی۔ ہوٹل کے صدر دروازے کے باہر کار سے اُترتے وقت مَیں نے ثریلیا کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ وُہ اب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی جو یقیناً کاروباری تھی۔

فرینکفورٹ کا کُبڑا بوڑھا

صنعتِ دوا سازی کی نسبت سے مشہور شہر باسل کے سٹیشن پر تھوڑی دیر رُکنے کے بعد اب ہماری گاڑی جرمن سرحد کی طرف جا رہی تھی۔ مَیں نے برن سے فرائی برگ تک کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ فرائی برگ جرمنی کے خوبصورت ترین علاقے بلیک فارسٹ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ میرا اِرادہ تھا کہ مَیں ایک دو روز بلیک فارسٹ کے کسی چھوٹے سے قصبے میں ٹھہروں اور پھر وہاں سے فرینکفورٹ چلا جاؤں۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں بقیہ سفر کے بارے میں مُبہم سا خاکہ تھا جو اب آہستہ آہستہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔

"ابھی موسمِ بہار کا آغاز ہے جو جرمنی، ڈنمارک اور سویڈن میں بسر ہو جائے گا" میرے ذہن میں یورپ کا نقشہ اُبھر آیا "ناروے اور وہاں سے واپسی پر ہالینڈ، بلجیم اور ولایت کے لیے موسمِ گرما کافی ہو گا اور پھر خزاں کا موسم فرانس اور سپین میں گزرے گا۔" مَیں چاہتا تھا کہ یورپ میں سخت سردی شروع ہونے سے پہلے ہی وطن لوٹ جاؤں۔ نقلِ وطن کرنے والے اُن پرندوں کی مانند جو سردیاں شروع ہوتے ہی واپس آبائی وطن کو پرواز کر جاتے ہیں۔



بلیک فارسٹ (جرمنی)

گاڑی سوئٹزرلینڈ کی سرحد عبور کر کے اب جرمنی اور فرانس کی سرحد پر جارہی تھی۔ یہاں پر گاڑی کی پٹڑی کئی میل تک دونوں مُلکوں کی سرحد کا کام دیتی ہے۔ میرے ڈبّے میں چند جرمن طالب علم بھی سوار تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر مجھے بلیک فارسٹ کا حسین ترین حصہ دیکھنے کا اشتیاق ہے تو فرائی برگ سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک نہایت ہی خوبصورت قصبے میں چلا جاؤں۔ چنانچہ اُن کے مشورے کے مطابق فرائی برگ سٹیشن سے ٹرام پر سوار ہو کر مَیں اُس قصبے میں پہنچ گیا جس کا نام بدقسمتی سے میرے ذہن سے اتر چکا ہے۔ قصبے کی کیمپنگ جنگل کے دامن میں تھی۔ مَیں ایک کونے میں اپنا خیمہ نصب کر کے قصبے کی سیر کو نکل گیا۔

اِس چھوٹی سی دیہی آبادی کی خصوصیت اس کے دیدہ زیب مکان تھے جو زیادہ تر پنشن یافتہ فوجی افسروں اور متموّل بوڑھوں کی ملکیت تھے۔ اِن کے مکین شہر کے شور و غوغا سے تنگ آکر اس پرسکون ماحول میں زندگی کے آخری ایّام گذارنے چلے آئے تھے۔ مکانوں کے گرد باڑھ کی غیر موجودگی میں پوری عمارت اور ملحقہ باغیچے سڑک پر سے نظر آرہے تھے۔ ہر مکان کا طرزِ تعمیر منفرد تھا اور باغیچے کی سجاوٹ میں قرینہ اور نفاست پسندی۔ ایک ایک پتّا اپنی جگہ پر تھا۔ اِس قصبے کے تمام مکان جرمن تنظیم کی بھرپور مثال تھے۔ آبادی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی پرسکون ندی بہ رہی تھی جس پر لوہے کی سلاخوں کے ننّھے منّے پُل بنے ہوئے تھے۔ مَیں ایک پل پر سے گذرا تو وہاں ندی کی سطح قدرے بلند ہونے کی وجہ سے میرے پاؤں بھیگ گئے۔

پُلوں کے ساتھ پانی کی سطح کے قریب پُرانی پن چکیاں رواں تھیں۔ جہاں قصبے کی آبادی ختم ہوتی تھی وہاں سے جَو کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ کھیتوں سے پرے بلیک فارسٹ تھا۔ مَیں ایک تنگ پگڈنڈی پر ہولیا۔ میرا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ جَو کے پودوں کا سنہری رنگ جنگل کے گہرے سیاہ پس منظر سے اور بھرپور ہو گیا تھا۔ آج

صُبح سے ہی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور جنگل کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے اب بارش بھی شروع ہو گئی۔ مَیں نے بھاگ کر ایک اونچے اور گھنے درخت کے تلے پناہ لی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ اِس جنگل کو "بلیک فارسٹ" یعنی "کالا جنگل" کیوں کہا جاتا ہے۔ یہاں پر درخت اتنے بلند اور گھنے ہیں کہ سُورج کی روشنی زمین تک پہنچنے ہی نہیں پاتی اور آپس میں گُتھی ہوئی شاخوں اور پتّوں میں ہی اٹکی رہتی ہے۔ اِس طرح جنگل کے اندرونی حصّوں میں دِن کو بھی شب کی سیاہی کا گماں ہوتا ہے۔ بادلوں کی وجہ سے اب تاریکی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ بارش قدرے کم ہوئی تو مَیں واپس کیمپنگ میں آ گیا۔

دوسری صُبح مَیں فرائی برگ شہر سے باہر فرینکفورٹ جانے والی عظیم شاہراہ "آٹو بہان" کے کنارے لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔

استنبول سے اطالیہ اور سوئٹزرلینڈ تک ریل کے ہوشربا کرایوں نے میرے سفری بجٹ کو خاصے چرکے لگائے تھے اِس لیے مَیں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جہاں تک ممکن ہو سکے ہِچ ہائکنگ پر انحصار کیا جائے۔ خاص طور پر جرمنی میں جو اِس ذریعۂ سفر کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اُس روز جرمنوں کی روایتی "لفٹ نوازی" اپنے عروج پر نہ تھی۔ صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن کسی کار یا ٹرک ڈرائیور نے میرے لیے رُکنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مَیں نے سامان کے تھیلے سے دودھ اور ڈبل روٹی نکالی اور سڑک سے پَرے گھاس پر بیٹھ کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ مَیں اپنا سامان سڑک کے کنارے پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ ڈبل روٹی پر مکھن اور پنیر کی تہ جما کر مَیں نے ابھی پہلا نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ ایک کار میرے سامان کے قریب آ رُکی اور ڈرائیور نے میرا اتا پتہ معلوم کرنے کے لیے زور زور ہارن دینا شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ میں ڈبل روٹی اور دوسرے میں دودھ کی بوتل اُٹھائے مَیں بھاگتا ہوا واپس سڑک پر پہنچ گیا۔

"کہاں چلو گے؟" ڈرائیور کی نشست پر بیٹھے نوجوان جرمن نے پوچھا۔ساتھ والی نشست پر اُس کی بیوی براجمان تھی۔

"فرینکفورٹ" مَیں نے پُر امید نظروں سے جرمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔اُس نے سر کی خفیف جُنبش سے مجھے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔مَیں نے ڈبل روٹی میں سے پنیر نکال کر کھا لیا اور ڈبل روٹی پھینک دی اور پھر دودھ کی بوتل ایک ہی سانس میں پی گیا۔جرمن جوڑا میرے اِس پھرتیلے لنچ سے بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔رومال سے منہ پونچھنے کے بعد میں نے اپنا سفری تھیلا کار کی پچھلی نشست پر رکھا اور ساتھ بیٹھ گیا۔اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ہسپانیہ میں چھٹیاں گذارنے کے بعد واپس ہنوور جا رہے ہیں جہاں وہ دونوں کسی امریکی ادارے میں ملازم ہیں۔ہائیڈل برگ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔دریائے نیکر کے دیدہ زیب پل پر سے گذرے تو نیچے پانی میں شفق کی سُرخی اُتری ہوئی تھی۔دریا کے کنارے بے شمار لوگ چہل قدمی میں مصروف تھے۔اِن میں اکثریت اُن طلبا کی تھی جو مقامی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔پُرانے قلعے کے پہلو میں اور دریائے نیکر کے کنارے ہائیڈل برگ کا شہر پھیلا ہوا تھا جس کی مدح میں علامہ اقبال نے نظمیں لکھیں اور جہاں کی ایک گلی حال میں ہی شاعرِ مشرق کے نام موسوم کی گئی ہے۔ہائیڈل برگ کے بعد جب مائن ہائم آیا تو رات ہو چکی تھی۔اب بارش بھی شروع ہو گئی۔

"ہم آدھ گھنٹے میں فرینکفورٹ پہنچنے والے ہیں" جرمن نے بتایا۔"لیکن رات کے اِس پہر تمہیں ہوٹل کی تلاش میں بے حد دشواری ہو گی"

بارش ایک دم تیز ہو گئی اور کار کے وائپر بڑی تیزی سے ونڈ سکرین پر حرکت کرنے لگے۔آسمان پر بجلی چمکتی تو چوڑی آٹو بہان کی گیلی سطح روشن ہو جاتی۔

"آپ مجھے شہر کے باہر ہی اُتار دیجیے گا۔شب بسری کے لیے میرے پاس خیمہ موجود ہے۔"

"اِس بارش میں کیمپنگ ؟" جرمن کی بیوی نے انگوٹھے سے کار کی چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

"تم اگر پسند کرو تو ہم تمہیں ہنوور تک لے جا سکتے ہیں"۔ جرمن نے پیش کش کی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ مَیں نے تھیلے میں سے برساتی نکالتے ہوئے کہا "بس مجھے یہیں کہیں اُتار دیجیے۔" اُنھوں نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور مجھے اُتار دیا۔ مَیں نے برساتی کے بٹن بند کر کے کالر اوپر کر لیا اور حالات کا جائزہ لیا۔ آٹو بہان پر مکمل تاریکی تھی۔ دُور سے کوئی کار آتی تو بارش کی بوندیں روشنی میں چمکتیں۔ کار گذرنے پر پھر اندھیرا چھا جاتا۔ سڑک کے ساتھ نیچے مجھے ہموار جگہ نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے سوچا کہ یہیں خیمہ لگا کر رات بسر کر لی جائے اور صبح ہونے پر ہی شہر جایا جائے۔ مَیں سڑک کے اونچے کنارے سے اُتر کر کھیتوں میں چلا گیا۔ یہاں بھی تاریکی کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دفعہ بجلی چمکی تو مَیں نے اندازہ لگایا کہ یہاں جگہ ہموار ہے اس لیے خیمہ بخوبی نصب کیا جا سکتا ہے۔ مَیں نے سفری تھیلے میں سے خیمہ نکال کر زمین پر بچھا دیا اور اس کے کونوں میں میخیں گاڑنے لگا۔ ابھی بمشکل خیمے کا ایک حصّہ نصب ہوا تھا کہ مجھ پر ایک کار کی تیز روشنیاں پڑیں۔ مَیں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو عین سامنے ایک کار تیزی سے میری طرف آ رہی تھی۔ کار کی چھت پر سُرخ روشنی کا ایک گولہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ مَیں نے میخیں ٹھونکنے والا ہتھوڑا مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا اور کھڑا ہو گیا۔ کار ایک زوردار جھٹکے سے میرے خیمے کے پاس آ کر رُک گئی۔ دونوں دروازے چوپٹ کھُل گئے اور دو لمبے تڑنگے جرمن فوجی باہر نکل آئے۔ اُن کے کولہوں پہ لٹکے ہوئے پستولوں کے ہینڈل کار کی روشنیوں میں چمک رہے تھے۔ دونوں نے اکڑوں کھڑے ہو کر مجھے سیلوٹ کیا اور پھر جرمن میں کچھ کہا۔

"مَیں جرمن نہیں سمجھتا۔ ڈُش نخ سپر خنرے" مَیں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"سپیک انگلش" ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ مَیں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ اپنا خیمہ یہاں نصب نہیں کر سکتے۔ ممنوع۔ فاربودن"۔

"لیکن وُہ کیوں !"

"وُہ اِس لیے کہ یہ امریکی فوج کی شوٹنگ گراؤنڈ ہے۔ کل صبح سویرے چاندماری شروع ہو جائے گی۔ بینگ ! بینگ ! سمجھ گئے ؟" اور دونوں نے ہنسا شروع کر دیا۔

"بالکل سمجھ گیا" مَیں نے ہکلاتے ہوئے کہا اور کانپتے ہاتھوں سے خیمہ لپیٹنا شروع کر دیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ فوجی پولیس کے اِن جوانوں نے مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا ورنہ دوسرے روز منہ اندھیرے میرا چھوٹا سا خیمہ بڑے مُنہ والے امریکیوں کو کہاں نظر آتا۔ بس سب کچھ بینگ بینگ ہو جاتا۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُنہیں مجھے سڑک سے نیچے اُترتے اور زمین میں کچھ کھودتے دیکھ کر شک ہوا تھا خاص طور پر جب کہ میری شکل و شباہت غیر ملکی تھی۔ بہرحال اُنہوں نے پیش کش کی کہ وہ مجھے کار میں شہر تک لے جائیں گے اور وہاں میرے لیے مناسب رہائش کا بندوبست کر دیں گے۔ ایک فوجی نے میرا سامان اُٹھا کر کار کی ڈکی میں رکھ دیا اور ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کے اِس پہر شہر بالکل سُنسان پڑا تھا سوائے شراب خانوں سے واپس لَوٹتے ہوئے دُھت بوڑھوں کے جو سڑک کے بیچوں بیچ لڑکھڑاتے ہوتے گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے گا رہے تھے۔ اِکا دُکا کار یا ٹیکسی کے علاوہ سڑکیں بھی خالی پڑی تھیں۔

"تم کس قسم کے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند کرو گے ؟" کار چلانے والے فوجی نے مڑ کر مجھ سے دریافت کیا۔

"جس قسم کے ہوٹل میں کرایہ پانچ مارک سے زیادہ نہ ہو" مَیں نے جواب دیا۔

اُنہوں نے متعدد ہوٹلوں کے باہر کار روکی لیکن اکثر میں یا تو جگہ نہ تھی اور زیادہ میرے کرائے کی حد پھلانگ جاتے۔ کافی دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اُنہوں نے کار ایک

تاریک گلی کے فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کی اور ایک فوجی نیچے اُتر کر گلی کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مُسکراتا ہوا واپس آیا اور مژدہ سُنایا کہ ہوٹل کا انتظام ہو گیا ہے۔ کرایہ صرف تین مارک "میرے ساتھ چلے آؤ" میں نے سامان اُٹھایا اور اُس کے پیچھے ہو لیا۔ گلی کے کونے میں لکڑی کا ایک کھوکھا دِکھائی دیا جس کے کواڑوں میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اندر ایک کبڑا بوڑھا لالٹین کی روشنی میں میز پہ جُھکا ایک رجسٹر پہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ فوجی نے بوڑھے کو جرمن میں کچھ ہدایات دیں اور پھر مجھ سے ہاتھ ہلا کر واپس چلا گیا۔ میں کچھ دیر تو وہاں کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کب یہ بوڑھا میری طرف متوجہ ہو اور مجھے بتائے کہ رہائش کا بندوبست کہاں کیا گیا ہے مگر وہ میری موجودگی سے بے خبر رجسٹر پہ جُھکا لکھتا رہا۔

"ہلو، ہوٹل بڑے میاں؟" میں نے اُکتا کر اُس کی میز بجائی۔ لیکن وہ بدستور رجسٹر پر جُھکا رہا۔ تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں بے حد تھک چکا تھا اور جلد از جلد کسی آرام دِہ بستر پر سو جانا چاہتا تھا۔

"نو ہوٹل۔ آئی گو" میں نے غصّے میں کہا اور سامان کا تھیلا اُٹھا کر کمرے سے باہر جانے لگا۔

"ہوٹل۔ یاہ یاہ" بوڑھے نے رجسٹر بند کیا۔ لالٹین اُٹھائی اور کھوکھے کو مُقفّل کر کے مُجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ میں تھکے قدموں سے بوڑھے کُبڑے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جو رجسٹر بغل میں دبائے لالٹین ہلاتا آہستہ آہستہ میرے آگے چلا جا رہا تھا۔ گلی کے آخر میں ایک پُرانا خستہ حال مکان آیا۔ بوڑھے نے پاؤں کی ٹھوکر سے مکان کا زنگ آلود بیرونی دروازہ کھولا اور ایک ویران باغیچے میں سے چلتا ہوا صدر دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ لالٹین سیڑھیوں پر رکھ کر اُس نے کوٹ کی جیب سے چابیوں کا ایک بھاری گُچھا نکالا اور دروازے کا تالا کھول کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پورا مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر پہنچنے پر بوڑھے نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر اپنا سانس درست کیا اور پھر

بائیں ہاتھ پر نیچے تہ خانے کو جاتی ہوئی سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ سیڑھیوں کے خاتمے پر ایک چھوٹی سی تاریک راہداری آئی جہاں کھڑے ہو کر بوڑھے نے لالٹین زمین پر رکھ کر پھر چابیوں کا گچھا جیب سے نکالا اور تہ خانے کا دروازہ کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب طریقے سے مسکرا دیا۔ "ہوٹل۔ تین مارک" اور ساتھ ہی لالٹین زمین سے اُٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کر کے مجھے اندر جانے کو کہا۔ میں دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو اُس نے ایک دم میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ٹھٹک کر پیچھے مڑا۔ "تین مارک" اُس نے بڑے خوفناک لہجے میں کرایہ طلب کیا۔ میں نے سامان کا تھیلا کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھا اور جیب سے تین مارک نکال کر بوڑھے کے حوالے کر دیے۔ اُس نے تینوں سکے احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیے اور لالٹین اُٹھا کر واپس اُوپر چلا گیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر گیا۔ ایک بوسیدہ اور تنگ تہ خانے کی چھت سے زیرو طاقت کا ٹمٹماتا ہوا بلب لٹک رہا تھا۔ تہ خانے کے آدھے حصّے میں چھت تک کوئلے کا انبار تھا اور بقیہ آدھے حصّے میں پہلو بہ پہلو پانچ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر غلیظ قسم کے بُڈھے جرمن سو رہے تھے۔ اُن کے درمیان میں ایک چارپائی خالی تھی اور اُس پہ ایک پھٹی ہوئی گندی چادر بچھی تھی۔ یہ میرا تین مارک کا ہوٹل تھا۔

"ہیلو بلیک بوائے" ساتھ والے بستر پہ لیٹے بوڑھے نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھول کر مجھے خوش آمدید کہا۔ تہ خانے میں کوئلے کی مہک کے علاوہ ایک ناخوش گوار اور تیز قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دم گھٹنے لگا ہو اور میں تہ خانے سے باہر آ گیا۔

"یار کوئی ہے جو روشنی گل کر دے نشے کا ستیاناس ہو رہا ہے۔" بوڑھا بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی منزل پر آ گیا جہاں بوڑھا کبڑا ابھی تک برآمدے میں بیٹھا لالٹین کی روشنی میں رجسٹر پہ جھکا لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے جلدی سے صدر دروازہ کھولا اور ویران باغیچے میں سے بھاگتا ہوا بیرونی

دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے بھاری جوتے کی ایک ہی ٹھوکر سے آہنی دروازہ چوپٹ کھل گیا اور میں باہر گلی میں آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں کسی آسیب سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔ میں نے وقت دیکھا تو دو بجے تھے۔ گلی کو پار کر کے واپس اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں بوڑھے کا کھوکھا واقع تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے ایک ٹیکسی گذری جسے میں نے اشارہ دے کر روک لیا۔ "اپ بُہانوف ہیتے" میں نے ٹیکسی میں سوار ہو کر ڈرائیور کو سٹیشن پر چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی سٹارٹ ہوئی تو میں نے مُڑ کر پچھلے شیشے میں سے گلی کی طرف دیکھا۔ گلی کے آخر میں لالٹین کی مدھم روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ شاید وہی کبڑا بوڑھا میری تلاش میں اُس آسیب زدہ مکان کے باہر آہنی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ ٹیکسی فرینکفورٹ کے سٹیشن کے برآمدے میں کھڑی ہوئی تو کرائے کا میٹر چھ مارک کے ہندسے سے تجاوز کر چکا تھا۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور سٹیشن کے اندر ایک بنچ پر سامان کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے یہ رات دس مارک میں پڑی تھی۔

صُبح سویرے میں سٹیشن سے باہر آ گیا اور قیصر سٹریٹ سے ٹرام پکڑ کر دریائے مائن کے کنارے واقع یوتھ ہوسٹل کے قریب اُتر گیا جس کا شمار دنیا کے بہترین ہوسٹلوں میں ہوتا ہے۔ میں نے وارڈن کو پچھلی شب کی بپتا سُنائی اور اُس نے خاص طور پر ہوسٹل کی دوسری منزل پر میرے لیے ایک صاف ستھرا کمرہ مخصوص کر دیا۔ اگرچہ عام حالات میں یوتھ ہوسٹلوں کے کمرے دن کے وقت سونے کیلیے استعمال نہیں کیے جا سکتے مگر میری شب خیزاری کو مدِنظر رکھتے ہوئے اِس بات کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر شیشے کی بڑی کھڑکی کھول دی۔ دریائے مائن کے مٹیالے پانی میں سامان بردار کشتیاں اور سٹیمر چل رہے تھے۔ دوسرے کنارے پر سیاہ کائی زدہ کلیسا کھڑا تھا جو اس شہر کا علامتی نشان ہے۔ میں اس سے قبل بھی یہاں آ چکا تھا مگر اس شہر نے مجھے کبھی بھی متاثر نہیں کیا۔ جدید عمارتوں کا بارش اور دُھند میں لپٹا ہُوا ایک غیر مؤثر ڈھیر۔ جرمنوں سے پوچھو تو وہ اس کی

مُدرح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ فرینکفورٹ جیسی سیبوں کی شراب اور کہیں نہیں بنتی۔ یہاں کے آنتوں میں مصالحہ دار قیمہ بھرے "ساسج" کی تو پورے جرمنی میں دُھوم ہے اور پھر گوئٹے کا گھر جو ہر جنگ میں مکمّل طور پر تباہ ہو جاتا ہے اور پھر ابتدائی نقشہ نکال کر دوبارہ تعمیر کر لیا جاتا ہے۔ اِس کے بعد جرمنوں کی توصیفی نعت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سارا دِن سونے کے بعد جب شام کو ہوسٹل کے کھانے کے کمرے میں آیا تو وہاں خوب رونق تھی۔ یہاں اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ مَیں نے بھی دوسروں کی پیروی کرتے ہوئے تام چینی کی ایک ٹرے اُٹھائی اور کھانے کے کاؤنٹر کے سامنے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ سبزیوں کا گاڑھا سُوپ۔ گائے کا اُبلا ہُوا گوشت اور کُوٹے ہوئے آلوؤں کا مرکّب خرید کر میں کھڑکی کے پاس ایک میز پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے بدمزہ اور پھیکا کھانا نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ والی کرسیوں پر چند مشرقی چہرے براجمان تھے اور سیاست پر گرما گرم بحث جاری تھی۔

"اپنی سیناکے ٹینک تو انار کلی تک ہو آئے۔ یَس آکھیا" ایک دُبلا پتلا ہندوستانی ستمبر سن پینسٹھ کی جنگ کے بارے میں مُوافشانیاں کر رہا تھا۔

"کھیم کرن کے بارے میں کیا خیال ہے؟" مَیں نے گوشت کے نرم ٹکڑے میں تیز کانٹا گاڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا مطلب . . . . ؟" اُس کا لُقمہ گلے میں ہی اٹک گیا۔

"ہمارے گھر میں جو انار کلی کے پاس ہے تمام ایش ٹریز اُس ہندوستانی طیّارے کے ملبے سے بنی ہیں جسے ہم نے لاہور کے اُوپر مار گرایا تھا۔"

"آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ پاکستانی ہیں۔" اُس نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی دیا۔

"اور میرے دوست فخر زمان کے غسل خانے میں کھیم کرن کے بڑے مندر کی مورتی آویزاں ہے" میں نے کھانے کی ٹرے اُٹھائی اور دوسری میز پر چلا گیا۔ یہاں پر پاکستانیوں کی محفل جمی تھی۔ چند ایک کے سوا باقی سب یورپ میں نوکری کی تلاش میں آئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب اپنی آبائی زمین اور مکان بیچ کر یہاں تک پہنچے تھے اور اُس دن کے انتظار میں تھے جب بیلجیم میں کسی خصوصی کشتی کے انتظام کی اطلاع آئے گی اور وہ وہاں سے ولایت سمگل ہو جائیں گے۔ "جرمن بڑی ایک نمبر جگہ ہے جی!" اُن کی نظریں ساتھ بیٹھی لڑکیوں پر مرکوز تھیں۔ ایک اور صاحب کینیڈا کا واپسی ٹکٹ خریدنے کے چکر میں تھے۔ "واپسی ٹکٹ پر فرینکفورٹ۔ اماوہ درج ہو گا" انہوں نے اپنے منصوبے کے بارے میں رازدارانہ لہجے میں بتایا۔ "اسی میں دو دن کا قیام لنڈن میں رکھوا لوں گا اور پھر وہاں سے غائب۔ براڈ فورڈ میں اپنی پوری برادری رہتی ہے۔" کھانا ختم کر کے پوری ٹولی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "باورچی خانے میں برتن دھونے پر ڈیوٹی لگی ہے" اُنہوں نے بتایا۔ "یہاں صرف دو روز قیام کی اجازت ہوتی ہے۔ زیادہ دن ٹھہرنا ہو تو ہوسٹل کا کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے اور ہم تو پچھلے دو ماہ سے یہاں ہیں۔" شیشے کی بڑی کھڑکی کے باہر صحن میں سوٹ میں ملبوس ایک سکھ جھاڑو دے رہا تھا۔ اُس کو ہوسٹل میں ٹھہرے کچھ زیادہ عرصہ ہی گذر گیا ہو گا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ٹرے اور برتن واپس کیے اور کافی کی پیالی خرید کر اپنی میز پر آ گیا۔

"میں اپنا خون بیچنا چاہتا ہوں۔"

"خون؟" میں نے بوکھلا کر پیالی میز پر رکھ دی۔ میرے سامنے کھڑے فاقہ زدہ ہپّی کا لمبوترا چہرہ بالکل زرد تھا۔

"میں آج ہی یہاں آیا ہوں اور مجھے بلڈ بینک کے دفتر کا پتہ معلوم نہیں۔" اُس نے بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی میں کھجلاتے ہوئے کہا۔

سفر کے دوران آپ کو بے شمار ایسی ہستیوں سے پالا پڑے گا جن کا طریقۂ سفر عام روایات سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ کچھ صرف مانگ تانگ کر جہاں گردی کرتے ہیں اور کئی اپنا خون بیچ کر سفر کا شوق پورا کرتے ہیں۔ یورپ کے سبھی بڑے شہروں میں بلڈ بینک کے ادارے رضاکارانہ طور پر خون دینے والوں کو خاصی معقول رقم ادا کرتے ہیں۔ یعنی خونِ جگر رائیگاں نہیں جاتا اِس کی قیمت پڑتی ہے۔

" بھوک لگی ہے " اب وہ قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنا پیٹ کھجا رہا تھا۔ مَیں نے جیب سے دو مارک نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

" بہت بہت شکریہ " اُس نے جھک کر مجھ سے ہاتھ ہلایا اور جانے لگا۔

" اور ہاں اگر آپ کو خون بیچنا پڑے تو یونان میں سب سے زیادہ قیمت ملتی ہے۔ مَیں وہیں سے آرہا ہوں " اُس نے مُڑ کر مجھے یہ نادر مشورہ دیا۔ میری کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مَیں نے پیالی اُٹھائی اور باورچی خانے کے کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی کو واپس کر دی۔ " تم نے کافی نہیں پی ؟ " اُس نے پیالی اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

" اِس میں خون کی مہک ہے "

وہ شاید اِس قسم کی بے تُکی باتوں کی عادی ہو چکی تھی اِس لیے خاموش رہی۔

" میری قسمت ہی ایسی ہے " مَیں نے ہوسٹل کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوچا۔ " جہاں جاتا ہوں عجیب و غریب شخصیتوں سے پالا پڑتا ہے۔ "



قیصر ولیم میموریل چرچ - برلن - دورُخ

مائک ہلر، ہیلجنیں اور برلن

اُسی رات ایک اور عجیب شخصیت سے ملاقات ہو گئی جو مہنگی ترین سپورٹس کار الفارومیو کا مالک ہونے کی بنا پر غریب تو ہرگز نہ تھی۔ ہوسٹل سے نکل کر میں ساری شام شہر کی پُر ہجوم سڑکوں پہ آوارہ گردی کرتا رہا اور واپسی پہ گوئٹے کے گھر کے ساتھ واقع ایک ریستوران میں کافی پینے چلا گیا۔ میرے سامنے والی میز پہ ایک خوش شکل و خوش پوشاک امریکی نوجوان سیب کی شراب کا مگ ہاتھ میں لیے جرمن ویٹرس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ویٹرس کو کسی اور گاہک نے بُلایا تو اُس نے مگ مُنہ سے لگا کر شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھ کر مُسکرا دیا۔

"فراؤ لائن خوبصورت ہے۔" اُس نے آنکھ سے ویٹرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مَیں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہائے" وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میرا نام مائک ہلر ہے اور میں امریکی ہُوں۔" مَیں نے اپنا تعارف کروایا اور پاکستانی ہونے کا بتایا۔

"پاکستان؟" اُس نے اُنگلی سے گردن کھُجائی۔ "جہاں تک جغرافیے کا تعلق ہے۔

مَیں بالکل اَن پڑھ ہوں۔"

"اَن پڑھ ہونے کی خاصیت امریکیوں میں مُشترک ہے۔"

"وائز گائی (Wise Guy)۔" اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور قیمے اور پیاز کا بنا ہُوا ہیمبر گر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں بھی اپنی کافی پینے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مانک نے رومال سے اپنا مُنہ پونچھا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جرمنی میں سب سے لذیذ ہیمبر گر کہاں بنتے ہیں!"

"ہیمبرگ میں بنتے ہوں گے۔" مَیں نے ہنس کر جواب دیا۔

"ناٹ سو وائز (Not So Wise)" اُس نے خوش ہو کر میز پہ اپنا کانٹا بجایا۔ "اِس بارے میں تم ان پڑھ ثابت ہوئے ہو۔ برلن میں میرے بھائی۔" اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگا۔ پھر یکدم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "چلو گے؟ میرے پاس الفا رومیو کار ہے۔" مَیں نے پوچھا۔ "کہاں؟" تو کہنے لگا "برلن اور آج ہی رات۔"

"ساری۔ مَیں کل ہیمبرگ جا رہا ہوں۔" مَیں نے میز سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اور پھر رات کے وقت اِتنے لمبے سفر پر نکلنا ہی حماقت ہے خاص طور پر جب مشرقی جرمنی بھی راستے میں پڑتا ہو اور میرے پاس ویزا بھی نہیں۔"

"ویزے کا اِنتظام سرحد پر ہو جائے گا۔" وہ میرے ساتھ ہی ریستوران سے باہر آ گیا۔

"مَیں برلن اِس سے پہلے دیکھ چکا ہوں۔"

"برلن ہر سال زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔"

"اور بھئی مجھے ہیمبر گر کھانے کا اتنا بھی شوق نہیں کہ رات کے وقت چار پانچ سو میل کے سفر پر نکل کھڑا ہوں۔" مَیں نے تنگ آ کر کہا۔

"وہ تو صرف مذاق تھا۔" اُس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آج شام مَیں بہر صورت برلن جانا چاہتا ہوں مگر اتنے طویل سفر پہ تن تنہا

جانے کے خیال سے مجھے بے حد دحشت ہو رہی ہے۔ تم ساتھ چلو تو سفر اچھا کٹ جائیگا۔"

پچھلی مرتبہ مَیں برلن کا مشہور عجائب گھر ڈاہلم نہ دیکھ سکا تھا۔ ڈاہلم میں ریمبرانت کی مشہور تصویر "سنہری خود پہنے ہوئے شخص" ٹنگی ہوئی ہے۔ مَیں نے صرف اِس کی فوٹو دیکھی تھی۔ سنہری خود میں سے سچ مچ کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ مَیں نے دریائے ماین کے گندے کنارے کے ساتھ کائی زدہ کلیسا اور اُس سے پرے فرینکفورٹ کی ہوتق عمارتوں پر ایک نظر ڈالی اور برلن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے ہم یوتھ ہوسٹل میں گئے اور وہاں سے میرا سامان لے کر دیر تک بلا مقصد شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ شاید مائک فرینکفورٹ چھوڑنے سے قبل پورا شہر ایک مرتبہ پھر دیکھنا چاہتا ہے لیکن جب ہم بار بار ایک دو سڑکوں کے چکر کاٹتے رہے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ "اب کس کا انتظار ہے؟"

"لڑکیوں کا۔"

"کون سی لڑکیوں کا؟" مَیں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ابھی نہیں معلوم۔ جب ملیں گی تو پتہ چلے گا۔" اور پھر انگوٹھے سے اپنا سینہ ٹھونک کر کہنے لگا "مائک ہلز کو لڑکیوں کے بغیر مالیخولیا ہو جاتا ہے۔"

مائک نے متعدد بار فٹ پاتھ کے کنارے کار روکی اور باہر نکل کر کسی قہوہ خانے میں بیٹھی یا راہ چلتی لڑکیوں کو ایک ہی سوال پوچھتا:

"میرے پاس الفارو میو کار ہے اور مَیں برلن جا رہا ہوں۔ چلیے گا؟" ظاہر ہے اِس بدتمیزی پر اُسے جھڑکیاں ہی پڑتیں مگر وُہ اِس معاملے میں خاصا ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ مائک یقیناً تھوڑا بہت خبطی تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مَیں اُسے چھوڑ کر واپس یوتھ ہوسٹل چلا جاتا تو وہاں بھی جگہ نہ ملتی اس لیے چُپکا بیٹھا رہا اور وُہ ہر چوراہے میں کار کھڑی کر کے اپنی گردان دُہراتا رہا۔ "میرے پاس الفارو میو کار ہے اور مَیں . . . " قیصر سٹریٹ کے پاس جب مائک کار میں بیٹھا فٹ پاتھ پر چلنے والی لڑکیوں پر قسمت آزمائی میں مصروف

تھا اور مَیں مُنہ لٹکائے اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ سٹیشن کی طرف سے ایک سفید فوکس واگن آئی اور ہمارے پہلو میں رُک گئی۔ کار میں سوار چار لڑکیاں شکل و صورت سے غیر ملکی دکھائی دیتی تھیں۔

"معاف کیجیے گا کیا آپ ہمیں فرینکفورٹ کی کیمپنگ کا راستہ بتا سکتے ہیں ؟" ڈرائیور کی نشست پر بیٹھی کالے بالوں والی لڑکی نے مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھا "ہم ابھی ابھی ڈنمارک سے یہاں پہنچی ہیں اور سارے دن کے سفر کے بعد بے حد تھکی ہوئی ہیں"۔ اس سے پہلے کہ مَیں کچھ جواب دیتا، مائیک کار سے نکل کر تیر کی طرح اُن کے پاس پہنچ چکا تھا۔"آپ ڈنمارک کی رہنے والی ہیں ؟"

"نہیں ہم آسٹریلین ہیں اور یورپ کی سیاحت پر آئی ہوئی ہیں" لڑکی نے جماہی لیتے ہوئے کہا "آپ ہمیں کیمپنگ کا پتہ بتا دیجیے مہربانی ہوگی"۔

"کیمپنگ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے آپ ہماری کار کے پیچھے پیچھے چلی آئیں ہم دونوں اُسی جانب جا رہے تھے"۔

لڑکیاں مائیک کی اِس شوُلری سے بے حد متاثر ہوئیں اور اپنی کار ہمارے پیچھے لگا دی۔ مائیک قیصر سٹریٹ سے نکل کر کیمپنگ سے بالکل مخالف سمت میں چل دیا۔

"مائیک کیمپنگ تو ہوسٹل کے ساتھ دریائے ماین کے کنارے پر واقع ہے اور ہم بالکل مخالف سمت میں جا رہے ہیں ؟"

"مائیک ہِلز کو لڑکیوں کے بغیر مالیخولیا ہو جاتا ہے" اُس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر اپنا پرانا مقولا دہرایا۔

اب ہم شہر سے باہر نکل آئے تھے اور ہماری کار تیزی سے چوڑی شاہراہ پر چلی جا رہی تھی۔ ایک دوراہے پر تیز پیلے رنگوں میں لکھی گئیں تختیاں نصب تھیں۔ برلن۔ دائیں طرف۔ ہیمبرگ بائیں طرف۔ مائیک برلن جانے والی شاہراہ پر مڑ گیا، سفید

فوکس واگن بدستور ہمارے پیچھے چلی آرہی تھی۔ شہر سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر پچھلی کار نے اپنی روشنیاں بے تحاشہ جلانی اور بجھانی شروع کر دیں۔ وہ شاید ہمیں رُکنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ مائک نے کار کی رفتار آہستہ کر دی اور سڑک کے ساتھ پارکنگ کی جگہ پر روک لی۔ فوکس واگن بھی ہمارے پاس آرکی اور ڈرائیور اور اس کی ساتھی لڑکی باہر نکل کر مائک پر برس پڑیں۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" ساتھی لڑکی نے غصّے سے کہا "ہم فرینکفورٹ سے تیس میل باہر آچکے ہیں اور کیمپنگ کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔"

"آپ کی ناراضگی بجا ہے محترمہ" مائک نے بڑی سنجیدگی سے جُھک کر کہا "میں خود بھی بے حد حیران ہوں" اُس کا چہرہ افسوس اور پشیمانی کے جذبات سے بھرپور تھا۔ وہ بار بار اپنے سر پہ ہلکی سی چپت رسید کرتا اور بڑبڑاتا:

"پچھلی مرتبہ تو یہیں کہیں تھی۔ جانے کہاں چلی گئی۔" "خواتین" اُس نے چپت مارنے کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کیمپنگ کی جگہ یہیں کہیں تھی۔ شاید ہم نے پچھلا موڑ غلط کاٹا ہے۔" خواتین کے چہرے لٹک گئے۔ "تمام دن سفر کے بعد ہمیں آرام کی سخت ضرورت تھی اب ہمیں شہر واپس جاکر پھر سے کیمپنگ ڈھونڈنا پڑے گی۔" وہ اپنی کار میں بیٹھنے کے لیے واپس مڑیں تو مائک بھی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ساتھ چل دیا۔ کار کی پچھلی نشست پر بقیہ دو خواتین اونگھ رہی تھیں۔

"شہر واپس جاتے اور پھر وہاں رات کے اس پہر کیمپنگ تلاش کرتے آپ کو کافی عرصہ لگے گا۔ اور ہو سکتا ہے کیمپنگ میں آپ کو جگہ بھی نہ ملے۔ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے۔ ہم دونوں شرفا برلن جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلیے۔ کار میں خود چلاؤں گا اور کل شام واپسی پر آپ کو اسی جگہ اُتار دوں گا" مائک نے ایک سانس میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ برلن کے نام پر چاروں خواتین سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

"اوہ نو" کالے بالوں والی نے تجویز یکسر مسترد کر دی۔

"برلن بے حد خوبصورت شہر ہے" مائیک نے لقمہ دیا۔

"ہماری کار کا کیا بنے گا؟" پچھلی نشست پر بیٹھی خاتون نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا

"اسے یہیں پارک کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بالکل محفوظ جگہ ہے۔" سرگوشیاں جاری رہیں۔

"میں نے کہا نا کار میں خود چلاؤں گا اور آپ سب مزے سے سو جائیے گا صبح سویرے ہم برلن میں ہوں گے۔ شہر کی سیر کے بعد فوراً واپسی۔ اتنی دور سے جرمنی آکر برلن نہ دیکھنا سراسر زیادتی ہے۔ کار کی نشستیں بے حد آرامدہ ہیں اور رفتار . . . "

"آپ دونوں اپنی کار میں تشریف رکھیں" کالے بالوں والی نے مائیک کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہم آپس میں مشورہ کر لیں۔"

ہم اپنی کار میں آکر بیٹھے تو مائیک نے مسکراتے ہوئے دو انگلیوں سے دائرہ سا بنا کر ہاتھ ہوا میں لہرا دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب کام بنا ہی چاہتا ہے۔

سرگوشیوں کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تھا۔

"اگر آپ لوگ وعدہ کریں کہ کل شام تک ہم واپس فرینکفورٹ لوٹ آئیں گے تو"

"میڈم" مائیک نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "یہ ایک شریف آدمی کا وعدہ ہے"

لڑکیوں نے چند کپڑے اور کچھ سامانِ آرائش اپنے سامان میں سے نکال کر ایک چھوٹے سوٹ کیس میں رکھ لیا اور فوکس ڈاگن مقفل کر کے ہمارے ساتھ آبیٹھیں۔

"مارگریٹ۔ اینجلا اور جینٹ" کالے بالوں والی نے ساتھی لڑکیوں کا تعارف کروایا" اور میں نونکہ ہوں"

"مائیک اور مستنصر" مائیک نے کار کی چابی گھماتے ہوئے کہا اور ہم چوڑی آٹوبہان پر نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے برلن کی طرف روانہ ہوگئے۔ مائیک کی الفا رومیو واقعی

آرام دہ ثابت ہوئی۔ تیز رفتاری کے باوجود انجن کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑی دیر میں ڈرائیور کے علاوہ سب لوگ سو چکے تھے۔ رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو ہماری کار مشرقی جرمنی کی سرحد پر کھڑی تھی۔ سرحدی محافظ نے ہمارے پاسپورٹ چیک کیے تو وہ ایک ہی کار میں آسٹریلین، امریکی اور پاکستانی مسافر دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ "آپ کار یہیں کھڑی کر دیں اور کسٹم ہاؤس سے مشرقی جرمنی عبور کرنے کے لیے ویزا لگوا لیں" پاسپورٹ بغل میں داب کر وہ کسٹم کی عمارت کی طرف چلا گیا۔ ہم جماہیاں لیتے ہوئے کار سے باہر نکلے تو تھکاوٹ کے ساتھ خنکی کا احساس ہُوا۔ کسٹم ہاؤس کے اندر پہنچے تو ویزا افسر میز پر پاؤں پھیلائے اونگھ رہا تھا اور اُس کے سامنے ایک پُرانا ہیٹر جل رہا تھا۔ محافظ نے پاسپورٹوں کے بنڈل سے میز بجائی تو اُس نے نہایت پُھرتی سے پاؤں کھینچ لیے اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پاسپورٹ پر چسپاں تصاویر دیکھ کر ہماری شناخت کی اور پھر چند فارم پُر کروا کر ویزا کی مُہر لگا دی۔ اِس دوران کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی کسٹم کی وردی میں ملبوس کرخت صورت عورت لڑکیوں کو بُری طرح گھورتی رہی۔ لڑکیاں اُس کی شک بھری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے دیوار پر ٹنگی لینن اور اُلبرخت کی تصاویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔ ویزا لگوا کر ہم واپس کار میں آئے تو جینٹ کا بُرا حال تھا۔ "بڑھیا شکل سے خفیہ پولیس کی کارکن دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ میری طرف ایک قدم بھی بڑھاتی تو میں یقیناً بے ہوش ہو جاتی۔"

مغربی اور مشرقی جرمنی کے درمیان اِس قلعہ نما سرحد کی عمارتیں بے حد ہیبت ناک تھیں۔ ہر سو گز کے فاصلے پر حفاظتی مینار تھے جن پر مشین گنوں سے مسلح محافظ پہرا دے رہے تھے۔ اِن میناروں کے نیچے سڑک پر آہنی پھاٹک تھے جہاں کاغذات دوبارہ یا سہ بارہ چیک کیے جاتے۔ کئی جگہوں پر سڑک کے کنارے سیمنٹ اور لوہے کے دبیز ستون اِس انداز سے ڈھلوان سطح پر رکھے تھے کہ اگر کوئی کار کسٹم ہاؤس اور آہنی پھاٹکوں پر رُکے بغیر

غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنا چاہے تو ایک بٹن دبانے سے ڈھلوان سطح زیادہ ترچھی ہو جائے ستون خود بخود پھسل کر سڑک پر آگریں اور اس طرح فرار کا راستہ مسدود ہو جائے۔

سرحد عبور کرتے ہی نوئلر نے ماہک سے کار روکنے کی درخواست کی۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"یہ نہیں پوچھا کرتے۔" نوئلر نے جھینپ کر کہا۔

ماہک نے کار روک دی اور چاروں لڑکیاں نیچے اتر کر ساتھ والے کھیت میں غائب ہو گئیں۔

"تم نے ان شکلیں دیکھی ہیں؟ ایک بھی کام کی نہیں۔ سب بطخیں ہیں۔" ماہک کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ اُس کا مشاہدہ کسی حد تک درست تھا۔ لڑکیاں شکل و صورت کے لحاظ سے کافی گئی گذری تھیں۔

"کیوں نہ ان کو یہیں چھوڑ جائیں۔" ماہک نے چمک کر کہا۔ "کل صبح چار بطخیں مشرقی جرمنی کے کھیتوں میں قیں قیں کرتی ہوئی خفیہ پولیس کے ہاتھ لگ جائیں تو؟" اور اپنے ہاتھ نشست کی پُشت پر پھیلا کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص خبطی ہے۔ مَیں نے اُسے اِس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور بتایا کہ سرحد پر کار کے داخلے کا جو اجازت نامہ ہمیں دیا گیا تھا اُس پر چھ مسافروں کے نام درج ہیں۔ برلن میں داخلے سے قبل ایک مرتبہ پھر مشرقی جرمنی کی پولیس اس اجازت نامے کو چیک کرے گی تو اُن میں سے چار مسافر غائب ہوں گے اور ظاہر ہے ہم دونوں دھر لیے جائیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ سُرخوں کی مصیبت نہ ہوتی تو خیال بُرا نہ تھا" اُس کی نظریں کھیت پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بدستور قہقہے لگا رہا تھا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے کھیت کے

مختلف کونوں میں سے برآمد ہوئیں اور پھر اکٹھی ہو کر واپس کار میں آ بیٹھیں۔ مائیک نے بمشکل اپنے بے ہنگم قہقہوں پر قابو پایا اور کار سٹارٹ کر دی۔

"بالکل بطخیں" مائیک نے پھر نعرہ لگایا۔

"کیا؟" اینجلا نے اونگھتے ہوئے پوچھا۔

"شکار کی بات ہو رہی ہے۔ بطخیں!"

"آسٹریلیا میں بھی ہوتی ہیں۔"

"وہیں کی بات کر رہا ہوں" اُس نے سڑک سے نظر ہٹا کر چاروں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے اکتاہٹ سے کہا۔ "کیا آپ ایک اونٹ پسند کریں گی؟" مائیک نے جیب سے سگریٹوں کا ایک پیکٹ نکالا۔

"وہ آسٹریلیا میں نہیں ہوتے۔" اینجلا ابھی تک اونگھ رہی تھی۔

"میرا مطلب اونٹ برانڈ کے سگریٹ ہیں۔ کیمل!" اُس نے جھلا کر کہا اور خود ہی سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

ہم برلن کے نواح میں پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ اب رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔

"ہم برلن کے ہلٹن ہوٹل میں ٹھہریں گے" مائیک نے شاہانہ انداز میں ہاتھ لہرا کر فیصلہ دے دیا۔ مجھے استنبول ہلٹن میں کافی کا بل یاد تھا اِس لیے مَیں نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ خواتین کو بھی اِس مہنگی پسند پر اتفاق نہ تھا۔

"آپ لوگ اخراجات کی پرواہ مت کریں۔ ایک آزمودہ نسخے کے استعمال سے تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی" اُس نے بے حد پُراعتماد لہجے میں کہا۔

شہر کے وسط میں سے گذر کر جب ہم ہلٹن ہوٹل کی عالی شان عمارت کے قریب پہنچے تو مائیک نے کار ہوٹل کے پورچ میں لے جانے کی بجائے باہر سڑک پر کھڑی کر دی اور سب لوگوں کے ضروری استعمال کی چیزیں اپنے دو سوٹ کیسوں میں ٹھونس کر

ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ واپس آیا تو اُس کی مُٹھی میں کمرے کی چابی تھی۔ "کمرہ نمبر ۲۰۳" اُس نے چابی اُنگلی پر گھُماتے ہوئے کہا اور پھر بالکل فوجی انداز میں ہمیں ہدایات دینے لگا۔ "سب سے پہلے تم دونوں صدر دروازے کے راستے کمرے تک پہنچ جاؤ" اُس کی مخاطب اینجلا اور جینٹ تھیں۔ "اُس کے بعد مستنصر اور نوبکر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کی مانند ٹہلتے ہوئے اوپر آجائیں اور پھر آخر میں مارگریٹ تم پہلے ہوٹل کے قہوہ خانے میں جا کر ایک پیالی کافی پیو اور بعد میں چُپکے سے اُوپر کھسک آؤ۔ اِس نقل و حرکت کے دوران چال میں خود اعتمادی اور لفٹ بوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا بے حد لازمی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھُلا ہوگا۔"

چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر مائک کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پوری مخلوق ہلٹن ہوٹل کے سنگل کمرہ نمبر ۲۰۳ میں منتقل ہو چکی تھی۔ مائک نے کمرے کے باہر "ڈو ناٹ ڈسٹرب" کی تختی لٹکا دی اور دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ ساتھ ہی ڈیسک کو مطلع کر دیا گیا کہ مسٹر بٹر چونکہ امریکہ سے براہِ راست ابھی ابھی برلن پہنچے ہیں اور سخت تھکے ہوئے ہیں اس لیے آرام کے دوران اُنہیں کسی صورت بھی مُخل نہ کیا جائے۔

"بہت خوب" مائک نے منصوبے کے پہلے مرحلے کی کامیابی پر تسلی سے دونوں ہاتھ ملے اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ "اب اگر ہم پُرسکون رہیں تو ہوٹل کی انتظامیہ کو بالکل خبر نہ ہوگی کہ سنگل کمرے میں چھ افراد قیام کر رہے ہیں۔ کرایہ ساٹھ مارک یومیہ ہے جو ہم آپس میں تقسیم کر لیں گے یعنی آپ لوگ صرف دس مارک میں ہلٹن میں قیام کریں گے۔"

غسل خانے کے اولین استعمال کے لیے خواتین نے اپنی برتری جتائی۔ اُس کے بعد میں تیار ہو کر کمرے سے باہر آگیا۔ حسبِ ہدایت بڑی خود اعتمادی سے لفٹ بوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرایا۔ اُسے ایک مارک ٹِپ بھی دیا اور لابی سے سگریٹ خرید کر ہوٹل سے باہر آگیا۔

برلن میرے لیے یورپ کے اکثر شہروں کی طرح نیا نہیں تھا۔ ۱۹۵۷ء میں روس کی سیاحت سے واپسی پر چند روز مشرقی برلن میں قیام رہا۔ میں روزانہ زمین دوز گاڑی پر سوار ہو جاتا جو بغیر کسی روک ٹوک کے سیدھی مغربی برلن میں آ ٹھہرتی۔ اُن دنوں شہر کے دونوں حصوں کے درمیان آمد و رفت پر کوئی پابندی نہ تھی اور نہ ہی ابھی دیوارِ برلن تعمیر ہوئی تھی جس نے اب شہر کو حقیقی معنوں میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ امریکی صدر کینیڈی نے اِسی دیوار کے سائے میں کھڑے ہو کر "میں بھی برلن کا شہری ہوں" کا نعرہ لگایا تھا۔ امریکی اِسے جیل کی دیوار سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اُدھر مشرقی جرمنی والے اسے سراسر حفاظتی دیوار کا نام دیتے ہیں جو اُن کے مُلک کو امریکی لٹیروں سے بچائے ہوئے ہے۔ اینٹ کے دو سرے عالمی سچائی کے دو مختلف پیمانے بن جاتے ہیں۔ اُن دنوں برلن اپنے چہرے سے جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے داغ مٹانے میں مصروف تھا۔ ۱۹۴۷ء کی آتش زدگی کے بعد جو صورت شاہ عالم دروازے لاہور کی اُبھری تھی وہی حالت برلن کے کوچہ و بازار کی تھی۔ کھنڈرات میں چھوٹے بچے کھیلتے پھرتے یا بوڑھے آوارہ گرد قیمتی اشیا کی تلاش میں راکھ کُریدتے رہتے۔ شہر پہ گرائے ہوئے کئی وزنی بم ابھی تک ملبے میں دبے ہوئے تھے، جو بسا اوقات پھٹ کر جانی نقصان کا باعث بنتے۔ اتحادیوں کی شب و روز کی بمباری نے جنگ سے پیشتر کے حسین اور خوبصورت برلن کو "بھوتوں کے شہر" میں بدل دیا تھا۔ رہی سہی کسر روسیوں نے پوری کر دی۔ مارشل ژوخوف نے برلن پر حملے کا آغاز بیس ہزار توپوں سے کیا تھا جن کی ایک ہی باڑھ سے پورے گاؤں اور گھنے جنگل ملیامیٹ ہو جاتے۔

کُرفرسٹن ڈام کے سرے پہ قیصر ولیم میموریل چرچ کا جلا ہوا ڈھانچا کھڑا تھا۔ کلیسا کے گھڑیال کی سوئیاں ساڑھے سات کے ہندسوں پر نومبر ۱۹۴۳ء سے ساکت ہیں۔ اُس شام برلن پر سینکڑوں من آگ برسی۔ ایک بم کلیسا کے گھڑیال پر بھی گرا اور وقت کی رفتار تھم گئی۔ شہر کی تعمیرِ نو شروع ہوئی تو جلے ہوئے ڈھانچے کو بطورِ یادگار جوں کا توں رہنے دیا گیا۔

حال ہی میں اِس ڈھانچے کے ساتھ ایک جدید کلیسا تعمیر کر دیا گیا ہے۔ جس عظمت اور خوبصورت طرزِ تعمیر کو آگ بھی پوری طرح متاثر نہ کر سکی اُسے برلن والوں نے جدت کی دیوانگی میں خود تباہ کر دیا ہے۔ میں سڑک پار کر کے اُس قطعۂ زمین پہ آگیا جس کے چاروں طرف ٹریفک رواں تھی اور جس پر دونوں کلیسا پہلو بہ پہلو کھڑے ماضی اور حال کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جدید عمارت کے اندر جو ماحول تھا اُس میں انسان کے قدم موسیقی کی لَے پر تھرک تو سکتے ہیں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے کیلئے آگے بڑھکر صلیب کے سامنے جُھک نہیں سکتے۔ یہاں عبادت کرنے کیلئے تخیّل کی پرواز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آرائش بالکل سینما گھروں جیسی۔ شوخ رنگوں کی دیواریں اور ہال میں آرام دہ اور جدید کرسیوں کی قطاریں۔ سامنے حضرت عیسیٰ کا نیا نکور کانسی کا مجسمہ چمک رہا تھا۔ میں سستانے کی غرض سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یکایک آرگن کی تیز موسیقی نے پورے ہال کو لپیٹ میں لے لیا۔ دیواروں اور کرسیوں کی پشت پر نصب شدہ لاؤڈ سپیکروں سے مذہبی موسیقی کی بوچھاڑ مجھے بے حد ناگوار گذری اور میں اُٹھ کر باہر آگیا۔ میں نے پُرانے کلیسا کے جلے ہوئے کھنڈر پر ایک نظر ڈالی جو اَب بھی سیمنٹ اور شیشے کے اس ڈھیر سے کہیں زیادہ وجیہہ اور پُرشکوہ تھا۔

میں اب ڈاہلم میوزیم دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ بُوڈاپیسٹ سٹریٹ سے زیرِ زمین گاڑی میں سوار ہو کر ڈاہلم کے نواحی سٹیشن پر اُتر گیا جہاں سے عجائب گھر تک ایک نہایت پُرفضا اور خوبصورت سڑک جاتی ہے۔ ڈاہلم میوزیم رقبے میں چھوٹا ہونے کے باوجود ریمبرانت، روبن اور وان ڈائک جیسے مصوّروں کے شاہکاروں کی نسبت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ میں کافی دیر ریمبرانت کی تصویر "سنہری خود پہنے ہوئے شخص" کے سامنے کھڑا رنگوں کے حسین امتزاج سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ خود کے سنہری رنگ سے واقعی روشنی کی کرنیں پھوٹتی نظر آرہی تھیں۔ اِس مرتبہ یہ تصویر مجھے برلن کھینچ لائی تھی۔

ڈاہلم میوزیم سے پچھلے پہر واپسی ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں گرُونسٹن ڈام کے ایک ریستوران کے باہر بیٹھ گیا اور ڈنر جیکٹ میں ملبوس ویٹر کو ہیمبرگر سٹیک لانے کو کہا جو

بقول مائک جرمنی بھر میں لذیذ ترین اسی شہر میں تیار ہوتی تھی۔ سٹیک واقعی بے حد خوش ذائقہ تھی مگر قیمے کے اِس جہازی کوفتے کے لیے فرینکفورٹ سے برلن تک کا طویل سفر کسی صورت بھی جائز نہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں میز پر پڑے انگریزی اخبار کو دیکھنے لگا جو وہاں شاید کوئی امریکی چھوڑ گیا تھا۔ پاکستان کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ "کچھ خبر نہ آنا بھی اچھی خبر ہے پیارے" میں نے لنڈن کے مزدور کاکنی کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو تسلی دی۔ ٹن، ٹن۔ سامنے قیصر ولیم کے جدید کلیسا کے گھڑیال نے دو بجنے کا اعلان کیا یعنی اب شام تک فرصت ہی فرصت تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہوٹل واپس جا کر تھوڑی دیر آرام کر لیا جائے مگر مصیبت یہ تھی کہ دن دہاڑے بلا روک ٹوک کمرے تک پہنچ جانا خاصا دشوار کام تھا اور پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مائک کہیں سیر کے لیے چلا گیا ہو۔ "کلیسا اور عجائب گھر دیکھنے کے بعد کہاں جانا چاہیے ؟" میں نے کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سوچا۔ "چڑیا گھر" کہیں سے جواب آیا۔ "برلن کا چڑیا گھر دنیا بھر میں مشہور ہے۔" ریلوے سٹیشن کے عین سامنے چڑیا گھر کا پھاٹک تھا جہاں سکول کے بچوں کے ایک ہجوم کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو کر میں نے ٹکٹ خریدا اور اندر چلا گیا۔

جنگ سے پیشتر اس چڑیا گھر میں چودہ ہزار سے زائد اقسام کے جنگلی جانور تھے جن کی اکثریت برلن کے اکثر شہریوں کی طرح ہوائی حملوں کا شکار ہو گئی۔ اتحادی بمبار طیارے خصوصی طور پر اس چڑیا گھر کو مشقِ ستم بناتے اِسلیے نہیں بناتے کہ انہیں گینڈوں اور مگرمچھوں سے سیاسی اختلاف تھا بلکہ اِس کی وجہ سیمنٹ اور لوہے کا وہ جی۔ٹاور یا حفاظتی مینار تھا جو چڑیا گھر کے پہلو میں واقع تھا۔ یہ عمارت اتنی بڑی تھی کہ ہوائی حملے کے دوران اس کے وسیع تہ خانے میں پندرہ ہزار سے زائد شہری پناہ لے سکتے تھے۔ حفاظتی مینار ایک سو بتیس فٹ بلند تھا اور اِس کی دیواریں آٹھ فٹ سے زیادہ موٹی تھیں۔ چھت پر درجنوں جہاز مار توپیں اور مشین گنیں نصب تھیں۔ چھت سے نچلی منزلوں پر جرمن فوج کے دستے متعین تھے

جن کے لیے ایک ہسپتال اور گولہ بارود کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ مینار کے مضبوط ترین کمروں میں برلن کے عجائب گھروں کے گراں بہا نوادرات اور تصاویر آہنی صندوقچوں میں بند پڑے تھے۔ اِن میں سونے چاندی اور ہیروں کے بنے ہوئے زیورات و ظروف کا مجموعہ "پرائم کا سنہری خزانہ" بھی شامل تھا جو مشہور جرمن ماہرِ آثارِ قدیمہ ہنری سلیمان نے نے قدیم شہر ٹرائے TROY کی کھدائی کے دوران دریافت کیا تھا۔ مینار میں اسلحہ و بارود اور خوراک و پانی کا اتنا ذخیرہ موجود تھا کہ محاصرے کی صورت میں محصورین کم از کم ایک سال تک بیرونی مدد کے بغیر دشمن سے لڑ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ زمینی فوجوں کے داخلے سے قبل اتحادی پائلٹ جرمنی کے دارالسلطنت کے عین درمیان میں واقع اس خطرناک اور ناقابلِ شکست دیو سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے چاہے اِس کوشش میں بندروں اور اُود بلاؤں کی شامت ہی کیوں نہ آجائے۔ مُسلسل بمباری کے باوجود یہ مینار مکمل طور پر تباہ نہ کیا جا سکا اور رُوسی فوجوں کو یہاں شدید مدافعت کا سامنا کرنا پڑا۔ جی ہاں، برلن کی آخری عمارت تھی جس نے روسیوں کے آگے ہتھیار ڈالے۔

چڑیا گھر کا سب سے خوبصورت حِصّہ وہ ہال ہے جس میں استوائی جانور رکھے گئے ہیں۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی سیلاہٹ اور گھٹن کا احساس ہوتا ہے جیسے بارش تھمنے کے بعد حبس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں پر جانوروں کو قدرتی ماحول میسّر ہے۔ درجۂ حرارت اور نمی کو برازیل کے استوائی جنگلات کی سطح پر رکھا گیا ہے۔ کیلے کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لمبی دُموں والے رنگ برنگے پرندے ہال میں گھومتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بڑے مزے سے سیٹیاں بجاتے ہیں۔ بندروں کی رہائش کا بھی خاطر خواہ انتظام ہے۔ ان کا ہال مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ ہے۔ باہر کی سردی سے بچاؤ کی خاطر شہر کے پنشن یافتہ بوڑھے اور بوڑھیاں پنجروں کے سامنے رکھے ہوئے بنچوں پر آکر بیٹھے رہتے ہیں۔ سُرخ بندر، کالے بن مانس اور سفید لنگور پنجروں کی سلاخوں سے چمٹے بڑی دلچسپی سے اِن انسانوں کو تکتے رہتے

ہیں جو اپنے خنک کمروں سے فرار ہو کر ان کے گرم اور خوشگوار ہال میں بیٹھے اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ ارتقاء کی منزلیں طے کرنے پر بھی نجات حاصل نہیں ہوتی۔

چڑیا گھر سے باہر نکلا تو شام ہو رہی تھی اور شہر کی لاتعداد روشنیاں اور نیون سائن سُرمئی اندھیرے میں جگمگا رہے تھے۔ مَیں برانڈن برگ دروازے سے بائیں ہاتھ پر دیوارِ برلن کے سائے میں چلتا ہُوا واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ ڈیسک کلرک سے نظر بچا کر جب میں کمرے میں داخل ہُوا تو مائک اور چاروں لڑکیاں قالین پہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ شاید بطخوں والی بات بھول چکا تھا۔

"سیاحت تو کوئی ہمارے پاکستانی دوست سے سیکھے۔ تمام شب سفر میں گذاری، صُبح سات بجے آوارہ گردی پہ نکل گئے اور آدھی رات کو واپسی ہوئی۔" مائک موڈ میں تھا۔ اُس کے سامنے جرمن بیئر کے درجنوں خالی ٹین پڑے تھے۔

"ہم لوگ تو صرف دیوارِ برلن دیکھ کر ہی واپس آ گئے تھے۔" مارگریٹ نے تاش کے پتے پھینکتے ہوئے جماہی لی "تم نے آج کیا کیا دیکھا؟"

"ڈاہلم میوزیم۔ چڑیا گھر۔۔۔۔"

"چڑیا گھر؟" مائک کی باچھیں کھِل گئیں۔ "وہاں بطخیں بھی تھیں؟"

"پتہ نہیں۔" مَیں نے جھینپ کر کہا۔

"کمال ہے یعنی چڑیا گھر بھی گئے اور بطخیں نہیں دیکھیں۔ وہاں نہیں دیکھ سکے تو۔۔۔" اُس نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر تماشا ہنسنے لگا۔

"سونے کا کیا انتظام ہے؟"

"تمہارے حصے میں غسل خانہ آیا ہے۔ ہلٹن کا غسل خانہ ہے پیارے۔ ہم لوگ یہیں قالین پر گذارا کر لیں گے" اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

غسل خانے کا ٹب میرے سونے کے تھیلے اور دو تکیوں کی مدد سے اچھا خاصا بستر بن گیا۔

"رات آرام سے کٹے گی" میں نے سوچا۔ "بشرطیکہ سوتے میں پاؤں پانی کے نل کی ٹونٹی پر نہ جا پڑے تو!" میں نے دروازہ بند کر کے روشنی گل کر دی اور اپنے خمدار بستر پر لیٹ گیا۔ مالک کے بے ہنگم قہقہوں اور "بطخوں" کی متواتر قیں قیں کے باوجود میں جلد ہی سو گیا۔

رات کے پچھلے پہر دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ "اندر آجائیں۔" میں نے اونگھتے ہوئے کہا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ میں کسی کمرے کی بجائے غسل خانے میں سو رہا ہوں اور دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں جماہیاں لیتا ہوا اُٹھا اور دروازے کی چٹخنی کھینچ دی۔ باہر ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی میں نوئلہ کھڑی تھی۔ نائلون کے باریک شب خوابی کے لباس میں وہ بالکل بطخ نہیں لگ رہی تھی۔

"میں اندر آنا چاہتی ہوں" اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں ہاں۔ بالکل۔ ضرور" میں نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ میری آنکھوں سے نیند بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر اس طرح انگڑائی لی جیسے وہ بھنگڑا ڈالنے کے موڈ میں ہو۔ ہاتھ نیچے کرنے سے اُس کا لباس کندھے سے ڈھلک گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا اور پھر اُسے بیوقوفوں کی طرح تکنے لگا۔

"تم باہر آؤ تو ہی میں اندر جا سکتی ہوں" یہ کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑے پیار سے مجھے باہر دھکیل کر غسل خانے کی کنڈی چڑھا لی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری خواب گاہ میں بستوں کی اور بہت سی "حاجتیں" پوری ہو سکتی ہیں مگر کم از کم رومان اُن میں شامل نہیں۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے میں پانی بہنے کی آواز آئی اور پھر نوئلہ اپنا لباس درست کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ "مخل ہونے کی معافی چاہتی ہوں" اُس نے نظریں جھکا کر کہا اور واپس جا کر قالین پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ میں اپنی خواب گاہ میں واپس آیا تو لیٹنے کی بجائے سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی۔ ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا

کہ ابھی چار باقی ہیں۔

صبح ہوئی تو میں نے ٹب میں سے اپنا بستر سمیٹا اور پھر اُس میں گرم پانی بھر کر غسل کیا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو لوگ تولیے اور دانتوں کے برش ہاتھ میں لیے قطار باندھے کھڑے تھے۔ سب کو فراغت ہو چکی تو ہائک نے ہر ایک سے دس مارک چندہ وصول کیا اور نیچے بل ادا کرنے چلا گیا۔ اس کے بعد چال میں خود اعتمادی اور لفٹ بوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا عمل شروع ہوا اور ہم آدھ گھنٹے میں ہائک کی کار میں پہنچ چکے تھے۔ "ٹیئر گارڈن" کے پارک میں ناشتے کے بعد واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے وُہ صرف مغربی جرمنی سے برلن کے مغربی حصّے تک جانے والی ٹریفک کے لیے مخصوص ہے اور کسی بھی قصبے یا شہر میں سے نہیں گذرتی۔ سڑک کے گرد میلوں تک سرسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے لیکن اُن میں کام کرنے والے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ آبادی کی غیر موجودگی میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم خلا میں سفر کر رہے ہوں۔ چونکہ میں نے ہیمبرگ جانا تھا اس لیے مغربی جرمنی میں داخل ہونے پر ہائک نے مجھے اتار دیا۔ وہ حسبِ وعدہ خواتین کو واپس فرینکفورٹ لے جا رہا تھا اور یوں ایک ایسے سفر کا اختتام ہُوا جس کی یادوں میں خبطی ہائک کے بے ہنگم قہقہے، ریمبرانت کی تصویر، "بطخوں" کی رفاقت، ہلٹن ہوٹل میں قیام اور چڑیا گھر کے بندر شامل تھے۔



دریائے ایلبا کے کنارے

مغربی جرمنی کی سرحد سے مجھے فوراً ہی ہیمبرگ جانے والی ایک ٹورسٹ بس مل گئی جس نے مجھے شام سے پہلے جرمنی کے سب سے بڑے شہر میں پہنچا دیا۔ بس سٹیشن کے ساتھ زیرِ زمین ریلوے سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہو کر میں "سینٹ پالی" پر اُتر گیا جس کے قریب ہیمبرگ کا یوتھ ہوسٹل واقع ہے۔ فرینکفورٹ کے ہوسٹل کی طرح یہ عمارت بھی جدید اور صاف ستھری ہے۔ وارڈن کا رویّہ بھی قدرے نرم اور مشفقانہ ہے۔ فرینکفورٹ میں تو سیاح بے جا سختیوں اور اوقات کی پابندی پر وارڈن کو یوتھ ہوسٹل وارڈن کی بجائے یوتھ ہٹلر وارڈن کے نام سے پکارتے تھے۔ ہوسٹل کی رکنیت کا کارڈ دفتر میں جمع کروا کر میں کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ شیشے کی کھڑکیوں سے پرے یورپ کی سب سے بڑی بندرگاہ کی گودیاں اور عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ تجارتی، فوجی، مسافر بردار جہاز اور چھوٹی بڑی کشتیاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بندرگاہ کے ساتھ چوڑے فٹ پاتھ پر گودی میں کھڑے جہازوں کے ملاح بے مقصد گھوم رہے تھے۔ کوئی حسین لڑکی اُن کی جانب ایک نظر دیکھتی تو وہ سب اُس کے گرد ہو جاتے اور تب تک پیچھا نہ چھوڑتے جب تک اُس کا کوئی ساتھی یا رشتہ دار

مدد کو نہ پہنچ جاتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مَیں نے سگریٹ سلگایا تو ویٹرس نے بڑی سختی سے منع کر دیا "فار بُودن"۔ مَیں اُٹھ کر باہر آگیا اور ہوسٹل کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنا ادھ جلا سگریٹ دوبارہ سُلگا لیا۔ میرے علاوہ وہاں اور لڑکے اور لڑکیاں بھی براجمان تھے۔ شام بسر کرنے کے پروگرام طے ہو رہے تھے۔ "فلاں ڈسکو تھیک کے سازندے سر کے بل کھڑے ہو کر ساز بجاتے ہیں۔" "پنشن یافتہ بوڑھوں کے خیراتی ہوٹل میں چلتے ہیں وہاں خوراک سستی ہے۔" "آج گھاس (یعنی چرس) پینے کو جی چاہتا ہے۔" میرے ساتھ سیڑھیوں پر گندمی رنگ کا ایک مُنحنی سا لڑکا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس نے کالے چمڑے کی پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی اور سر پہ ایک سُرخ رنگ کا بوسیدہ ہیٹ اٹکا رکھا تھا۔ "شاید ہندوستانی ہے" مَیں نے اندازہ لگایا۔

"یُو انڈین ؟" اُس نے سگریٹ ختم کر کے پاؤں تلے مَسلا اور چٹکی کی لَے پر جھومنا شروع کر دیا۔ اُس کا سَر تال کی لَے میں متواتر ہل رہا تھا اور اُس نے ایک ہاتھ سے اپنے سُرخ ہیٹ کو تھام رکھا تھا۔

"پاکستانی"۔ مَیں نے روہانسا ہو کر جواب دیا۔

"کُول مَین" اُس نے بلسلہ چٹکی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟" آدمی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔

"لائک ٹرینیڈاڈ مَین" اُس نے سُرخ ہیٹ سَر سے اُٹھایا اور جُھک کر جواب دیا۔

تو وُہ جزائر غرب الہند کا باشندہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے قاسمی کہتے ہیں اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ صدیوں پیشتر اُس کے آباؤ اجداد ہندوستان سے ہجرت کر کے ٹرینیڈاڈ کے جزیرے میں آباد ہو گئے تھے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُن کا تعلق ہندوستان کے کس صُوبے سے تھا۔ اب وُہ لندن میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں یورپ میں بسر کرنے آیا ہوا تھا۔ سفر کے اخراجات پہلو میں پڑی ہوئی گٹار بجا کر پورے ہوتے تھے۔ اُس کی زبان اور لہجے میں غرب الہند کے حبشی موسیقاروں اور امریکی ہپیوں

کی بولی کا عنصر نمایاں تھا جس میں کُول، گریٹ، گُرُوڈی اور لائک جیسے لایعنی الفاظ کی بھرمار تھی۔

"وہاٹ گُو زَیِن، کیا پروگرام ہے؟" میں نے بھی چٹکی بجانی شروع کر دی اور اپنے آپ پر وُجد طاری کر لیا۔

"سینٹ پالی۔ ریپا بہان" اُس نے بھورے تھیلے میں بند اپنی گٹار کندھے پر رکھی اور ہم ہوسٹل کی سیڑھیاں اُتر کر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہجوم میں کھو گئے۔ ہماری منزل ریپا بہان تھی۔ ریپا بہان جس کا نام سُن کر جرمن بوڑھے آہیں بھرتے ہیں، جوان مُسکرا دیتے ہیں اور دنیا بھر کے ملاحوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ شبینہ کلبوں، ناچ گھروں اور شراب خانوں کا ایک جنگل جس کے تاریک کونوں میں دلدلیں اور پھسلن ہے جہاں جا کر لوگ جیب اُلٹ دیتے ہیں اور اپنی خوشی سے پھسلتے ہیں۔ ریپا بہان جہاں کسی کو نیند نہیں آتی اور جس کی محفلوں میں رت رت جگا رہتا ہے۔ یہاں پر کاروں کی آمد و رفت بالکل نہ ہونے کے برابر تھی اور اکثر لوگ فٹ پاتھ چھوڑ کر بڑے ٹھٹے سے سڑک کے بیچوں بیچ چل رہے تھے یا چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جرمن بیئر کے رنگ تھے۔ ہر شبینہ کلب کے دروازے پر اندر ہونے والے رنگین "تماشوں" کی تصاویر چسپاں تھیں۔ کئی جگہ ٹکٹ بیچنے والے چیخ چیخ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ "پانچ مارک میں بیس لڑکیوں کا ناچ، بیئر کا گلاس مفت"۔ "ہندوستانی جوگی اور پچاس جنگلی لڑکیاں"۔ "مشرقِ وسطیٰ کی شہد میلی خواتین"۔ تصویریں دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اِس علاقے میں ملبوسات کی دکانوں کے مالک تو بھوکوں مرتے ہوں گے۔ ہم ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوئے تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں دکانیں رات کو بھی کُھلی ہیں اور شوکیس رنگ برنگی روشنیوں سے منوّر تھے۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ شوکیسوں کے شیشے ندارد ہیں اور اُن میں کپڑوں یا اشیائے صرف کی بجائے عورتیں سجی بیٹھی ہیں۔ غازے اور لپ سٹک کی موٹی تہوں میں جھریوں سے بھرپور گناہ آلود چہرے۔ بحریہ کی وردیوں میں

میں بلبوس ملاح ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہر شوکیس میں جھانک کر "اشیا" کی کوالٹی کا اندازہ لگا رہے تھے۔ اَب مجھ پر ملاحوں کے مشہور گانے "ہر بندرگاہ میں میری ایک داشتہ لڑکی ہے" کا پورا مطلب آشکارا ہُوا۔ ظاہر ہے ہر بندرگاہ کے شہر میں اِسی قسم کی "لڑکیاں" ہوں گی۔ ہم تیزی سے گلی پار کر کے سڑک کے دوسری طرف آنکلے۔ یہاں پر نسبتاً شرافت کا دور دَورہ تھا یعنی صرف شراب خانے اور سینما تھے۔

"میرا خیال ہے اب واپس ہوسٹل چلا جائے" مَیں نے اپنے ساتھی سے التجا کی جو گردو پیش کے ماحول سے بے خبر ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا۔

"پلے کُول ڈیڈی او" اُس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ یعنی مجھے صبر کی تلقین کی جارہی تھی۔ سڑک کے اختتام پر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ قاضی نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا۔ "دِس پلیس سوِنگز" اُس نے چٹکی بجا کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ گِٹار کو تھیلے سے باہر نکالا اُسکے تار کَسے اور اُنگلی پر مضراب چڑھا کر جزائر غرب الہند کی ایک لوک دُھن چھیڑ دی۔ قاضی بیحد میٹھا ہُوا موسیقار ثابت ہوا اور گِٹار کی سُریلی گَت سُن کر چند راہگیر ہمارے گرد جمع ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ نغمے کا بول ختم ہوتا تو گِٹار مضراب کی بے رحم بوچھاڑ سے چیخ اُٹھتی۔ ہجوم میں اکثریت ملاحوں کی تھی جو شور مچا مچا کر اپنی پسند کا اظہار کر رہے تھے۔ چند "لڑکیاں" اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر سر رکھے گیت سے لُطف اندوز ہو رہی تھیں نشے میں دُھت ایک موٹے جرمن نے "زیا گُڈ" کا نعرہ لگایا۔ بڑی مشکل سے اپنی جیب تلاش کی اور ایک سِکہ نکال کر ہماری طرف پھینک دیا۔

"گریَب دی مَنی مَین" قاضی نے اپنا سُرخ ہیٹ مجھے تھما دیا اور مجمع میں گھوم جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مَیں ہَیٹ آگے کر کے تماشائیوں سے پیسے مانگوں۔

"نو ڈِیل کُول کیٹ۔ یہ سودا مجھے منظور نہیں" مَیں نے ہیٹ اُس کے سَر پہ رکھ کر تھپک دیا۔

"کریزی" ہیٹ اُس کے کانوں تک اُتر آیا تھا اور وہ بے حد حیران تھا کہ میں اتنی آسانی سے "کمائی" ہوئی دولت سمیٹنے میں جھجک کیوں رہا ہوں۔

"بالکل کریزی۔ صریحاً پاگل پن" میں نے سر ہلا کر چٹکی بجائی اور تماشائیوں کے زرغے سے نکل کر واپس ہوسٹل آگیا۔ ساری رات ایک ہی خواب دیکھتا رہا کہ میں ریپاباہان میں بندروں کی طرح ناچ رہا ہوں اور ہیٹ پھیلا کر لوگوں سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ یورپ میں خواب بھی کچھ زیادہ ہی آتے ہیں۔

دوسری صُبح ناشتے سے فارغ ہو کر ہوسٹل سے باہر آیا تو قاضی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔

"ففٹی مارک۔ مَین آئی ایم سونگنگ" اُس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند سکے نکالے اور اُنہیں گننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ پچھلی شب کی کمائی سے بے حد مطمئن نظر آرہا تھا۔

کل شام جب ہیمبرگ پہنچا تو خیال تھا کہ سیدھا اپنے مصور دوست فالکر کے ہاں چلا جائے پھر خیال آیا کہ شاید اس وقت اُس کا مکان ڈھونڈنے میں دقت ہو اس لیے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اَب اُسے ملنے کا پروگرام تھا۔ ہم دونوں کی پہلی ملاقات کئی برس پیشتر پیرس میں ہوئی تھی۔ مصوری سے مجھے شروع سے ہی لگاؤ تھا حالانکہ سکول کے زمانے میں ڈرائنگ کے مضمون میں ہمیشہ فیل ہو جاتا۔ پھر گوگین، وان گوگ اور لاٹرک کے حالاتِ زندگی پڑھے تو شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں لنڈن سے پیرس چلا آیا۔ مصوری شروع کرنے کے لیے مومارت کے علاقے سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ پُرانی وضع کے مکانات، اونچی نیچی پتھریلی سڑکیں اور درجنوں قہوہ خانے جو دن رات کھلے رہتے ہیں۔ میں نے بھی ایک شکستہ صورت عمارت کی آخری منزل پر ایک روشن کمرہ کرائے پر لے لیا۔ سارا دن کینوس اور رنگوں کا ستیاناس کرتا اور شام کو کسی قہوہ خانے میں بیٹھ کر اصلی اور بڑے مصوروں کی گفتگو سُنتا۔ مصوری کے جدید ترین اصول نوٹ کرتا اور دوسرے روز اُن پر عمل کرنے کی کوشش کرتا۔ نتائج کبھی بھی خاطر خواہ برآمد نہ ہوتے۔ ایک شام میں معینہ وقت سے

کچھ پہلے ہی قہوہ خانے میں چلا گیا۔ ابھی تک دوسرے حضرات وارد نہیں ہوئے تھے۔ قہوہ خانہ تقریباً خالی تھا سوائے ایک گرانڈیل باریش مصوّر کے جو کاؤنٹر پر براجمان تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی اور دوسرے میں ایک سُرخ پنسل جس سے وہ کاؤنٹر کی شفاف سطح پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ قہوہ خانے کے مالک نے اپنے نئے کاؤنٹر کو مشقِ مصوّری بنتے دیکھا تو اُسے تاؤ آگیا اور مصوّر کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ تھوڑی سی تکرار ہوئی اور پھر وہ ایک دوسرے کو دھما دھم پیٹنے لگے۔ مَیں بچاؤ کے لیے بڑھا تو ایک گھونسا مجھے بھی رسید کر دیا گیا۔ اُس کے فوراً بعد حالات اعتدال پر آگئے۔ مالک نے داڑھی والے مصوّر سے ہاتھ ملایا اور جھاڑن لے کر بڑے سکون سے پیالیاں خشک کرنے لگا۔ مصوّر نے کاؤنٹر سے کافی کی پیالی اُٹھائی اور اُٹھ کر میری میز پر آگیا جہاں میں ابھی تک اپنا جبڑا سہلا رہا تھا۔

"خواہ مخواہ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑاتے" اُس نے میز کے نیچے سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ "قہوہ خانے کا مالک میرا پُرانا دوست ہے۔ قصور میرا تھا جو کاؤنٹر پر رنگ آمیزی شروع کر دی۔ بہرحال اب صُلح ہو چکی ہے۔" اُس نے انگوٹھے اور اُنگلی کی مدد سے اپنی گھنی مونچھیں منہ سے ہٹائیں اور مُسکرا دیا۔ "مُکّہ شاید زور سے لگا ہے؟"

"ہاں" مَیں نے غصّے سے کہا۔ "زور سے ہی لگا ہے۔"

"آؤ میرے سٹوڈیو میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میرے پاس فرانسیسی ڈبل روٹی اور پنیر کے ٹکڑے ہیں۔" اُس کی دعوت میں بے پناہ خلوص تھا۔ اُس کا سٹوڈیو اُسی گلی میں واقع تھا جہاں میں رہتا تھا۔ کمرے میں بکھری ہوئی تصویروں پر تاثراتی مصوّروں رینائر اور سیزان کے شوخ رنگوں کی گہری چھاپ تھی۔

"میں ہیمبرگ کا رہنے والا ہوں۔ پیرس اس خیال سے آیا تھا کہ یہاں کا ماحول مصوّری کے فن کو جلا بخشتا ہے" اُس نے گز بھر لمبی ڈبل روٹی کو بیچ میں سے کاٹا اور پنیر کے ٹکڑے کے ساتھ ایک حصّہ مجھے تھما دیا۔ "لیکن جب تک اِنسان کے اپنے اندر کچھ نہ ہو ماحول خواہ کتنا ہی

سازگار کیوں نہ ہر تخلیقی عمل بے جان رہتا ہے۔"

فالکر کی اس منطق نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور میں چند روز کے بعد اپنے رنگ۔ برش اور کینوس اونے پونے داموں بیچ کر واپس لنڈن چلا گیا۔ مَیں نے محسوس کر لیا تھا کہ مصوری میرے بس کا روگ نہ تھا۔ میرے ذہن کے کینوس پر چاہے کتنے ہی لازوال شاہکار کیوں نہ اُبھریں مَیں اُنہیں سامنے رکھے ہوئے کینوس پر منتقل کرنے سے قاصر تھا۔ میرے اندر سے اُٹھنے والے شُعلے کی حدت مجھے تو پھونک سکتی تھی مگر رنگوں میں جذب ہو کر اُنہیں کُندن نہ بنا سکتی تھی۔ اُن چند دنوں میں فالکر اور مَیں مصوری کو بالائے طاق رکھ کر پرانے پیرس کی گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گھومتے رہتے اور ہر شام اُسی قہوہ خانے میں آ بیٹھتے جہاں ہمارا "تعارف" ہُوا تھا۔ میری واپسی کے تھوڑے عرصے بعد فالکر بھی ہیمبرگ لوٹ گیا۔

میری ڈائری پر فالکر کا پتہ فلیٹ نمبر 20، B.Y درج تھا لیکن بیس نمبر میں فالکر کی بجائے ایک پنشن یافتہ بوڑھا رہتا تھا۔ کافی تلاش کے بعد اُسی فلیٹ کے پچھواڑے میں ایک بوسیدہ مکان ملا جس کے دروازے پر فالکر کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ اب معلوم ہوا کہ نمبر کے ساتھ B.Y بیک یارڈ (BACK YARD) کے معنوں استعمال ہوا تھا۔ مَیں نے لیٹر بکس پر لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ گھنٹی شاید کام نہیں کر رہی تھی۔ دروازے سے پیچھے ہٹ کر مَیں نے پُوری قوت سے فالکر کا نام پکارا۔ فوراً ہی ٹین کی چھت میں سے ایک روشن دان کھُلا اور بیچ میں سے فالکر کا گنجا سر برآمد ہوا۔ داڑھی غائب تھی مگر مونچھیں جُوں کی توں تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُس کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا اور وُہ روشن دان بند کر کے اُسی وقت نیچے آگیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"ہا ہا! مشیل میرے دوست" پیرس میں وُہ ہمیشہ میرا نام بھول جاتا چنانچہ سہولت کے لیے مجھے مستنصر سے فرانسیسی مشیل میں بدل دیا گیا۔

"تمہارا سامان کہاں ہے؟" اُس نے میرے لٹکتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر پوچھا۔

"یوتھ ہوسٹل میں۔"

"شام کو لے آئیں گے" اُس نے قوی ہاتھوں سے میری کندھے تھپکتے ہوئے کہا۔

فالکر کا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک مصوری کا کمرہ یعنی سٹوڈیو اور دوسری خوابگاہ۔ درمیان میں ایک تنگ راہداری تھی۔ فرنیچر اور دوسرا سامان کافی پُرانا معلوم ہوتا تھا۔ فلیٹ میں کافی اور تازہ رنگوں کی ملی جلی خوشبو تھی۔

"آج کل میری تصویریں نہیں بک رہیں" اُس نے سٹوڈیو کی بوسیدہ دیواروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں کیا وجہ ہے۔ شاید تم دیکھ کر بتا سکو۔" ایک کونے میں درجنوں گرد آلود تصاویر بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ فالکر نے ایک تصویر اُٹھائی اور اپنے رومال سے جھاڑ پونچھ کر سٹینڈ پر رکھ دی۔ "کیا خیال ہے؟" یہ دوسری جنگ عظیم کے دوران تعمیر کردہ لوہے اور سیمنٹ کا ایک ویران مورچہ تھا۔ فالکر نے بتلایا کہ جنگ کے آخری ایّام میں اتحادی حملہ کے پیشِ نظر جرمنوں نے پورے ملک میں ایسے دفاعی مورچوں کا جال بچھا دیا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ اِن کی افادیت تو ختم ہو گئی مگر اپنی مضبوط تعمیر کے باعث یہ مورچے ابھی تک صحیح سالم ہیں۔ فالکر کی اِس تصویر میں سیاہی اور مایوسی کے پرتو تھے یہاں تک کہ مورچے کے گرد کھیتوں کا رنگ بھی سیاہی مائل تھا۔

"تاثراتی طرز کے شوخ و سنگ رنگ کیا ہوئے؟" مجھے اُس کی پیرس کے زمانے کی تصاویر یاد تھیں۔

"وہ سب فریبِ نظر تھا۔" اُس نے سٹینڈ پر ایک اور تصویر رکھ دی۔ یہ بھی ایک سیاہی مائل مورچہ تھا۔ "یہ مضبوط لیکن بے مقصد مورچے میرے زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اِسی طرح میری افادیت بھی مخصوص حالات کی طابع ہے اور ابھی تک وہ حالات پیدا نہیں ہو سکے۔ آج کل فن کاروباری حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مجھے بسکٹوں کے ڈبے اور خواتین کے زیر جامہ ملبوسات کے اشتہاروں کے ڈیزائن بنانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے جو مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔"

"فالکر تمہارے خون میں صرف مصوری کے سُرخ جرثومے ہی گردش کر رہے ہیں۔ اس میں کاروبار کے سفید جرثومے سرے سے موجود ہی نہیں۔" مَیں نے اُس کی بے بسی سے متاثر ہو کر کہا۔

"اگر کبھی میرے جسم میں ایسے جرثومے پیدا ہوئے تو اُس روز میرا خون جم جائے گا۔ ٹھنڈا ہو جائے گا" اُس کے لہجے میں غصّہ تھا۔

"گرم کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس کمرے میں بے حد سردی ہے" مَیں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"سوری" اُس نے دونوں ہاتھ ہوا میں اُٹھا دیے۔ "مَیں اچھا میزبان ثابت نہیں ہُوا۔ آج ہیٹر بھی کام نہیں کر رہا۔ مَیں ابھی کافی بنا کر لاتا ہوں۔" اُس نے باقی تصاویر اُٹھا کر واپس کونے میں رکھ دیں اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ مَیں کرسی سے اُٹھ کر الماری میں رکھی ہوئی مصوری کی تصویر دار کتابیں دیکھنے لگا۔ یکدم کمرے کا دروازہ چوپٹ کھُل گیا اور ایک سیاہ بالوں والی نرم و نازک لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے جلدی سے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر سے دروازہ اِس طرح بند کیا جیسے کوئی خطرناک شخص اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔ "اُف باہر تو خُوب سردی ہے۔" اُس نے ٹھٹھرتے ہوئے بے دھیانی میں کہا۔ اُس کی نظریں فالکر کی کُرسی پر تھیں اور پھر اُسے وہاں نہ پا کر فوراً کتابوں کی الماری تک آگئیں جہاں میں مُنہ کھولے اِس خوبصورت گُڑیا کو دیکھ رہا تھا۔

"اوہ" وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی، وہ منی سکرٹ میں بالکل چینی گُڑیا لگ رہی تھی۔

"کیرن" باورچی خانے سے فالکر کی آواز آئی۔ "یہ مِشل ہے میرا پاکستانی دوست۔" اُس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ مِلایا اور مُسکرا دی۔ اُس کا ہاتھ ٹھنڈا یخ تھا اور مُسکرانے سے اُس کی چپٹی ناک اور پھیل گئی تھی۔

"یہ میری بیوی ہے۔" فالکر نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اُسکے دونوں ہاتھوں میں کافی کی پیالیاں تھیں۔ "ہسپتال میں نرس ہے۔ تصویریں نہ بِکیں تو اِس کی تنخواہ کام آتی ہے۔"

"اوہ فالکر" کیرن نے پیار سے احتجاج کیا اور لوہے کے ہیٹر کے پاس جا کر اپنے ہاتھ جالی پر رکھ دیے۔ اُسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ آج ہیٹر کام نہیں کر رہا۔

"ٹھیک ہی تو کہتا ہوں" فالکر نے مجھے کافی کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہایت ہی موزوں ہیں۔ بھلا ہو اُس چینی ملّاح کا جو چوبیس سال قبل ہیمبرگ کی ایک حسینہ پر اس بُری طرح فدا ہوا کہ پورے چوبیس گھنٹے اُس کے پاس رہا اور پھر غائب ہو گیا۔"

"فالکر" کیرن ایک زخم خوردہ بلّی کی طرح غرائی۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

میرے ذہن سے ایک بوجھ اُتر گیا۔ جب سے کیرن اُس کمرے میں داخل ہوئی تھی میں اُس کی غیر یورپی شکل و شباہت کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ کالے بال، قدرے چپٹی ناک اور سیاہ نیم وا آنکھیں۔ تو یہ سب کچھ چینی خون کی آمیزش سے تھا۔

"شرم کی کونسی بات ہے؟" فالکر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اگر قصور وار ہے تو تمہاری ماں جو تمہیں پیدائش کے فوراً بعد یتیم خانے میں داخل کروا گئی یا پھر وہ چینی ملّاح جو تم دونوں کے وجود سے بے خبر شاید اس وقت ہانگ کانگ کی کسی سوزی وانگ کے ساتھ گھوم رہا ہو گا۔"

کیرن ٹھنڈے ہیٹر سے ہٹ کر ایک کُرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ اب فالکر مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "اسے اپنے ماں باپ سے شکوہ نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے والدین تو شادی شدہ تھے مگر اس سے مجھے کیا فائدہ ہُوا۔ میرا باپ فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ جنگ میں مارا گیا تو میری ماں نے ایک قصائی سے شادی کر لی۔ وہ قصاب کا بچّہ مجھے پیٹتا بھی اور پھر روزانہ تین سُوروں کی بوٹیاں بھی کٹواتا۔ آخر میں گھر سے بھاگ نکلا۔ مدتوں در بدر کی ٹھوکریں کھانے اور اتنی محنت کرنے کے باوجود میں اب صرف ایک غیر معروف مصوّر ہوں۔ ہیمبرگ میں رواج ہے کہ ہر ماہ کی آخری تاریخ کو لوگ اپنا پرانا اور ناکارہ سامان گھروں کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں تاکہ بلدیہ کا ٹرک اِس کوڑے کرکٹ کو اُٹھا لے جائے۔ میں ٹرک آنے سے پیشتر ہی وہاں پہنچ جاتا ہوں اور اُن ڈھیروں میں سے



کام کی چیزیں اُٹھا لیتا ہوں۔ یہ جالی دار لوہے کا ہیٹر جو آج کام نہیں کر رہا۔ ریڈیو جو اکثر کام نہیں کرتا۔ کپڑے دھونے کی مشین جسے چلانے کے لیے ہم لکڑی کا ڈنڈا استعمال کرتے ہیں کیونکہ اس میں بجلی کی رَو آجاتی ہے اور پھر یہ بلوریں فانوس سبھی مالِ غنیمت ہے۔" اُس نے کافی کا پہلا گھونٹ بھرا اور بُرا سا منہ بنا لیا۔ "ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" "اور ہاں تم کیرن کو ساتھ لے کر یوتھ ہوسٹل سے اپنا سامان لے آؤ۔" اُس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "مجھے ایک ضروری ڈرائنگ مکمل کرنا ہے۔"

"مجھے ہوسٹل میں ہی رہنے دو" مَیں نے فالکر کی معاشی مجبوریوں کے پیشِ نظر درخواست کی۔ "تمہارے پاس اِتنی جگہ بھی نہیں اور پھر۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر کیا؟" اُس نے مصنوعی غصّے سے میری کمر پر ایک دھپ رسید کی۔ "کیا تمہیں اِس سٹوڈیو میں رنگوں کی بُو پسند نہیں؟ تم ہمارے پاس ہی ٹھہرو گے۔"

مَیں نے ہاتھ اُٹھا کر کندھے سکیڑے اور مُسکرا دیا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔"

مَیں اور کیرن جب سامان لینے کے لیے یوتھ ہوسٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ مکینوں کو پانچ بجے سے پہلے اپنے کمروں میں جانے کی اجازت نہیں۔ ابھی صرف چار بجے تھے۔ اِس لیے ہم وقت گذارنے کی خاطر سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر بندرگاہ کے ساتھ والی سڑک پر آگئے جہاں خوب چہل پہل تھی۔ بوڑھے بنچوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بچے آئس کریم کی دکانوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور باقی لوگ یا تو صرف چوڑے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہے تھے اور یا پھر گودی میں کھڑے جہازوں کے ملاحوں سے مصروفِ گفتگو تھے۔ مشروبات کے سٹال پر چند ملاح کھڑے تھے۔ ہم پاس سے گذرے تو سب گردنوں کو بل دے کر کیرن کی طرف ندیدوں کی طرح تکنے لگے۔ ایک نے انگلیاں مُنہ میں گھسیڑ کر زور سے سیٹی بجائی۔

"مجھے اِن لُچّے ملاحوں سے سخت نفرت ہے" کیرن نے بیگ سے دھوپ کا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ "مجھے معلوم ہے میرا باپ بھی ان جیسا ہی ہو گا لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا

ہے کہ ...." اُس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پانچ بجے ہوسٹل کھُلا تو ہم سامان لے کر واپس سٹوڈیو آ گئے۔ فالکر ابھی تک ڈرائنگ بنانے میں مگن تھا۔

"تم تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو" اُس نے پنسل سے خطوط گہرے کرتے ہوئے کہا، "غسل کر لو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔ غسل خانہ راہداری کے سرے پر ہے" مَیں تولیا لے کر غسل خانے میں پہنچا تو وہاں دروازے کی بجائے ایک قدِ آدم عریاں تصویر کا کینوس لگا ہوا تھا۔ ٹائلٹ سیٹ کے عین اوپر ایک بوڑھے فوجی افسر کی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ فوجی کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تلوار کے دَستے کو تھامے ہوئے تھا اور دوسرا سینے پہ رکھا تھا جہاں درجنوں فوجی نشان اور تمغے سجے تھے۔

"فالکر یہ تصاویر کس کی ہیں؟" مَیں نے کپڑے اُتارتے ہوئے غسل خانے میں سے آواز لگائی۔

"دروازے پر کیرن کی تصویر کا کینوس لگا ہے۔ اِس طرح غُسل کے دوران اُسے آئینے کی ضرورت پیش نہیں آتی" سٹوڈیو میں سے جواب آیا۔ میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے۔

"اور ٹائلٹ سیٹ کے اوپر اپنے والد صاحب ہیں۔ بوڑھے کو لٹکانے کے لیے یہی جگہ مناسب ہے۔"

مَیں نے جلدی سے کپڑے دوبارہ پہننا شروع کر دیے اور نہانے کا ارادہ مُلتوی کر کے صرف منہ ہاتھ دھو کر ہی باہر آ گیا۔

"رات کے کھانے پر ڈاکٹر شمت اور اُن کی اہلیہ آ رہے ہیں۔ میرے گنے چنے مداحوں میں سے ہیں" فالکر نے مجھے بتایا۔ مَیں نے دیکھا کہ رنگ کے ڈبوں والی میز کو صاف کر کے اُس پر بستر کی چادر بچھا دی گئی تھی۔ میز پہ صرف تھوڑا سا پنیر اور چند ڈبل روٹیاں سجی تھیں۔

"ہو سکتا ہے وہ فالکر کی کوئی تصویر خرید لیں" کیرن نے پُر امید ہو کر کہا اور الماری

سے دو لمبی ادھ جلی موم بتیاں نکال لائی۔ اُس نے موم بتیاں روشن کر کے میز کے وسط میں رکھ دیں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر شمت اور اُن کی اہلیہ بھی آ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں دو بھاری لفافے تھے۔ "فالکر، میں تمہارے لیے تلے ہوئے مرغ اور وائن لایا ہوں۔ شاہکار تخلیق کرنے کے لیے بھرا ہُوا پیٹ نہایت ضروری ہے اور وہ صرف ڈبل روٹی اور پنیر سے نہیں بھرتا۔" ڈاکٹر شمت کو اپنے پسندیدہ مصوّر کے مالی حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ جب بھی اُسے ملنے آتا تو خوراک کے لفافے ساتھ ضرور لاتا۔ کیرن نے جھٹ سے لفافے کھول کر مُرغ اور بوتلیں میز پہ رکھ دیں اور الماری سے دو اور موم بتیاں نکال کر میز پر سجا دیں۔

اُس شب ہم دیر تک کھانے کی میز پہ بیٹھے مختلف مصوّروں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ ڈاکٹر شمت کو مشرقی مصوری سے بے شمار اختلافات تھے۔

"آخر آپ لوگ تصویر کشی کے وقت ماڈل کیوں نہیں استعمال کرتے؟ ماڈل کے بغیر تصویر میں زندگی کی لہر نہیں دوڑتی۔ ظاہر ہے بند کمرے میں بیٹھ کر اگر خوبصورت وادیوں، جھیلوں اور حسین عورتوں کی تصویریں بنائی جائیں تو اُن میں قدرتی رنگ ناپید ہو گا۔"

مَیں نے اُسے بتایا کہ ہمیشہ سے مغرب میں ظاہر اور مشرق میں باطن کی تقلید ہوتی رہی ہے۔ یہی صورت مصوّری میں بھی اُبھری ہے۔ ایک خوبصُورت عورت کو ماڈل بنا کر تصویر کشی کرنا امتحان میں بیٹھے ہُوئے اُس طالب علم کی طرح ہے جو پرچہ حل کرتے وقت کتابوں کی مدد لیتا ہے۔ اُدھر مشرقی مصوّر ان بیساکھیوں پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر ڈوب کر ایک ایسی من موہنی صورت تخلیق کرتا ہے جس کی خوبصورتی کے پیمانے اُس کے اپنے باطنی جذبات کا مظہر ہوتے ہیں۔ چشمِ آہو، صراحی دار گردن وغیرہ انہی باطنی جذبات کی عکاسی ہیں۔"

کھانے کے اختتام پر ڈاکٹر شمت کی فرمائش پر فالکر نے اپنی تازہ ترین تصاویر دکھائیں جن میں سے دو کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور ڈاکٹر نے مناسب قیمت دے کر انہیں خرید لیا۔ کیرن اور فالکر کے چہرے تصویروں کی فروخت پر خوشی سے دمک رہے تھے۔ ڈاکٹر شمت

اور اُس کی اہلیہ کے رخصت ہوتے ہی فالکر نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔

"میرا خیال ہے اسی خوشی میں کل دریائے ایلبا (ELBE) کے کنارے پکنک منائی جائے" کیرن نے چاروں موم بتیاں گُل کر کے واپس الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ" فالکر دونوں ہاتھ پھیلا کر کیرن کی طرف بڑھا۔ "بڑا ہی اچھا خیال ہے۔ بلکہ اسی خوشی میں ...."

"فالکر کے بچے اگر تم نے میری طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو ...." کیرن ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھانے کے کانٹے کو ماہر شمشیر زنوں کی طرح فالکر کے سینے پر رکھ کر ہنس دی۔

"آہم" میں نے کھانس کر اُنہیں اپنی موجودگی کی اطلاع دی اور اپنا تھیلا اُٹھا کر سونے کے کمرے میں آگیا۔

دوسری صُبح غسل خانے میں فالکر کے والد صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے بعد جب میں سٹوڈیو میں داخل ہوا تو وہاں اُدھم مچا ہُوا تھا۔ کیرن نے پچھلی شب اپنے تمام مصور دوستوں کو آج کی پکنک پر مدعو کر لیا تھا چنانچہ اکثر حضرات اپنے بال بچوں سمیت صبح صبح ہی وارد ہو گئے تھے۔ فالکر نے سب سے میرا تعارف کروایا۔ ایک سنہری بالوں والی ننھی منی گڑیا فوراً میری دوست بن گئی اور میرے پہلو میں آبیٹھی۔

"انکل آپ کا رنگ بالکل سوِس چاکلیٹ کا سا ہے"۔

"اور تمہارے بال پاکستانی گندم کی سنہری بالیوں جیسے ہیں"۔ میں نے اُس کی مُنّی سی پونی ٹیل کھینچتے ہوئے کہا۔

سب لوگ پکنک پر جانے کے لیے اپنے ساتھ خوراک کی ٹوکریاں لائے تھے۔ کارل نے جو سب سے کم عمر تھا اعلان کیا کہ وُہ بیئر کا ایک پورا کریٹ لایا ہے۔ اس پر زبردست نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ میں نے کیرن سے درخواست کی کہ میرے لیے اورنج جُوس کی

ایک دو بوتلیں رکھ لی جاتیں۔ "مذہبی جنونی" اُس نے اپنی چپٹی ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "مَیں نے بچوں کے لیے ٹوکری میں اورنج جوس بھی رکھا ہوا ہے تم اُن سے حصّہ بانٹ لینا۔"

فالکر کے فلیٹ سے یہ ہجومِ مصوّراں باہر نکلا اور پھر زیرِ زمین دوز گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے قصبے میں اُتر گیا جو زیرِ زمین دوز ریلوے کا آخری سٹیشن بھی تھا۔ قصبے کی بڑی سڑک کے سرے سے بائیں ہاتھ ایک کچی پگڈنڈی نیچے کھیتوں میں اُتر گئی تھی۔ اِسی پگڈنڈی کے آخر میں دریائے ایلبا تھا۔ فالکر، کالن اور گوئٹسز پکنک کا سامان اُٹھائے سب سے آگے آگے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی فالکر پگڈنڈی کے ساتھ کھیتوں میں پڑے ہوئے کسی کوڑے کرکٹ کے انبار کو اُلٹ پلٹ کر اُس میں سے "نادر اشیاء" تلاش کرنے لگتا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے سائیکل کا ایک ہینڈل، ٹوٹی ہوئی ایک ٹوکری، تام چینی کا ایک برتن اور جانے کیا کیا الا بلا اکٹھا کر لیا۔

"ان نادر اشیا سے ایک شاہکار جدید مجسمہ تیار ہو گا۔ عنوان ہو گا "دریائے ایلبا کے کنارے پکنک"۔" اُس نے مجھے نہایت سنجیدگی سے بتایا۔ فالکر کے پیچھے پیچھے کارل خوش و خرم سر پہ اپنا بیئر کا کریٹ اُٹھائے بلند آواز سے جرمن لوک گیت الاپتا جا رہا تھا۔ جب بھی فالکر کھیتوں میں اپنے شاہکار مجسمے کا مواد ڈھونڈنے اُترتا تو کارل بھی جھٹ سے مخالف سمت کے کھیت میں اُتر جاتا۔ جلدی سے کریٹ میں سے بیئر کا ایک ٹین نکالتا اور غٹ غٹ پی کر پہلے سے زیادہ خوش و خرم جھومتا ہوا پگڈنڈی پر واپس آجاتا اور اپنے گانے میں مگن ہو جاتا۔ اِن حضرات سے چند گز اِدھر شوخ رنگوں کی تنگ پتلونوں میں ملبوس خواتین اور بچے تھے جو بار بار کھیتوں میں اُتر جاتے اور رنگ برنگے پھول توڑ لاتے۔ سب سے پیچھے میں چل رہا تھا۔ مَیں نے ایک موڑ پر پیچھے مڑ کر دیکھا، ہم آبادی سے بہت دُور نکل آئے تھے۔ موسم صبح سے ہی خوشگوار تھا۔ تاحدِ نظر پھولی ہوئی سرسوں کے بسنتی کھیت دھوپ میں چمک رہے تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں گُلِ لالہ کے سُرخ دھبّے دکھائی دے رہے تھے۔ اِن سے پرے ہرے



سینکڑوں بادبانی کشتیاں سطحِ آب پر ساکن کھڑی تھیں

بھرے پتہ قد درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ اس خوبصورت میدان میں صرف تیز رنگ ہی نمایاں تھے۔ گلِ لالہ کا آتشیں سُرخ، نیلگوں آسمان، تیز بسنتی اور گہرا سبز۔ دھوپ کی شدت نے رنگوں کی تیزی میں خیرہ کُن چمک پیدا کر دی تھی۔ میرے سامنے قدرت کی نیرنگیوں کا ایک وسیع کینوس پھیلا ہوا تھا۔ ہوا میں ایک چُلبلاتی ہوئی مہک اور مخمور کُن تازگی تھی میرے ذہن میں ولندیزی مصوّر فان گوگ کے شوخ رنگ۔ موپاساں کی قدرتی منظر نگاری اور جوش کی نظم "زندگی" کے الفاظ تیرنے لگے۔ اُس لمحے زندگی کتنے خوبصورت رنگوں سے مزین تھی۔ دھانی، چمپئی، آسمانی، سنہری، ارغوانی۔

"مشیل ۔" کیرن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر ایک ٹیلے پر کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ باقی تمام لوگ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا اُس کے پاس پہنچا۔

" دریائے ایلبا " کیرن نے ہاتھ سے ہوا میں نیم دائرہ بناتے ہوئے سامنے اشارہ کیا۔ کچھ فاصلے پر جہاں پگڈنڈی ختم ہوتی تھی وہاں دریائے ایلبا کا پُرسکون پانی میلوں تک پھیلا ہُوا تھا۔ دریا کی گذرگاہ کے ایک پہلو میں سینکڑوں بادبانی کشتیاں سطحِ آب پر ساکن کھڑی تھیں کشتیوں کے لمبے مستول ابھی تک خالی تھے۔ اِن پر بادبان لپیٹے ہوئے تھے۔ پانی کے درمیان میں لکڑی کے تختوں کا ایک مضبوط رستہ تھا جس کے گرد مختلف قدوقامت کی کشتیاں رسّوں سے بندھی ہوئی تھیں جیسے ہمارے دیہات میں بیلوں کو کھُرلی کے دونوں طرف باندھ دیا جاتا ہے۔ چند کشتیوں کے مالک بانس کے مستولوں پر چڑھ کر بادبان کھول رہے تھے۔ بادبانوں میں ہوا بھرتی تو کشتی ایک اصیل مرغ کی مانند سینہ پھُلا کر سینۂ آب پر رواں ہو جاتی۔ گوئٹر نے بھی اپنی کشتی یہیں باندھ رکھی تھی اور اُس کا ارادہ آج ہمیں سیر کرانے کا تھا۔ لیکن جب فالکر نے مستول پر چڑھ کر بادبان کھولے تو معلوم کہ اُن پر موم کی ہلکی تہہ جو کپڑے کو پانی سے محفوظ رکھتی ہے بالکل اُتر چکی ہے۔ واٹر پروف بادبانوں کے بغیر کشتی چلانا خطرے سے خالی

ایلبا کے کنارے بادبان اُبلے جارہے ہیں



نہیں ہوتا اِس لیے فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے بادبانوں پر موم چڑھالی جائے۔ اِس مقصد کے لیے موم کو آہنی تسلوں میں اُبالا جاتا ہے اور پھر بادبان اِس اُبلتی ہوئی موم میں بھگو کر سکھا لیے جاتے ہیں۔ دو پہیوں والی ایک گاڑی پہ بادبان اور دوسری پر کشتیوں کی کلب سے حاصل کردہ آہنی تسلے رکھے گئے اور ہم اِن کو دھکیلتے ہوئے سرکنڈوں کے ایک گھنے جُھنڈ کو پار کر کے دریا کے کنارے پر لے آئے۔ اِس جگہ دریائے ایلبا کا پاٹ بہت وسیع تھا اور دوسرا کنارا ایک دُھندلی لکیر کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ پتھروں کے حفاظتی بند اور دریا کے پانی کے درمیان خشک ریت کا ایک وسیع میدان تھا۔ پکنک کے لیے ایک موزوں جگہ تلاش کر کے قافلہ رُک گیا۔ فالکر نے سرکنڈوں میں سے لکڑیاں چُن کر الاؤ روشن کیا اور موم کو تسلوں میں ڈال کر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا گیا۔

سنہری بالوں والی گڑیا نے میری اُنگلی پکڑ لی۔ "انکل آئیے ریت میں کھیلتے ہیں۔" گڑیا کے ہاتھ میں ایک بڑا گیند تھا۔

"مَیں بھی کھیلوں گی۔" کیرن نے گڑیا سے گیند لے کر ہوا میں اُچھال دیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے بچے بھی کھیل میں شریک ہو گئے۔ ہمارے سامنے ایلبا سے ایک چھوٹی ندی جُدا ہو کر سرکنڈوں کی جانب مڑ گئی تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے ساتھ چند لوگ پانی میں نہا رہے تھے۔ کچھ ریت پر اوندھے لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔

"ندی کے دوسرے کنارے پر لیٹے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے ہو؟" کیرن نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔ "جانتے ہو اُنہوں نے نہانے کے لیے کیا پہن رکھا ہے؟"

مَیں نے آنکھیں میچ کر جاننے کی کوشش کی۔ "بہت دُور ہیں۔ صاف دکھائی نہیں دیتا۔"

"وُہ سب پیدائشی لباس میں ہیں۔"

"یعنی وُہ بالکل . . . ." مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بالکل" کیرن نے گیند گڑیا کی طرف اُچھال دیا اور پھر اُس کے پیچھے بھاگ گئی۔

سورج کی پرستش یورپ کا غیر سرکاری مذہب ہے۔ اُن کے نزدیک ہر درد کا درماں "دھوپ سینکنا" ہے۔ ڈاکٹر حضرات بھی اطالیہ اور ہسپانیہ کی سنہری دھوپ کو اکسیرِ اعظم کا درجہ دیتے ہیں۔ جو لوگ سفر کی توفیق نہیں رکھتے وہ بجلی کے بڑے اور تیز قمقموں کے سامنے لیٹ کر اور ریکارڈ پلیئر پر ہسپانوی دھنیں بجا کر ہی اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ بعض منچلے تو اپنے جنون میں اِس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ اُنہیں دھوپ سینکنے کے دوران ڈھائی گرہ کا جامۂ غسل زیبِ تن کرنا بھی ناگوار گذرتا ہے۔ چنانچہ اس نیک مقصد کے لیے متعدد انجمنیں قائم ہیں۔ "عشاقِ آفتاب کلب" "قدرتی روپ کے متوالوں کی کلب" اور "پرستشِ قدرت کلب" وغیرہ۔ اِسی قسم کی ایک کلب چند برس پیشتر جنوبی فرانس کے ساحلی جزیرے "آئل ڈی لیوان" میں بھی قائم تھی۔ میں اُن دنوں اپنے دو انگریز دوستوں کے ہمراہ مانٹی کارلو میں چھٹیاں گذار رہا تھا۔ اُنہیں انسانوں کا یہ قدرتی رنگ دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ وُہ زبردستی مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ "لیوان" کے لیے نیس شہر سے باقاعدہ سٹیمر چلتے تھے۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد جب "لیوان" کی بھوری اور خشک زمین نیلے سمندر میں سے اُبھری تو اکثر مسافروں نے کپڑے اتار کر جامۂ غسل زیب تن کر لیے۔ مَیں ایک نیلی نیکر اور پیلے رنگ کی سپورٹس شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گھاٹ پر اُترتے ہی کلب کے ایک کارندے سے پالا پڑ گیا۔ "مہربانی کر کے اپنے تمام کپڑے اتار دیجیے۔"

"مَیں تو صرف دیکھنے آیا ہوں۔" مَیں نے گھبرا کر اپنی نیکر کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح تھام لیا جیسے مجھے خدشہ ہو کہ کہیں وہ حضرت زبردستی پر نہ اُتر آئیں۔

"پھر مجبوری ہے۔ کپڑے پہن کر جزیرے میں داخل ہونا ممنوع ہے۔"

اُدھر میرے انگریز دوستوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ حکم کی تعمیل کی اور کلانچیں بھرتے ہوئے جزیرے میں غائب ہو گئے۔ اِس دوران مَیں گھاٹ پر بیٹھا اُن کا انتظار کرتا رہا اور شام کو بے نیل و مرام واپس نیس پہنچ گیا۔

"ٹن ٹن ٹن۔ ٹن۔۔۔" فالکر ایک لکڑی سے آہنی تسلے کو زور زور سے بجا رہا تھا۔ "خواتین و حضرات کھانا تیار ہے۔" پتھروں پر الاؤ روشن تھا۔ ہر ایک کو ایک ڈبل روٹی، پکے گوشت کا ٹکڑا اور حسبِ پسند بیئر یا اورنج جوس کی بوتل تھما دی گئی۔ مَیں نے اپنے حصّے کا گوشت ایک سلاخ پر لٹکا اور آگ میں جھونک دیا۔ چربی پگھل کر لکڑیوں پر گرتی تو الاؤ اور تیز ہو جاتا۔ کھانے کے بعد سب نے مل کر بادبانوں کو اُبلتی ہوئی موم میں اچھی طرح بھگویا اور پھر ریت پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیا۔ دریائے ایلبا سے آتی ہوئی خنک ہوا اور بھُنے ہوئے گوشت کی آمیزش نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی۔ مَیں حفاظتی بند کے آگے اُگے ہوئے گھنے سرکنڈوں کے اندر چلا گیا اور کچھ دُور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے کُنج میں سستانے کے لیے لیٹ گیا۔ سرکنڈوں میں سے گذرتی ہوئی خنک ہوا کی دل آویز سرسراہٹ اور نیم تاریک ماحول اونگھنے کیلیے نہایت موزوں تھا۔ جانے میں وہاں کتنی دیر تک وقت اور مقام کی حدوں سے بے خبر بیٹھا رہتا اگر فالکر میری تلاش میں اُدھر نہ آ نکلتا۔

"ہم سب تمہیں پچھلے ایک گھنٹے سے تلاش کر رہے ہیں۔ آخر ان سرکنڈوں میں چھُپ کر لیٹے رہنے میں کیا تُک ہے؟" اُس نے مجھے نہایت غصّے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم جانو ہم مشرق کے باسی کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے ہیں۔" مَیں نے جھینپ کر کہا۔

"اب تم مغرب میں ہو۔" اُس نے ہنس کر کہا اور ہاتھوں سے سرکنڈے ہٹاتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں جب واپس کنارے پر آیا تو ایلبا پر ڈھلتے سُورج نے ایک سُرخ چادر پھیلا رکھی تھی۔ بادبانی کشتیاں دُور سے پانی کی سطح پر بالکل ساکن لگ رہی تھیں۔ اب واپسی کی تیاری تھی گونتر اور کالن ریت پر پھیلائے ہوئے بادبانوں کو سمیٹ کر ڈبیوں والی گاڑی میں رکھ رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آج بادبان اچھی طرح سوکھ نہیں پائے" گونتر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اِس لیے ایلبا میں کشتی رانی کسی اور دن پر اٹھائے رکھتے ہیں۔"

"آؤ ان خالی بوتلوں اور ڈبوں کو دریا میں پھینکیں۔" فالکر نے دریا کی سطح پر نظر جما کر کہا،

"دیکھیں کون دور پھینکتا ہے۔"

مَیں نے اورنج جوس کی ایک بوتل اُٹھائی اور بازو گھُما کر پورے زور سے دریا کی پُرسکون اور ڈوبتے سُورج کی آخری کرنوں سے روشن سطح پر لڑھکا دی۔ بوتل ایک چھنا کے کے ساتھ پانی سے ٹکرائی اور پھر اُسی لمحہ شڑاپ سے ڈوب گئی۔ دریائے ایلبا کے کنارے ایک خوبصورت پکنک اور ایک چمکتے ہوئے دِن کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

پریوں کا شہر۔ اوڈنزے

"یہ ڈنمارک کے پہلے نانبائی کی دُکان ہے" جرمنی کی سرحد عبُور کر کے ڈنمارک میں داخل ہوتے ہی آپ کی نظر اِس اشتہار پر پڑتی ہے۔ میں ڈبل روٹی خریدنے کے لیے دُکان کے اندر گیا تو نانبائی نے ڈنمارک کی روائتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

"تم پہلے پاکستانی ہو جو ڈنمارک کے پہلے نانبائی کی دکان میں آئے ہو" اُس نے ڈبل روٹی لفافے میں بند کر کے مجھے تھما دی" اور آخری نانبائی بھی"

"وہ کیسے؟" میں نے ڈبل روٹی سامان کے تھیلے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"باہر جا کر اشتہار کی پُشت پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ لو" اُس نے ہنس کر کہا۔ میں نے باہر آ کر اشتہار کی دوسری طرف دیکھا تو وہاں لکھا تھا" یہ ڈنمارک کے آخری نانبائی کی دکان ہے"

یہ ایک خوبصورت اختراع تھی۔ ظاہر ہے جرمنی کی سرحد عبور کر کے ڈنمارک آنے والوں کی لیے وہ پہلا نانبائی تھا اور ڈنمارک سے جرمنی جانے والوں کے لیے آخری۔ میں نے سڑک پار کی اور تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک موزوں جگہ پر اپنا سامان رکھ کر لفٹ کا انتظار شروع کر دیا۔

آج صبح جب میں ہیمبرگ سے روانہ ہوا تو ایلبا کے کنارے منائی ہوئی حسین پکنک کی یلی اور خوشگوار مہک ابھی تک میرے ساتھ تھی۔ کل کی طرح آج بھی موسم بیحد خوبصورت تھا۔ متعدد لفٹوں کے ذریعے ریکل سے ہوتا ہوا فلینسبرگ پہنچا جو جرمنی کا سرحدی شہر ہے، اور اب میں سرحد عبور کر کے ڈنمارک میں کروزا کے مقام پر کھڑا تھا۔ سڑک پر کاروں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اکثر لوگ صبح سویرے یا شام کے وقت سرحد عبور کرتے ہیں اور اب دوپہر ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جرمنی کی سرحد کی طرف سے ایک سُرخ رنگ کی سپورٹس کار فراٹے بھرتی ہوئی نکلی۔ میں نے ایکدم ہاتھ آگے کر دیا تو کار رُک گئی۔ درمیانی عُمر کی ایک خوش شکل سُرخ بالوں والی عورت ڈرائیور کی نشست پر بیٹھی تھی۔

"کہاں جاؤ گے؟" اُس نے آنکھوں سے کالا چشمہ اُتار کر میرا جائزہ لیا۔

"اوڈنزے" (Odense) میں نے نیچے جُھک کر جواب دیا۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے سٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا کر دروازہ کھول دیا۔

کار میں چونکہ صرف دو نشستیں تھیں اس لیے میں نے سامان کا تھیلا اپنی گود میں ہی رکھ لیا۔ عورت نے خود ہی دروازہ بند کیا۔ چشمہ آنکھوں پر جمایا اور ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ کار ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی اور میں سامان سمیت باہر گرتے گرتے بچا۔

"ایزی بوائے" (Easy Boy) سرخ بالوں والی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

ایک تو کار بغیر چھت کے تھی اور دوسرے رفتار نہایت تیز تھی نتیجہ یہ نکلا کہ میں ہوا سے بچاؤ کی خاطر اپنے سامان کے پیچھے سر نیوڑھائے دبکا رہا اور ارد گرد کے خوبصورت مناظر دیکھنے سے محروم رہا۔

"انگریزی جانتے ہو؟" سُرخ بال مجھ سے مخاطب تھے۔

"ہاں جانتا ہوں" میں نے آنکھوں سے بہتا ہوا پانی رومال سے پونچھا

"تو پھر بولتے کیوں نہیں؟ میں نے تمہیں لفٹ اس لیے تو نہیں دی تھی کہ تم اپنے سامان میں سر دیئے خاموش بیٹھے رہو۔"

گویا لفٹ کی قیمت چرب زبانی طے پائی تھی۔

"محترمہ اگر آپ یہ کار قدرے آہستگی سے چلائیں تو کچھ عرض کروں" میں نے غصے سے جواب دیا۔

"سوری" اُس نے میری بات کا بالکل بُرا نہ منایا اور رفتار کم کر دی۔

میں نے سامان کے پیچھے سے اپنا سر اُٹھایا۔ ایک ہاتھ سے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کیا۔ پہلے فر فر اپنا تعارف کروایا اور پھر محترمہ کا حدودِ اربعہ دریافت کیا۔

"میں امریکی ہوں" محترمہ گویا ہوئیں "خاندانی کلیسا میں محفوظ شجرۂ نسب کے مطابق میرے آباؤ اجداد ڈنمارک سے ہجرت کرکے امریکہ کی ریاست ٹیکساس میں جا بسے تھے۔ میں یورپ کے میں تفریح کی غرض سے آئی تھی۔ سوچا لگے ہاتھوں آبائی وطن کی زیارت ہی کر لی جائے۔"

"آپ اپنے بال بچے امریکہ میں چھوڑ آئی ہیں کیا؟" میں نے ذرا سوشل ہونے کی کوشش کی۔

"کونسے بال بچے؟" وہ تیوری چڑھا کر بولی "میں غیر شادی شدہ ہوں" اور ساتھ ہی کار کی رفتار پھر تیز کر دی۔

"اچھا ہی ہوا جو میرے آباؤ اجداد اس ڈاک کے ٹکٹ جتنے ملک سے ہجرت کر گئے" اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ناک چڑھا کر کہا "ہر طرف یا تو صرف زراعتی فارم نظر آتے ہیں یا گائیں۔ سؤر اور بطخیں۔"

"لنڈن اور نیویارک کی گھریلو عورتیں تو ڈنمارک کے گائے کے گوشت اور مکھن کی بیحد دلدادہ ہوتی ہیں۔"

"میں گھریلو عورت نہیں ہوں۔ ایک انشورنس کمپنی کی مینجر ہوں۔"

پھر غلطی ہو گئی تھی۔

کولڈنگ کے شہر سے بائیں ہاتھ مڑ کر ہم نے ایک لمبا پل عبور کیا جو ڈنمارک کے حصے جٹ لینڈ کو فیونن کے جزیرے سے ملاتا ہے۔ فیونن اور دوسرے جزیرے زی لینڈ کے درمیان چونکہ سمندری فاصلہ زیادہ ہے اس لیے وہاں دوسری طرف جانے کے لیے سٹیمر استعمال ہوتے ہیں جن کا

صدر مقام کوپن ہیگن زی لینڈ کے جزیرے پر واقع ہے۔ ڈنمارک کی سطح تقریباً تقریباً ہموار ہے۔ بلند ترین پہاڑی کی اُونچائی پانچ سو فٹ سے بھی کم ہے۔ اہل ڈنمارک کی روایتی خوش دلی نے اس منی پہاڑ کو "الپس" کا بلند و بالا نام دے ڈالا ہے۔ یہ ملک اتنا چھوٹا ہے کہ کسی بھی مقام سے سمندر تک کا فاصلہ تیس پینتیس میل سے زیادہ نہیں۔ ڈیری کی اشیاء کے علاوہ یہاں کی کینڈ کردہ بیئر بھی دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ جو بقول فالکر فرانسیسی شمپین سے بھی زیادہ حظ دیتی ہے اپنے ننھے مُنے وجود کے باوجود اس ملک نے کئی قابلِ قدر ہستیوں کو جنم دیا۔ ان میں فلاسفر کرک گارڈ۔ داستان گو اینڈرسن سائنسدان بوہر فلم ڈائرکٹر ڈائر اور موسیقار کارل نیلسن سرِفہرست ہیں۔

اب ہم اوڈنزے کے قریب پہنچ رہے تھے۔

"آخر تم اوڈنزے کیوں جا رہے ہو؟" سُرخ بال میری ساری خطائیں بھول چکے تھے۔

"اوڈنزے؟" میری آنکھوں کے سامنے دُودھیا پھلجھڑیاں چھوٹیں اور پریاں ناچنے لگیں۔

"وہاں ہانز کرسچن اینڈرسن رہتا تھا۔"

"ہا۔ ہا" سُرخ بالوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا "بگ بوائے کو ابھی تک پریوں کے قصے پسند ہیں" اُس کی ہنسی کسی طرح رُکنے میں ہی نہ آرہی تھی "یہ سب تو بچپن کی چیزیں ہیں۔"

"آپ کی طرح میرے بچپن کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا" میں نے جل کر کہا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے کار سے اُتار دے گی نا! میں نے سوچا۔ سُرخ بالوں والی ڈائن کہیں کی۔

اُس نے ہنسنا بند کر دیا اور یکدم سنجیدہ ہو گئی "ہاں شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

اوڈنزے پہنچنے پر اُس نے کار شہر کے پُرانے ٹاؤن ہال کے سامنے کھڑی کر دی۔ میں کار سے نیچے اُترا۔ لفٹ کے لیے شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنا سفری تھیلا اُٹھانے لگا تو سُرخ بالوں نے اُسے میرے ہاتھ سے لے لیا "اسے کار میں ہی رہنے دو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں" وہ کار سے باہر نکلی اور دروازہ مُقفّل کر دیا "میں بھی پریوں کی کہانیوں کے اس شہر میں گھوم کر آج اور بچپن کے درمیان گزرے ہوئے فاصلوں کا تعین کرنا چاہتی ہوں۔"

"اوڈنزے"۔ اوڈن کا مسکن" اوڈن جو عیسائیت کی آمد سے قبل ان خطّوں میں دیوتا مانا جاتا تھا۔ تنگ پتھریلی گلیاں۔ پُرانی وضع کے چوبی مکانات۔ ہم اینڈرسن کے گھر کی جانب جا رہے تھے۔

وہ اپنے پھٹے ہوئے لباس اور سر کے بالوں میں رنگ برنگے پھول اور جانوروں کے سفید پَر سجا کر انہی گلیوں میں گھومتا رہتا۔ قصبے کے بچّوں کا ایک جمِ غفیر غل مچاتا، اُچھلتا کودتا اُس کے پیچھے لگ جاتا۔ وہ اِن معصوم چہروں کو قصبے سے باہر ایک ندی کے کنارے لے جاتا جہاں ایک اُونچے پتھر پر بیٹھ کر وہ انہیں جَل پریوں، شہزادیوں اور بلبلوں کی کہانیاں سُناتا۔ ہر کہانی کے خاتمے پر بچّے تالیاں پیٹ پیٹ کر اُس سے ایک اور نئی کہانی کی فرمائش کرتے اور وہ اُسی وقت اپنے ذہن پر زور دے کر ایک اور خوبصورت کہانی تخلیق کر لیتا۔ اینڈرسن یُونہی اُس پتھر پر بیٹھا بچّوں کو کہانیاں سُناتا رہا یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔ وہ اُن کے معصوم چہروں کو خوشی اور پسندیدگی کے جذبات سے دمکتے دیکھتا تو اُس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا " بے شک میں ایک عظیم ادیب ہوں،" وہ تالیوں کے شور میں اعلان کرتا " لیکن تعریف تو صرف اُس خدا کے لیے ہے جس نے مجھے عظیم بنایا۔"

اُس کی بے پناہ مقبولیت صرف اوڈنزے کے بچّوں تک محدود تھی۔ قصبے کے بڑے بوڑھے اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے۔" ایک ایسا شخص ادیب کیسے ہو سکتا ہے جس کا باپ موچی اور ماں گھریلو خادمہ تھی اور جس نے ایک خیراتی ادارے میں تعلیم حاصل کی ہو۔" اینڈرسن جہاں بھی جاتا اُس پر لعن طعن کی بھرمار ہوتی۔ وہ سوچتا۔ شاید یہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جیّد نقّاد اور امیر لوگ ہی ایک عظیم ادیب کی پہچان کر سکتے ہیں۔ اوڈنزے کے معصوم بچّوں کی تالیاں اور تعریف بھلا کیا معنی رکھتی ہے۔ اُس کا دل بجھ گیا اور اُس نے اپنے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ قصبے کے بچّے اپنی پسندیدہ کہانیاں سننے کے لیے ترس گئے، وہ سب بے حد اُداس تھے۔ وہ اکثر اُس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز میں اُس کی کہانیوں کے نام دُہراتے۔" ہمیں ننھی جَل پری چاہیئے۔ ہمیں بدصُورت بطخ کی کہانی سُناؤ" اور پھر شور مچاتے تاکہ وہ باہر نکل کر انہیں ندی

کے کنارے سیر کے لیے چلے۔ لیکن وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا کڑھتا رہتا۔

اسی دوران اُسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ لڑکی کو جب اینڈرسن کے جذبات کا علم ہوا تو اُس نے اُسے ایک خط لکھا "میرے دل میں تمہارے لیے عزت کے جذبات تو ہیں لیکن میں تم جیسے بدصورت آدمی سے کبھی محبت نہیں کرسکتی۔" اینڈرسن کو پہلی بار اپنی لمبی ناک، دھنسی ہوئی آنکھوں اور چہرے کی اُبھری ہوئی بدنما ہڈیوں کا احساس ہوا۔ اس آخری صدمے نے اُسے نڈھال کردیا اور اُس نے ملک سے باہر جانے کی ٹھان لی۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں اس کی کہانیاں شائع ہوچکی تھیں اور وہاں اُس کا خاصا شہرہ تھا۔ وہ پرشیا گیا تو وہاں کے بادشاہ نے اُس کے اعزاز میں ایک پرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا۔ ہالینڈ، انگلینڈ اور اطالیہ میں اس کا فقیدالمثال استقبال ہوا اور بیشمار ادبی انعامات سے نوازا گیا۔ اوڈنزے کے عوام اور اخبارات نے پھر بھی اپنے عظیم سپوت کی ادبی صلاحیتوں کا اقرار نہ کیا۔ وہ یورپ سے واپس آیا تو اسے پھر طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا۔ "یہ ہے وہ بن مانس جو صرف باہر کے ملکوں میں مشہور ہے۔" وہ جہاں سے گزرتا لوگ ٹھٹھا کرتے۔

جہاں تک اس بن مانس کا تعلق ہے اُس نے "بدشکل بطخ" "بلبل" "فر کا درخت" جیسی کہانیاں اور ننھی جل پری ایسے کردار تخلیق کیے۔ اُس نے اپنی بدصورتی اور لوگوں کی نفرت کو معصوم اور خوبصورت کہانیوں کا روپ دے دیا۔ جب وہ مرا تو اُس کی محبوبہ کا وہ خط جس میں اُس نے پینتالیس سال قبل اُس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا اُس کے سینے کے گرد ایک مخملی پوٹلی میں بندھا ہوا ملا۔ آج اُس کی کہانیاں تقریباً دُنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کی جاچکی ہیں۔ اینڈرسن کی عظمت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ دنیا کے ہر خطّے میں رہنے والے بچّے چاہے لاہور میں ہوں یا پیکنگ میں۔ ٹمبکٹو کے رہنے والے ہوں یا نیویارک کے وہ ہر شب اپنے سرہانے تلے "اینڈرسن کی پریوں کی کہانیاں" رکھ کر سوتے ہیں اور پھر حسین ننھی مُنّی جل پریاں اُن کے خوابوں میں ناچتی ہیں۔ یورپ میں انجیل کے بعد یہی کہانیوں کی کتاب

سب سے زیادہ شائع ہوئی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اینڈرسن آج اپنے ملک ڈنمارک سے بھی زیادہ معروف ہے جس کے ایک چھوٹے سے قصبے کی تنگ گلیوں میں وہ بالوں اور لباس میں پھول سجائے گھوما کرتا تھا۔

اینڈرسن کے گھر کو اب ایک عجائب گھر کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہاں سوکھے ہوئے پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا ہے جو کسی بچے نے اُسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ کانچ کی گولیاں۔ وہ مخمل کی پوٹلی جس میں اس کی محبوبہ کا خط محفوظ تھا۔ ذاتی استعمال کی لاتعداد اشیاء۔ اور پھر اس کا بستر جس کی جانب اشارہ کرکے گائڈ آپ کو بتاتا ہے "ڈینی کے جس نے اینڈرسن کی حیات پر مبنی ہالی وڈ کی فلم میں اینڈرسن کا کردار ادا کیا تھا اِس بستر پر سویا تھا" یعنی بڑائی ڈینی کے کی تھی جو یہاں سویا اینڈرسن کی نہیں جو اس کا مالک تھا۔ گائڈ کے اس فقرے پر مجھے احساس ہوا کہ شاید اوڈنزے کے عوام کو اب بھی اینڈرسن کی عظمت کا یقین نہیں آیا۔ "جس کا باپ ایک موچی تھا اور ماں گھریلو خادمہ..."

اینڈرسن کے گھر کے پہلو میں پرانی وضع کا ایک ریستوران ہے جو اُس کی مشہور کہانی "بدشکل بطخ" سے موسوم ہے۔ ریستوران کی تمام آرائش اور فرنیچر اینڈرسن کے دَور کا ہے۔ دیواروں پر اُس کی مختلف کہانیوں کے کرداروں کی قدِ آدم تصاویر اور اس کی کتابوں کے اولین نسخے آویزاں ہیں۔

ہم شہر کے اُس خوبصورت پارک میں بھی گئے جہاں سرسبز درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک خاموش ندی کے کنارے اینڈرسن نے "بدشکل بطخ" کی لازوال کہانی تخلیق کی۔ وقت کے تیز دھارے اِس پُرسکون ندی اور گرد کے جنگل کی خوبصورتی کو متاثر نہیں کر سکے۔ شام کے جھٹپٹے میں سینکڑوں سفید بطخیں پانی میں تیر رہی تھیں۔ ہم پارک سے نکل کر واپس ٹاؤن ہال کے چوک میں آئے تو نو بج چکے تھے۔ شمالی خطوں کی مخصوص نیم تاریک شب میں اوڈنزے کے کوچہ و بازار سنسان پڑے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اِس مکمل سکوت میں ابھی دیر

سے پَروں کی ہلکی سرسراہٹ ہوگی۔ لاکھوں گُل رنگ انار چھوٹیں گے اور پریوں کا ایک جگمگاتا آسمان سے اُتر کر قصبے کی گلیوں میں ناچنے لگے گا۔ اور پھر وہ سب مل کر اپنے خالق اینڈرسن کے پُرانے مکان کو اپنے روپہلی پَروں کے جال سے ڈھک دیں گی۔ جس سے پھوٹتی ہوئی کرنیں اس وسیع دُنیا میں پھیل کر نیند میں مدہوش ننھے مُنے معصوم بچوں کے سینوں میں سما جائیں گی اور وہ سوتے میں مُسکرا دیں گے۔

کوپن ہیگن کی دیوالی

سُرخ بالوں والی کار میں خاموش بیٹھی ٹاؤن ہال کی پُرانی عمارت کو تک رہی تھی۔
"میں آج پھر بچپن کی سرحدوں کو چھو آئی ہوں" اُس نے قدیم عمارت پر سے نظر ہٹائے بغیر اُداس ہو کر کہا "تم ٹھیک کہتے تھے مجھے اِن سرحدوں پر دستک دینے کیلئے بہت فاصلہ طے کرنا پڑا ہے۔"
میں نے اپنا سفری تھیلا اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "اوڈنزے تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے میرے ساتھ کوپن ہیگن تک کیوں نہیں چلتے؟" تجویز معقول تھی پھر جانے کون کل تک یہ فسوں رہے نہ رہے اور دن کی روشنی میں اوڈنزے ایک سیدھا سادھا اور معمولی سا قصبہ نکل آئے۔
کوپن ہیگن تک کا سفر رات کی تاریکی میں طے ہوا۔ فیونن جزیرے کے خاتمے پر ہم کار سمیت سٹیمر میں سوار ہو گئے اور ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد دوسری طرف ذی لینڈ میں پہنچ گئے۔ کوپن ہیگن پہنچے تو رات کا پچھلا پہر تھا لیکن ابھی تک گلیوں اور بازاروں میں گہما گہمی تھی۔
"کہاں اترو گے؟"

"کہیں بھی اُتار دیجئے۔"

"اس وقت کہاں مارے مارے پھرو گے۔ ہوٹل برسٹل میں میرا کمرہ بُک ہے تم بھی وہیں سو رہنا۔" میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ دعوت کس جذبے کے تحت دی گئی ہے۔

"کچھ نہ کچھ بندوبست تو ہو ہی جائے گا۔" میں نے تھیلا اُٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔ "بہر حال دعوت کا شکریہ۔"

"تمہیں دراصل پریوں کی کہانیوں سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے" سُرخ بالوں نے مایوس ہو کر کہا اور کار شہر کے بڑے چوراہے کی جانب موڑ دی۔

سکینڈے نیویا کی فضائی کمپنی کے دفاتر کے ساتھ چوڑے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا میں شہر کے مرکز میں آ گیا۔ "راڈٹس" یعنی ٹاؤن ہال کی تانبے کی چھت کے نیچے پتھریلی سیڑھیوں پر لاتعداد سیاح اور ہپی سو رہے تھے۔ سورج طلوع ہونے میں چونکہ صرف دو تین گھنٹے باقی تھے اس لیے میں نے بھی صبح تک وہیں بسیرا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک کونے میں جہاں نسبتاً صاف ستھرے ہپی محوِ خواب تھے میں نے سونے کا تھیلا بچھایا اور باقی سامان سر تلے رکھ کر سو گیا۔ اگرچہ میرے سرہانے تلے "اینڈرسن کی کہانیوں کی کتاب" نہیں تھی مگر پھر بھی اُس شب میرے خوابوں میں پریاں ناچیں اور کبھی کبھی سُرخ بالوں والی ڈائنیں بھی، میری آنکھ کھُلی تو کوپن ہیگن کا مشفق سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ٹاؤن ہال کے فوارے کی پھوار میرے چہرے اور تھیلے کو بھگو گئی۔ میں نے سر اُٹھا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تو سوائے میرے گزشتہ شب کے تمام مکین اپنا بوریا بستر سمیٹ کر جا چکے تھے۔ سکول کے بچوں کا ایک گروہ میرے گرد کھڑا مجھے بیحد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کمال عجلت سے اپنا "بستر" لپیٹا اور سامان اُٹھا کر سڑک کے پار سنٹرل سٹیشن میں واقع ٹورسٹ آفس میں آ گیا جہاں رہائش کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر میں تو تمام ہوٹل بھرے پڑے ہیں البتہ کوپن ہیگن سے دس میل با-

تاسترپ کے قصبے میں رہائش کا انتظام ہو سکتا ہے اور وہاں پہنچنے کے لیے مضافاتی ریلوے میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ سٹیشن پر ٹکٹوں کی کھڑکی اور ٹکٹ چیکر کی غیر موجودگی سے میں نے یہ تاثر لیا کہ ٹکٹوں کی ترسیل گاڑی میں ہی ہوتی ہوگی۔ گاڑی جب شہر سے نکل کر مضافات میں آگئی تو میں نے سامنے بیٹھی ایک اُدھیڑ عمر عورت سے ٹکٹ کی بازیابی کے بارے میں استفسار کیا۔ اُس نے منہ میں ایک دبیز قسم کا لمبا سگار اُڑس رکھا تھا۔ "سٹیشن کے باہر لگی ہوئی مشینوں سے ملتے ہیں" اُس نے ایک لمبا کش کھینچ کر خوشدلی سے کہا۔ "میں اِس بارے میں لاعلم تھا۔ اب کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا "فکر نہ کرو" اُس نے میری گھبراہٹ بھانپ لی "یہاں ٹکٹ چیکر نہیں ہوتے۔ اگر حکومت چیکر ملازم رکھے تو اُن کی تنخواہ اُس رقم سے جو بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں سے وصول ہو سکتی ہے، تجاوز کر جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا ضمیر ہی چیکر کا کام دیتا ہے بہرحال واپسی پر ڈکٹ خرید کر تلافی کر دینا" تاسترپ کے سٹیشن پر اُتر کر میں نے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ واقعی چیکر اور گارڈ ندارد تھے۔ ٹورسٹ آفس کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ اصطبل کہلانے کی مستحق تھی۔ قصبے سے باہر یہ ہوٹل ایک ڈینش کسان کی ملکیت تھا جو اُسے سارا سال سبزیوں کے گودام کے طور پر استعمال کرتا اور گرمیوں میں سیاحوں کی آمد پر کمرے جھاڑ پونچھ کر کرائے پر چڑھا دیتا۔ میرے کمرے سے ابھی تک سڑے ہوئے شلجموں کی بُو آ رہی تھی۔ بہرحال کرایہ میری جیب کے عین مطابق تھا۔

"حوائج ضروریہ کے لیے آپ کو باہر جانا پڑے گا" کسان کی بیوی نے بستر پر اُجلی چادریں بچھاتے ہوئے کہا۔

"باہر؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔ جب بھی مجھے اپنے آبائی گاؤں جانے کا اتفاق ہوتا "باہر بیٹھنے" کا مسئلہ میرے لیے سوہانِ رُوح بن جاتا۔ بہت خوب یعنی ڈنمارک کا تاسترپ پاکستان کے جوکالیاں سے کچھ اِس قدر مختلف بھی نہ تھا "آپ کا مطلب ہے کھیتوں میں؟"

کسان کی بیوی نے چادر کی شکنیں درست کرتے ہوئے ایکدم مُڑ کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرا

دماغ چل گیا ہو اور پھر بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔

"رو کھیتوں میں؟" اُس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے اُسے اپنے مُنہ میں داب لیا اور اپنے بچّوں کو آوازیں دینے لگی جیسے اندر تماشہ ہو رہا ہو۔ بچّوں کو صُورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بھی بے تحاشہ دانت نکالنے لگے۔ "نہیں نہیں" اُس نے بلکل انگلی منہ سے نکالی اور فارم کے سرے پر طرف اشارہ کیا" باہر سے مطلب ہے اِس کمرے سے باہر بھوسے والے گودام کے پاس جہاں غسل خانہ ہے" اُس خوش و خرم خاندان کے کمرے سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے کپڑے بدلے اور واپس آسترپ کے سٹیشن پر آ گیا جس کے باہر ٹکٹ مشین میں ایک کرونز کا سکّہ ڈالتے ہی ایک ٹکٹ برآمد ہو گیا۔ میں چلنے لگا تو سگار والی بڑھیا کی بات یاد آ گئی "واپسی پر دو ٹکٹ خرید کر تلافی کر دینا" میں نے دوسرا سکّہ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ میرے ضمیر کا چکر آج چھٹی پر تھا۔

"سکینڈے نیویا" یعنی ڈنمارک سویڈن اور ناروے کے باشندوں کے لیے کوپن ہیگن اُسی حیثیت کا حامل ہے جو پیرس کی باقی یورپ کی نظروں میں ہے۔ جہاں پیرس ایک حسین شہزادی کی طرح مغرور اور اپنے حسن پر نازاں ہے وہاں کوپن ہیگن اُس نوجوان دیہاتی دوشیزہ کی مانند ہے جو کسی طرح بھی شہزادی سے کم حسین نہیں مگر اُس میں تکبّر نام کو نہیں۔ یہاں کسی سے راستہ پوچھ بیٹھیے تو خود چھوڑنے چلے جائیں گے بلکہ کھانے پر بلا لیں گے اُدھر یہی بات کیجیے تو کھانے کو آئیں گے۔ ۱۱۶۷ء میں بشپ ابسالون نے جس کا مجسمہ ٹاؤن ہال کے سامنے ایستادہ ہے اِس شہر کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ یہ چھوٹی سی بندرگاہ جلد ہی ایک وسیع تجارتی مرکز کی صورت اختیار کر گئی اور اِسی مناسبت سے "کوبن ہیون" یعنی تاجروں کی بندرگاہ کہلائی۔ سنٹرل سٹیشن کے ساتھ ہی کوپن ہیگن کا صدیوں پُرانا تفریحی پارک "تِوالی" ہے جو اپنے بیس ایکڑ سے زائد رقبے میں ہر عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان سمیٹے ہوئے ہے۔ تِوالی ماہ مئی سے ستمبر تک کئی ریستورانوں موسیقی کے ہالوں، تھیٹروں اور عوامی دلچسپی کے دُوسرے لوازمات کی وجہ سے ایک سدا بہار میلے کی صُورت اختیار

کرجاتی ہے۔ رنگین پھولوں کے تختے، ننھی منی جھیلیں، ابلتے ہوئے فوارے اور لاتعداد رنگ برنگی روشنیاں روزانہ ہزاروں شہریوں کو اپنی طرف کھینچتی رہیں۔

تِوالی کے صدر دروازے پر ڈنمارک کا پرچم لہرا رہا تھا جس کے نیچے مختلف کھڑکیوں کے آگے ٹکٹ خریدنے والوں کا ہجوم تھا۔ آج ڈنمارک میں "بے سہارا لوگوں کی امداد" کا دن تھا اور بیشمار اپاہج اور معذور لوگ تِوالی کا نظارہ کرنے آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر پہیوں والی گاڑی میں بیٹھے تھے اور باقی نوجوانوں کے سہارے اندر جا رہے تھے۔ پچھلے پہر پارک میں زیادہ رش نہ تھا لیکن شام ہوتے ہی کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ برقی قمقموں کے روشن ہونے سے تِوالی نے ایک نیا روپ دھار لیا۔ یورپ کے دوسرے تفریحی پارکوں کی طرح یہاں روشنیاں تیز اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی نہیں تھیں بلکہ ہلکی گہری روشنیاں اندھیرے میں مکمل مل کر بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ تِوالی کو دیوالی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ایک جگہ "خوشیوں کے باورچی خانے" میں لوگ چینی کے برتنوں کو پتھریلی دیوار پر مار کر چکنا چور کر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو اپنی دبی ہوئی خواہشات کا اظہار چند روپے دے کر کر رہی تھیں۔ ایک صاحب جسم ٹٹول کر وزن بتا رہے تھے۔ غلط ہونے پر آپ انعام کے حق دار ٹھہرتے۔ یہاں بھی عورتوں کا غلبہ تھا جو وزن سے زیادہ طریقہ دریافت میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں۔ رقص گاہوں میں جوانوں کے جسم غیر تھے اور جھیل کنارے شراب خانوں میں بوڑھوں کے ٹھٹھے۔ چہرہ بگاڑنے والے آئینے، بجلی کی چھوٹی کاریں، بھوتوں کی ریل گاڑی غرض کہ تفریح کا ہر نسخہ دستیاب تھا۔ شام کے کھانے کے لیے میں جھیل کنارے کھڑی ہوئی ایک کشتی میں چلا گیا جو تِوالی کا مشہور ریستوران ہے۔ میں نے ویٹر سے مینو کارڈ لانے کو کہا تو وہ تقریباً چار فٹ لمبا ایک کاغذ اٹھا لایا۔ "ڈنمارک کے مشہورِ زمانہ "سمر براد" سینڈوچ ہماری خصوصیت ہیں" میں نے مینو میں درج سینکڑوں اقسام کے سینڈوچوں کے ناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اس فرمانِ شاہی کو ایک طرف رکھتے ہوئے ویٹر سے کہا۔ "مینو کا ارزاں ترین اور حجم میں سب سے بڑا سینڈوچ لے آؤ۔"

سرکے میں بھگوئی ہوئی ہیرنگ اور سالمن مچھلی کا سینڈوچ منہ میں ڈالتے ہی مصری کی طرح گھل گیا۔ کافی کے بعد بل آیا تو جی چاہا کہ اگر کبھی اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کر دیا تو اس ریستوران میں گراں ترین سینڈوچ بھی کھا کر دیکھیں گے کہ ارزاں ترین کا یہ حال ہے۔ میں نے چُپکے سے میں کرونر کا نوٹ طشتری میں ڈال دیا۔

"آپ بُرا نہ منائیں تو میں آپ کی میز پر بیٹھ جاؤں؟" بھورے بالوں والا ایک ڈینش نوجوان مجھ سے مخاطب تھا" باقی ریستوران بالکل پُر ہے۔"

"تشریف رکھیے" میں نے گھٹنوں پر پھیلا ہوا نیپکن اُٹھا کر تہ کیا اور پلیٹ میں رکھ دیا" میں بھی اُٹھنے والا ہوں صرف بل کی بقیہ رقم کا انتظار ہے۔"

"بہت بہت شکریہ" وہ نہایت ممنون نظر آرہا تھا" آپ شاید ایشیائی ہیں۔"

"پاکستانی" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بہت خوب" اُس نے اُٹھ کر گرمجوشی سے ہاتھ ملایا" آپ میرے پہلے پاکستانی ہیں" اُس نے ایسے کہا جیسے میں کسی نایاب نسل کا پرندہ ہوں جو پہلی مرتبہ قابو میں آیا ہے۔ ویٹر واپس آیا تو طشتری میں بل کی بقیہ رقم چند چھوٹے سکّوں کی صورت میں بکھری پڑی تھی۔ سکّوں کو سمیٹنے کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے میں نے کمال فراخدلی سے انہیں ویٹر کو بخش دیا۔ میز سے اُٹھنے لگا تو وہ ڈینش نوجوان بھی ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔" پلیز آپ میرے ساتھ کچھ پیجیے۔ ایک عرصہ سے مجھے آپ کے مُلک اور مذہب کے بارے میں جاننے کا اشتیاق تھا" میں اُس کی یہ دعوت ٹھکرا نہ سکا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک سیاح کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ غیر ممالک کے تہذیب و تمدن کو ہی پرکھے بلکہ اُس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مُلک اور مذہب کو بھی وہاں متعارف کروائے۔ چونکہ باہر کے ملکوں میں ہمارے سفارتی نمائندوں کو اہم دعوتوں اور تقریبوں میں شرکت سے ہی فرصت نہیں ملتی اِس لیے وہاں پاکستان کے بارے میں بھی واضح تخیّل موجود نہیں۔ جرمنی میں امریکی فوج کا ایک کپتان ملا جو اسے افغانستان کا ایک حصہ سمجھتا تھا اور ہسپانیہ میں تو پاکستان کا

نام لیجئے تو وہ اِسے کوئی مشرقی کھانا یا پرندہ ہی سمجھیں گے۔ یورپ کے ایک صدر مقام میں جب میں نے سفارت خانے کے ایک رُکن سے پاکستان کے بارے میں طبع شدہ مواد لوگوں میں تقسیم کرنے کی خاطر طلب کیا تو اُس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں گھاس کھا گیا ہوں۔ وطن سے نکلے ایک ماہ ہونے کو تھا میں نے تازہ اخبار دیکھنے کی خواہش کی تو معلوم ہوا کہ "ریڈنگ روم" میں ڈیڑھ ماہ قبل کے نسخے موجود ہیں۔ ایک کلرک نے بتایا کہ پاکستان سے آیا ہوا اخبار پہلے سفیر صاحب ملاحظہ کرتے ہیں۔ پھر فرسٹ سیکرٹری صاحب کے فلیٹ میں جاتا ہے پھر سیکنڈ سیکرٹری صاحب اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عملے کے تمام ارکان جب فارغ ہو چکتے ہیں تو عام پبلک کے لیے "ریڈنگ روم" میں نمائش کر دی جاتی ہے۔ پاکستان کی سیاحت پر جانے والے مقامی باشندوں کو وہاں کی غلاظت اور گرمی کی شدت سے پہلے آگاہ کر دیا جاتا ہے تاکہ (Image) خراب نہ ہو۔ سفارتی قواعد کے مطابق شاید میں نے اس جرم کا ارتکاب ہر ملک میں کیا ہے۔ جرمن ٹرک ڈرائیور ہو یا روسی مزدور میں نے اُنہیں اپنے ملک کے ہر پہلو کے بارے میں روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال بات ہو رہی تھی اُس ڈینش نوجوان کی جسے میرے ملک کے بارے میں جاننے کا بےحد اشتیاق تھا۔ ہم خاصی دیر تک تِوالی کے کشتی نما ریستوران میں بیٹھے پاکستان اور اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اُس نے بتایا کہ کوپن ہیگن میں بھی ایک مسجد ہے جس کے ڈینش امام نے حال میں ہی قرآنِ پاک کا ترجمہ مُلکی زبان میں کیا ہے۔

"میرا نام موگنز پیٹرسن ہے اور میں کوپن ہیگن کے نواحی شہر راس کلے میں پیدا ہوا" اُس نے اپنے بارے میں مجھے بتایا "میری پرورش سخت قسم کے مذہبی ماحول میں ہوئی۔ والدین عیسائیت کے ایک کٹّر فرقے کے پیروکار تھے اور اپنے فرقے سے باہر کے لوگوں کو قابلِ گردن زدنی قرار دیتے تھے۔ راس کلے ایک خوبصورت شہر ہے۔ جھیل کنارے پرانے کلیسا میں ڈنمارک کے تمام بادشاہوں کے کفن محفوظ ہیں۔ حال میں ہی ایک نیا عجائب گھر تعمیر کیا گیا ہے جس میں وائکنگ (VIKING) دور کا ایک سمندری جہاز رکھا جائے گا۔ مجھے اس ماحول میں

بیحد گھٹن محسوس ہوئی۔ میرے والدین کے عقیدے کے مطابق رحمت اور آفیت کے پاک فرشتے ان کے فرقے کے کلیسا کے گرد ہی منڈلاتے ہیں اور خدا کی نظریں ہر اتوار اس کلیسا میں عبادت کرنے والوں پر ہی گڑی ہوتی ہیں۔ مجھے اُن کے اس عقیدے سے سخت نفرت تھی چنانچہ میں نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا اور بالآخر بدھ مت اختیار کر لیا۔ کوپن ہیگن کے پرانے حصے میں میرا فلیٹ ہے جہاں میں بدھ کی مقدس مورتی کے سامنے روزانہ سجدہ ریز ہوتا ہوں"

اسلام کے بارے میں موگنز کی معلومات بیحد ناقص تھیں اُس نے مجھے بتایا کہ پچھلے سال کچھ مبلغ اُدھر آئے تھے مگر ڈینش زبان سے ناواقفیت کی بنا پر وہ لوگوں کو متاثر نہ کر سکے۔ میں نے وعدہ کیا کہ وطن جاتے ہی آپ سے اسلام کے بارے میں کتابیں بھیجوں گا۔

ٹاؤن ہال کے گھڑیال نے گیارہ بجائے تو ہمیں احساس ہوا کہ توالی بند ہونے کو ہے۔

"آخرت کی فکر تو ہو چکی" موگنز نے میز سے اُٹھتے ہوئے کہا "آیئے اب کوپن ہیگن کی شبینہ زندگی کا بھی نظارا ہو جائے"

توالی سے باہر نکلتے ہوئے میری نظر جھیل کے پار مشرقی طرز کی ایک گنبد نما عمارت پر پڑی۔

"یہ مسجد ہے کیا؟" میں نے موگنز سے پوچھا۔

"نہیں شراب خانہ ہے"

"آپ نے اسلام کا یہی تصور دیا ہے لوگوں کو؟" میں نے دُکھ سے کہا "طرزِ تعمیر اگر سینٹ ہال کے کلیسا کا ہو تو؟"

"مقصد کسی کے مذہبی جذبات مجروح کرنا نہیں۔ یہ صرف کاروبار میں جدت پسندی کا ثبوت ہے" اُس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ توالی سے نکل کر ہم ٹاؤن ہال کے پہلو میں جاتی ہوئی سڑک "سٹرڈگیٹ" پر ہو لیے جو شہر میں خرید و فروخت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور دینس کی مرسیریا سٹریٹ کی طرح صرف پیدل چلنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ آدھی رات ہونے کے باوجود یہاں خوب رونق تھی اور لوگ بھیڑوں کی طرح بے مقصد گھوم رہے تھے۔

سینما، شبینہ کلب اور قہوہ خانے ابھی تک کھلے تھے۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میری نظریں ایک سینما کے باہر آویزاں چند رنگین تصاویر پر پڑیں اور اسی لمحے شرم سے جھک گئیں۔

"موگنز" میں نے حیا سوز تصویروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا یہ بھی جدت پسندی ہے؟"

"بالکل" اُس نے کھسیانے ہو کر کہا "یہ سلسلہ چھ ماہ قبل شروع ہوا تھا جب ہماری حکومت نے اس قسم کی نیلی فلموں (Blue Films) پر عائد شدہ پابندیوں کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ اب ڈنمارک دُنیا کا واحد ملک ہے جہاں ایسی فلمیں بنانے اور ان کی نمائش کرنے کی کُھلی اجازت ہے۔"

"مجھے یہ تو معلوم ہے کہ یورپ میں اور خاص طور پر سیکنڈے نیویا میں جسم سے متعلق اخلاقی اقدار کی چنداں پرواہ نہیں کی جاتی" میں نے سینما کی کھڑکی کے سامنے ٹکٹ خریدنے والے تماشائیوں کی لمبی قطار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن اِن فلموں کی نمائش سے جنسی بے راہروی کو اور زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوتا؟"

"تمہارا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے۔ پابندی ہٹنے کے بعد اہلِ ڈنمارک نے جی بھر کے ایسی فلمیں دیکھیں۔ چونکہ ان فلموں کی کہانیوں میں قدرتی طور پر یکسانیت ہوتی ہے اِس لیے آہستہ آہستہ مقامی لوگوں کا تجسس ختم ہو گیا اور اُن کی جگہ غیر ملکیوں نے لے لی۔ تم دیکھو گے کہ تماشائیوں کی اکثریت سویڈش، جرمن، انگریز اور امریکیوں پر مشتمل ہے۔ اب یہ فلمیں ملک کے لیے ایک نہایت ہی منافع بخش کاروبار کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ اِن فلموں کے علاوہ جنسی اختلاط کے بارے میں ریکارڈ، کتابیں رسائل اور دوسرے لوازمات بھی تیار کیے جاتے ہیں جن کی برآمد سے ہم کثیر زرِ مبادلہ کما رہے ہیں اور اِس تجارت میں ہماری اجارہ داری ہے۔ اگلے ماہ سے یہاں دنیا کا پہلا جنسی میلہ بھی شروع ہو رہا ہے۔"

"یورپی تجارت کی یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے" میں نے سر جھٹک کر کہا "لیکن اگر تو خیر ترکیے

اور لڑکیاں ایسی فلمیں دیکھ کر "سبق" حاصل کریں اور اس سبق کو عملی زندگی میں دُہرانا چاہیں تو؟
"تو کیا؟" موگنز نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے جواب دیا" یہ سیکنڈے نیویا ہے میرے پاکستانی دوست، یہاں کی نئی نسل کو کسی سبق کی ضرورت نہیں بقول کسے یہاں "معصومیت" بچہ گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

سینماؤں کے ساتھ متعدد چھوٹے چھوٹے بک سٹال ایستادہ تھے جہاں بےشمار سیاح وہاں رکھنے والی خاص الخاص کُتب اور رنگین رسالوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ ایک سٹال پر ایک پستہ قد جاپانی نہایت عجلت سے ایک تصویردار رسالے کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ کسی صفحے پر حسبِ ذوق تصویر برآمد ہوتی تو وہ اپنی چپٹی ناک سے عینک اُتار کر اُس کے شیشے صاف کرنے لگتا۔ اُس دَوران اِس کی مہین آنکھیں تصویر پر ہی مرکوز رہتیں۔ عینک دوبارہ پہن کر وہ چند لمحوں کے لیے تصویر کی باریکیوں پر غور کرتا ایک ٹھنڈی آہ بھرتا اور پھر ورق گردانی میں مصروف ہو جاتا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے اور چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ کاؤنٹر پر پڑے رسالوں کا ڈھیر اِس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے اِن رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا۔

"افلیکن فوٹوئیں"؟ اُس نے سر گھما کر کاؤنٹر کی بوڑھی مالکہ سے پوچھا۔ بڑی اماں کے جھریوں سے بھرپور چہرے پر کاروباری مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے کاؤنٹر کے نیچے رکھے ہوئے رسالوں کا ایک پلندہ جاپانی محقق کے آگے ڈھیر کر دیا۔ اِن رسائل میں افریقی اور یورپی تہذیبوں کا "امتزاج" تھا۔ جاپانی نے دو چار صفحے اُلٹنے کے بعد اِنہیں تسلی بخش قرار دیا اور جیب سے نوٹوں کا پلندہ نکال کر بڑھیا کے حوالے کر دیا۔

"افلیکن فوٹو ڈیلی گڈ" اُس نے مُڑ کر ہمیں مژدہ سُنایا جہاں ہم اِس انتظار میں تھے کہ ہماری باری آئے اور ہم سٹال سے سگریٹ خرید سکیں۔ سگریٹ خریدنے کے بعد ہم "سٹروگیٹ" سٹرک کے خاتمے پر بائیں ہاتھ مُڑ کر شہر کے قدیم اور دیدہ زیب حصّے میں داخل ہو گئے جس کے وسط

میں "نیوہیون" یعنی نئی بندرگاہ کا علاقہ ہے۔ کوپن ہیگن کے نیوہیون کو وہی "شہرت" حاصل ہے جو لنڈن کے سوہو، پیرس کے پگال اور ہیمبرگ کے ریپا ہبان کے نام سے وابستہ ہے۔ اس علاقے کے بیچوں بیچ ایک نہر بہتی ہے جس کے دونوں اطراف ڈھلوان چھتوں کے دیدہ زیب مکانات ہیں۔ خانہ خرابی کے تمام لوازمات انہی مکانوں میں ہیں۔ نہر کے آہنی پلوں کے تلے سارا وقت کشتیوں اور موٹر بوٹوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ پہلی نظر میں اس علاقے پر رات کی رنگینیوں کی آماجگاہ کی بجائے کسی رومانی فلم کے سیٹ کا گمان ہوتا ہے موگنز کا اصرار تھا کہ میں یہ علاقہ ضرور دیکھوں کیونکہ یہاں کا "شریفانہ اور دوستانہ ماحول" ڈینش تہذیب کا ایک لازمی جزو ہے۔

"اگر شب کی سیاہی میں ڈنمارک کے شاہی خاندان کے افراد چوری چھپے یہاں آکر رنگ رلیاں منا سکتے ہیں تو عوام الناس کو بھی یہ حق حاصل ہے" موگنز کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک تھی۔ وہ مختلف شبینہ کلبوں اور شراب خانوں میں جھانکتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ وہ اپنے بدھ مت اور بدھ کے مجسّے کو مکمل طور پر فراموش کر چکا تھا۔ "کیپ ہارن چلتے ہیں وہاں بیئر کے علاوہ موسیقی بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے" اُس نے بالآخر فیصلہ سنا دیا۔

کیپ ہارن نامی شبینہ کلب کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سٹیج پر ایک سیاہ فام طائفہ جاز کی ایک مدھم دھن بجا رہا تھا اور چند جوڑے رقص کر رہے تھے بلکہ ایک دوسرے سے لپٹ کر اونگھ رہے تھے۔

"آپ رقص کرنے والے جوڑوں میں سے گزر کر ہال کے دوسرے کونے میں چلے جائیے وہاں ایک میز خالی ہے" ویٹر نے ہمیں مشورہ دیا۔ ہم دونوں چہروں پر فرمائشی مسکراہٹ سجائے جوڑوں سے معذرت کرتے جسموں کے اس انبار میں سے گزرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"اوئے" میں نے درد کی شدت سے مغلوب ہو کر پنجابی میں نعرہ لگا دیا۔ کسی نے میری

کمر کے عین نیچے بڑے زور سے چٹکی بھری تھی۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ درجنوں جوڑے اپنی دُھن میں مگن بڑے سکون سے ناچ رہے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مُشکل تھا کہ یہ کارستانی کن صاحب کی ہے۔

"کیا ہوا؟" موگنسن نے مڑ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ موسیقی سُن کر میں بھی وَجد میں آگیا تھا۔"

میز پر بیٹھتے ہی موگنسن نے بیئر کا آرڈر دے دیا اور میرے لیے کوکا کولا منگا لیا۔ "ایک اندازے کے مطابق ڈنمارک کے باشندے ہر سال اتنی بیئر پی جاتے ہیں کہ اگر اسے انڈیل دیا جائے تو پورا ملک ڈوب جائے۔" اس نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"یعنی ڈوب مرنے کا مقام پیدا ہو جائے" میں نے ہنس کر کہا۔ اُس نے میری بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ڈینش بیئر کی خوبیوں پر بیان جاری رکھا۔ "ہم دنیا کی بہترین بیئر کشید کرتے ہیں۔ ہر شام ہزاروں سنجیدہ مزاج خوش لباس سویڈش باشندے مالمو اور کوپن ہیگن کا درمیانی سمندر پاٹ کر اُس شہر میں وارد ہوتے ہیں اور اسی رات جھُومتے ہوئے اپنے کوٹ کندھوں پر ڈالے ٹائیاں ڈھیلی کیے نشے میں وُھت واپس سویڈن چلے جاتے ہیں۔ یہ سب ڈینش بیئر کے شیدائی ہوتے ہیں۔" یکایک موسیقی بجانے والے جلتی نے کا ٹھا بدلا۔ سیکسافون بجانے والے نے سر نیوڑھا اور ایک بھرپور سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں کی ہوا تانبے کے ناگ نما ساز میں بھر دی۔ بگل نواز نے سینہ پھلایا اور سر پیچھے ڈال کر اپنی پوری طاقت سے بگل بجانے لگا۔ ڈھول نواز بھلا پیچھے کیوں رہتا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چھڑیاں ہوا میں گھمائیں اور سامنے رکھے مختلف ڈھولوں پر بے تحاشہ پل پڑا۔ سازوں کی اس چنگھاڑ میں بیس وائلن کی دُم دُم بالکل دَب کر رہ گئی۔ تیز موسیقی کی بوچھاڑ نے اُونگھتے ہوئے جوڑوں میں برقی لہر دوڑا دی۔ وہ ایک دُوسرے کی باہوں کے چنگل سے علیحدہ ہوئے اور والہانہ طور پر رقص کرنے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ رقاصاؤں کے پاؤں کی دھمک اور موسیقی کی شدت سے ہال کا فرش بیٹھ جائے گا اور چھت بھک سے اُڑ جائیگی۔

موگنسن جو اب تک بیئر کے درجنوں مگ چڑھا چکا تھا سر ہلاتا اور چٹکیاں بجاتا اُٹھا اور رساتھ والی

میز پر بیٹھی ہوئی ایک فضول سی لڑکی کوبے کراس چیختے چلاتے چھلانگیں مارتے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

"سکول" (SKOL) بار کے کاؤنٹر پر بیٹھی ایک لڑکی نے اپنا جام اُٹھایا اور میری طرف دیکھ کر مُسکرا دی۔

"بائی می اے ڈرنک ہنی (Buy me a drink Honey?) وہ گلاس لے کر میرے ساتھ آ بیٹھی۔

"سارِی رانگ نمبر (Sorry Wrong Number) میں نے اُکتا ہٹ سے منہ پھیر لیا۔ اُس کی چال ڈھال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک چنچل لڑکی ہے۔

"ڈانس وِد می؟ (Dance With Me?) " اُس نے لپ سٹک سے لتھڑے ہونٹوں کی کمان سی بنا کر پوچھا۔

"میں رقص بھی نہیں کرتا۔"

"ہندوستانی فقیر" اُس نے جھنجھلا کر کہا اور گلاس اُٹھا کر واپس کاؤنٹر پر جا بیٹھی اور کسی آسامی کا انتظار کرنے لگی۔ اُدھر ناچنے والے جوڑوں کے جذبۂ وجدان میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور دھمال پوری شدت سے جاری تھا۔ نشے میں ایک دُھت مَلاّح نے اپنی ٹوپی اُتار پھینکی اور سٹیج پر چڑھ کر طائفے کے سامنے کھڑے ہو کر اُلٹے سیدھے کرتب دکھانے شروع کر دیئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ایک سویڈش نے جس پر ڈینش بیئر کا اثر بہت گہرا ہو چکا تھا۔ نعرہ بلند کیا" میرے آباؤ اجداد وائکنگ (Viking) سمندری لٹیرے تھے۔ ہاؤ ہُو!" اور ساتھ ہی اپنی میز اُلٹ کر خالی بوتلیں ہوا میں اچھالنا شروع کر دیں۔ کوئی بھی متوجہ نہ ہوا۔ رقص اُسی طرح جاری رہا۔ خاصی دیر کے بعد جب یہ طوفانِ بدتمیزی ختم ہوا تو تمام شرکا پسینے سے شرابور تھے اور تالیاں پیٹ پیٹ کر موسیقی بجانے والوں کو داد دے رہے تھے۔ موگنز واپس آیا تو وہ اکیلا تھا۔

"تمہاری ساتھی لڑکی کہاں ہے؟"

"وہ کمبخت رقص کے دوران کہیں غائب ہوگئی چنانچہ میں اکیلا ہی ناچتا رہا۔" وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب واپس چلا جائے۔ دو بج چکے ہیں۔" میرے کانوں کے پردے ابھی تک لرز رہے تھے۔

"جیسے تمہاری مرضی" اس نے خوشدلی سے کہا۔

طائفے نے اب پھر ایک مدھم اور پُرامن دُھن چھیڑ دی: نڈھال جوڑے اپنے تھکے ہوئے قدم گھسیٹتے باہوں میں باہیں ڈالے پہلے کی طرح اونگھنے لگے۔ کلب سے باہر جانے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر ناچنے والے جوڑوں میں سے گزر کر جانا تھا۔ اِس دفعہ موگنز میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ ایک دم مجھے اپنے جسم پر اُنگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ پہلے تجربے کی بنا پر میں اب پوری طرح چوکس تھا اور اس سے قبل کہ چٹکی بھرنے کی نوبت آتی میرا ہاتھ مضبوطی سے "مجرم" کی کلائی پکڑ چکا تھا۔ میں پیچھے مڑا تو سامنے گداز جسم کی ایک سنہری بالوں والی لڑکی بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔ اُس نے اپنی کلائی چھڑانے کی چنداں کوشش نہ کی۔ اُس کے ہم رقص لمبے تڑنگے مَلّاح نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا اور دھاڑا "تمہیں میری دوست لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی کیسے جرأت ہوئی؟"

"موگنز" میں نے مَلّاح کی بڑ نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ڈینش ساتھی سے کہا "اِن محترمہ نے ہی اندر آتے وقت مجھے کاٹا تھا اور اب پھر اسی کوشش میں تھیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیوں؟" اس سے قبل کہ موگنز کچھ کہتا وہ وحشی مَلّاح مجھے ایک زوردار گھونسا رسید کر چکا تھا اور میں لکڑی کے فرش پر پھسلتا ساتھ رکھی ہوئی میز کے پایوں میں جا اٹکا اِس اثنا میں موگنز اس ملّاح سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر مُکّے کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی اور اُٹھ کر گردن جھکا کر ملّاح کے پیٹ میں ایک زوردار ٹکر رسید کی وہ موگنز کے مُکّوں سے پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا میری "بوبکرا" سٹائل ٹکر نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ حاضرینِ مجلس اس دوران چپکے سے تماشہ دیکھتے رہے۔ میں اپنا جبڑا سہلاتا ہوا

باہر نکلنے لگا تو میرا "مجرم" دروازے کے پاس کھڑا تھا" کیا آپ اب بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے مجھے کیوں کاٹا تھا؟" میں نے غصّے سے پُوچھا۔

"بس تم اچھے جو لگے تھے" اس نے آنکھیں میچ کر کہا اور مسکرا دی۔

باہر نہر کے کنارے اب بہت کم لوگ تھے۔ کسی شبینہ کلب یا شراب خانے کا دروازہ کھلتا تو پل بھر کے لیے موسیقی اور آوازوں کا شور سُنائی دیتا۔ دروازہ بند ہونے پر پھر خاموشی طاری ہو جاتی۔

"آج تم نے کوپن ہیگن کے صرف تاریک پہلو ہی دیکھے ہیں۔ جانے تم نے ہمارے بارے میں کیا نظریہ قائم کیا ہے؟" موگنز پر بیئر کے اثرات زائل ہو رہے تھے۔

"کسی کو موردِ الزام تو وہ ٹھہرائے جو اپنے آپ کو منصف کی کرسی کا اہل سمجھتا ہو۔ میں سیاح ہوں مجھ پر صرف دوستی اور شفقت کے جراثیم اثر انداز ہوتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ ڈنمارک میں ان جراثیموں کی بھرمار ہے" میں نے موگنز کی رفاقت کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔

"تاسترپ جانے والی آخری گاڑی جا چکی ہوگی۔ تم آج شب میرے فلیٹ میں ہی ٹھہر جاؤ صبح چلے جانا۔"

"میرے سٹیشن پہنچنے تک تاسترپ جانے والی پہلی گاڑی بھی تیار ہو گی اور پھر شاید تمہارا بدھ کا مجسمہ ایک مسلمان کی رفاقت پسند نہ کرے"

وہ ہاتھ ہلا کر تھوڑی دُور گیا ہو گا۔ کہ میں نے آواز دے کر کہا۔

"موگنز اُس وحشی ملّاح کے ہاتھوں پٹائی سے بچانے کا بھی شکریہ"

"سکول" اس نے ہاتھ اٹھا کر ڈینش میں کہا اور نہر کا آہنی پل پار کر کے ایک گلی میں مڑ گیا۔

سڑک کی دُکھڑ والے شراب خانے سے دو سویڈش شرابی جھومتے ہوئے نکلے اور سیدھے نہر میں کُود گئے۔ میں نے کنارے پر لگے ہوئے جنگلے کو تھام کر نیچے جھانکا تو وہ منہ سے ڈبکیاں لگا رہے تھے "شراب کے اثرات زائل کرنے کا بہترین طریقہ ہے" اُن میں سے ایک نے مجھ سے

مخاطب ہو کر نعرہ لگایا اور ناک کو اُنگلیوں کے درمیان بھینچ کر ڈبکی لگا دی۔ میں صُبح چار بجے چلنے والی پہلی گاڑی پر سوار ہو کر واپس ہاسٹر پہنچا تو ہوٹل کا مالک کسان اپنے فارم کی گایوں کا دُودھ دوہنے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں دُودھ سے بھرے تسلے تھے۔

"صُبح بخیر جناب۔" اُس نے تسلے زمین پر رکھتے ہوئے کہا "میرے تجربے کے مُطابق کوپن ہیگن میں رَت جگے کے بعد ڈینش دُودھ کا ایک مگ اکسیر کا کام دیتا ہے" اور گاڑھے سفید دُودھ سے بھرا ہوا مگ مجھے تھما دیا۔

جھیل چاندنی اور بارہ سنگھا

"ننھی جل پری" ساحل کے ساتھ پانی میں اُبھری ہوئی ایک چٹان پر اُداس بیٹھی اپنے شہزادے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی بے جان آنکھیں بندرگاہ سے پرے کھلے سمندر پر لگی تھیں "ننھی جل پری" اینڈرسن کی کہانی کا ایک کردار ہے جسے اہل کوپن ہیگن نے کانسی میں ڈھال کر ایک ساحلی چٹان پر ایستادہ کر دیا۔ زندہ دلان شہر اس خوبصورت مجسمے پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کا چہرہ غازے سے پوت دیا اور کبھی عریاں جسم کو زیر جامہ ملبوسات سے ڈھک دیا۔ تلاش محبوب میں ناکامی ہو جل پری کے عارض کا بوسہ لیجئے محبوب قدموں میں ہوگا، ایک صاحب تو بیچاری جل پری کا سر کاٹ کر رفو چکر ہو گئے۔ چنانچہ ابتدائی سانچہ جو ایسی ہی ناگہانی ضرورتوں کی خاطر محفوظ کر لیا گیا تھا نکالا گیا اور نیا سر ڈھال کر دوبارہ جوڑ دیا گیا۔ میں آج کوپن ہیگن چھوڑ کر سویڈن جا رہا تھا۔ سٹیمر بندرگاہ سے نکلا تو بائیں طرف چٹان پر اداس بیٹھی جل پری کا مجسمہ نظروں کے سامنے آگیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم بحیرۂ بالٹک عبور کر کے مالمو پہنچ چکے تھے جو سویڈن کے چند بڑے شہروں میں سے ہے۔ میری منزل سویڈن کا صدر مقام سٹاک ہوم تھی

مالمو کے مرکزی چوک سے ٹرام میں سوار ہو کر میں ابھی سٹاک ہوم جانے والی شاہراہ پر اُترا ہی تھا کہ ایک سویڈش ساختہ "والوا" کار نے مجھے لفٹ دے دی۔ کار میں لمبے بالوں والے تین ہپی سوار تھے۔ کار چلی تو میرے برابر بیٹھا ہوا ہپی پینک سے بیدار ہوا۔ اور سر اٹھا کر پوچھنے لگا۔ "انڈین؟" "پاکستانی" میں نے جل کر جواب دیا۔ اس نے پاؤں میں رکھی ہوئی چمڑے کی تھیلی میں سے سرخ ہندیوں ایسا ایک لمبا پائپ نکالا اور بھورے رنگ کی ایک ڈلی سُلگا کر کش لگانے لگا۔ "ہزوان" اُس نے ایک طویل کش لیا اور پائپ اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ دونوں بھی نروان حاصل کر چکے تو مجھے دعوت دی گئی "ڈریگ؟" ڈریگ ہپیوں کی زبان میں چرس کے لمبے کش کو کہتے ہیں۔ پنجابی میں یہی مفہوم "یار سُوٹا لا" سے ادا ہوتا ہے۔ میں نے ایک نظر اُن ہزوان رسیدہ ہپیوں پر ڈالی اور کار سے اُترنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تینوں کسی اور جہان میں تھے اور میں بہر صورت ابھی اسی دنیا میں رہنا چاہتا تھا۔ "ڈریگ تو نہیں" میں نے ہنس کر کہا "البتہ ڈراپ کر دیجئے تو بہتر رہے گا" ڈرائیور نے بغیر کسی تعرض کے کار روک دی "امن" اس نے ہاتھ اُٹھا کر جھومتے ہوئے کہا۔ وہیں سڑک پر کھڑے ہونے کی بجائے میں نے چلنا شروع کر دیا اور پچھلے پہر لُنڈ کے قدیم قصبے میں پہنچ گیا جو سٹاک ہوم۔ یوٹے برگ اور اُپسالا کے ساتھ سویڈن کے چار بڑے تعلیمی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔ قصبے کو پار کر کے سٹاک ہوم کی شاہراہ میں شامل ہونے والی ذیلی سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوا۔ شام ہو گئی مگر مجھے لفٹ نہ مل سکی۔ میں سوچنے لگا کہ یہیں کہیں خیمہ نصب کر کے شب بسر کر لوں اور دوسری صبح پھر قسمت آزمائی کی جائے میں اسی سوچ میں مگن تھا کہ قصبے کی جانب سے ایک ویگن مڑی اور میرے پاس آ کر رک گئی۔ ڈرائیور کی نشست پر ایک بوڑھا کسان براجمان تھا "میں لاگن تک جا رہا ہوں چلو گے؟" میں نے جلدی سے سامان پچھلی نشست پر پھینکا اور بوڑھے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب رات ہو چکی تھی اور ویگن کی روشنیوں میں دُور تک خالی سڑک نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں

طرف گھنا اور سیاہ جنگل بیحد مُہیب لگ رہا تھا۔ کوئی موڑ آتا تو ڈین کی روشنیاں سڑک سے جُدا ہو کر تاریک جنگل کے بلند درختوں کو مُنوّر کر دیتیں۔

"یہاں سے لاگن کا قصبہ تین میل کے فاصلے پر ہے" بوڑھے نے ڈین روکتے ہوئے کہا "میرا فارم یہاں سے دائیں ہاتھ چند کوس پر ہے۔ میں جلدی میں ہوں ورنہ تمہیں قصبے تک ضرور چھوڑ آتا" میں سامان اُٹھا کر نیچے اُتر گیا۔ اس نے ڈین دائیں طرف کچے راستے پر موڑ دی اور جنگل میں گم ہو گیا۔ اب سڑک مکمل طور پر سنسان اور تاریک تھی۔ دونوں کناروں پر جنگل کے دیو قامت درخت سڑک پر جُھکے ہوئے اس سنّاٹے کو اور بھی وحشت ناک بنا رہے تھے۔ اس اندھیری سڑک پر اپنا سامان اُٹھا کر قصبے تک پیدل جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی چنانچہ میں سڑک کے ساتھ جنگل میں اُتر گیا تاکہ کسی مُناسب جگہ پر خیمہ نصب کر کے رات گزاری جا سکے، درختوں کے تلے گھاس پھونس اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اور مجھے چلنے میں دُشواری پیش آ رہی تھی۔ یہاں تاریکی کا مکمل راج تھا، کچھ دُور چلنے کے بعد تاریکی قدرے کم ہونے لگی۔ جنگل ختم ہوا چاہتا تھا۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گھنے درختوں کے خاتمے پر ایک ریتلا میدان آیا جس کے پرے نیم تاریک میں ایک بہت بڑی اور پُر سکون جھیل تھی۔ میں نرم اور بھُربھُری ریت پر چلتا ہوا جھیل کے کنارے تک آ گیا اور ایک ہموار جگہ تلاش کر کے اپنا خیمہ نصب کر دیا۔ میں جب بھی ہائکنگ کے ذریعے سفر کرتا ہوں تو اپنے تھیلے میں دو وقت کی خوراک ضرور رکھتا ہوں، جانے کہاں رات ہو جائے۔ اُس شب "ڈنر" کے لیے انتظامات نہایت تسلی بخش تھے۔ قیمے کا ٹین۔ ڈبل روٹی۔ انڈے اور کافی۔ گیس کا سفری چولہا دیا سلائی دکھاتے ہی روشن ہو گیا۔ فرائنگ پین گرم ہو گیا تو میں نے قیمے کے ساتھ دو انڈے بھی تل لیے۔ کافی بنانے کے لیے پانی درکار تھا سو میں نے کیتلی وہیں نیچے بیٹھے جھیل کے شفاف پانی میں ڈبو کر لبالب بھر لی اور چولہے پر رکھ دی۔ جھیل کا پانی صاف اور خنک تھا۔ "ڈنر سے قبل جھیل میں غسل کر لیا جائے تو بہتر ہو گا" میں نے

سوچا اور کپڑے اُتارنے شروع کر دیئے۔ اِدھر اُدھر نگاہ کی۔ ظاہر ہے رات کے وقت اِس جنگل میں دُور دُور تک کوئی متنفس موجود نہ تھا۔ یعنی جامۂ غسل زیبِ تن کرنے کا تردّد غیر ضروری تھا۔ مجھے ماسکو میں ہوٹل زولوتوئی کولیس کا اجتماعی حمام یاد آ گیا جہاں میں صبح صبح غسل کرنے کی نیّت سے داخل ہوا اور شرمندہ ہو کر اُلٹے پاؤں باہر آ گیا" کامریڈ آپ غسل نہیں کریں گے کیا؟" باہر بیٹھے ہوٹل کے ملازم نے مجھ سے پوچھا "اس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں" میں نے غصّے سے جواب دیا "آپ کا کیا خیال ہے کہ غسل کے لیے ڈنر سوٹ زیب تن کرنا چاہیئے؟" ملازم نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے "روس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" چونکہ روس میں قیام کے دوران غسل کیے بغیر گزارا ممکن نہ تھا اس لیے میں نے کمر کے گرد تولیہ باندھ لیا اور حمام میں نہانے لگا۔ میری اس حرکت پر رُوسی نہایت محظوظ ہوئے اور تمام عرصہ مجھے یوں گھورتے رہے جیسے میں وہاں ننگا آ گیا ہوں۔ بہرحال یہاں دُور دُور کوئی رُوسی تو کیا کسی سویڈش کا بھی گزر نہ تھا۔ میں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ رات کی خاموشی میں میرا جسم جھیل کی پُرسکون سطح سے ٹکرایا اور اس تصادم نے ویرانے کے اس مکمل سکوت کو لمحہ بھر کے لیے کرچی کرچی کر دیا۔ ریشم کی طرح ملائم اور دمکتے شیشوں کی مانند شفاف پانی نے مجھے اپنی نرم آغوش میں لے لیا۔ میں جھیل سے باہر نکلا تو اپنے تئیں پہلے سے تازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ خیمے کے باہر ریت پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر گرم کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ تھوڑی دیر میں چاند نکل آیا اور پوری جھیل چاندنی میں نہا گئی میرے نم آلود جسم پر چاند کی ٹھنڈی لَو نے مجھے خوش قسمتی اور آزادی کے ایک اَن جانے احساس سے روشناس کیا۔ ہر طرف ایک سحر انگیز سکون تھا۔ میں نے جھلمل جھلمل کرتی جھیل کی طرف دیکھا اور جانے کیوں کوپن ہیگن کی ساحلی چٹان پر بیٹھی ننھی جل پری کے لیے اُداس ہو گیا۔

میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھرا اور خیمے کے اندر جا کر لیٹ گیا۔ چمکتی ہوئی جھیل پہلی

اسے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ چاند کی ٹمٹماتی کرنوں کی وجہ سے خیمے کے اندر بھی ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی اور میں جلد ہی سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر مجھے خیمے سے باہر کسی جاندار شے کی موجودگی کا احساس ہوا جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ میرے خیمے کے عین اوپر کسی عجیب الخلقت دیوقامت جانور کا سایہ حرکت کر رہا تھا۔ شدید خطرے کے احساس نے مجھے پوری طرح چوکس کر دیا۔

"ہاتھی!" میں نے قد آور سائے کو جانچتے ہوئے اندازہ لگایا لیکن اُسی لمحے اپنی حماقت کا احساس ہوگیا سویڈن میں بھلا ہاتھی کہاں پائے جاتے ہیں۔ سائے نے ایک مرتبہ پھر حرکت کی۔ اب وہ اپنی تھوتھنی خیمے کے نچلے حصے کے ساتھ رگڑ رہا تھا۔ میں خوف سے بُری طرح کانپنے لگا "اللہ میاں اب کے بچا لیجیو پھر کون بدبخت سیاحت کا نام لے" میں نے لرزتے ہوئے آیۃ الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ پچھلی رات کی خوش قسمتی اور آزادی کا احساس کافور ہو چکا تھا۔ خاصی دیر تک یہ حالت برقرار رہی مگر وہ کم بخت سایہ وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر میں یہیں خیمے میں پڑا رہا تو یہ "شے" بڑی آسانی سے خیمہ مجھ پر گِرا کر میرا قلع قمع کر دے گی۔ اِس سے بہتر ہے کہ یکدم باہر نکل کر بگٹٹ دوڑ لگا دی جائے۔ مجھے اُس وقت اپنے پاس کسی مہلک کی غیر موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ اب میرے پاس اِس نوعیت کا ہتھیار صرف آلو چھیلنے والے چاقو کی صورت میں ہی موجود تھا۔ چنانچہ میں نے چاقو کا دستہ سختی سے مُٹھی میں بھینچ لیا اور اُس کا کُند پھل تانے چھلانگ لگا کر باہر آگیا۔ ریت پر پاؤں پڑتے ہی میں نے ایک کلانچ بھری اور سمت کا تعین کیے بغیر اندھا دُھند بھاگنا شروع کر دیا۔ ریتلا میدان طے کرنے کے بعد جب میں جنگل میں داخل ہونے لگا تو لمحہ بھر کے لیے رکا اور پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ میرے خیمے کے پاس ایک عظیم قامت بارہ سنگھا تھوتھنی اٹھائے میری طرف بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تیز اور گھمتے ہوئے سینگ چاندنی میں چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تو وہیں کھڑا ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا اور پھر ایک مرتبہ خیمے کو اپنی لمبی تھوتھنی سے ٹٹول کر بڑی شان

بے نیازی سے گھنے جنگل کی جانب چل دیا۔ جنگل کے کنارے پر پہنچ کر اس نے مُڑ کر خیمے کی جانب دیکھا اور پھر درختوں میں غائب ہوگیا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا کہ مبادا وہ صاحب اپنے ساتھیوں کو بلانے گئے ہوں کہ جسے سرپٹ دوڑتا پاکستانی دیکھنے کا اشتیاق ہو دیکھ لے لیکن شاید ہمارے کسی سفارتی نمائندے کا اس علاقے سے گزر نہیں ہوا تھا اس لیے بارہ سنگھے بھی پاکستان کے وجود سے لاعلم تھے۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا واپس خیمے تک آیا۔ میری نظریں جنگل کے اُسی حصّہ پر لگی تھیں جہاں بارہ سنگھا غائب ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا خیمہ سمیٹا اور سامان کندھے پر رکھ کر ریتلے میدان کو عبور کر کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ خودرو بیل بوٹوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا میں سڑک پر واپس پہنچ گیا۔ میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ سانس دُرست کیے بغیر میں نے لاگن کے قصبے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ لاگن میں داخل ہوا تو صبح صادق کی روشنی ہر سو پھیل رہی تھی حالانکہ ابھی صرف تین بجے تھے۔ قصبے کے آغاز میں "پولیس لاگن" کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں پولیس سٹیشن کے اندر چلا گیا۔ یورپ میں کلیسا اور پولیس سٹیشن دو ایسے مقام ہیں جہاں شب بسری کے لیے ہمیشہ جگہ مل جاتی ہے بشرطیکہ کوئی کوٹھڑی خالی ہو۔ یعنی پولیس سٹیشن کی۔ سٹیشن کے اندر رات کی ڈیوٹی پر متعین پولیس افسر اپنے جدید دفتر میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی دُکھ بھری کہانی سنائی اور بقیہ شب گزارنے کے لیے کسی کوٹھڑی میں سونے کی اجازت چاہی۔ "فی الحال تو کوئی جگہ نہیں" اُس نے فائل بند کی اور اُٹھ کھڑا ہوا "ہاں البتہ ابھی ابھی میں نے ایک بوڑھے شرابی کو ایک کوٹھڑی میں بند کیا ہے۔ وہاں دو بستر موجود ہیں" "میں کسی بارہ سنگھے کی بجائے کسی شرابی کی رفاقت زیادہ پسند کروں گا۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"آپ نے جو کچھ دیکھا وہ ایک بڑی نیل گائے تھی جو صرف خطرے کی صورت میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ رات کے پچھلے پہر جنگل کے اکثر جانور جھیل کے کنارے پانی پینے آجاتے ہیں؟" اس نے جیب سے کنجیاں نکال کر کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ بوڑھا شرابی بستر پر سونے

کی بجائے فرش پر چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ میں کپڑے بدل کر لیٹنے لگا تو شرابی کی آنکھ کھل گئی اُس نے میری طرف دیکھا اور آنکھ میچ کر مسکرا دیا۔ "تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟" میں نے بتایا کہ میں ایک پاکستانی سیاح ہوں اور صرف شب بسری کے لیے آیا ہوں۔ اس کے پلّے کچھ نہ پڑا اور وہ منہ کھول کر بڑے بے ہنگم طریقے سے بلند آواز میں گانے لگا۔

"یہ سویڈیش لوک گیت ہے۔ اُس نے اپنا سانس دُرست کرتے ہوئے کہا" تم بھی اپنے ملک کا کوئی گیت سناؤ نا!" میں اُس کی فرمائش نظر انداز کر کے بستر پر لیٹ گیا اور اپنے اوپر کمبل تان کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"نہیں سناؤ گے تو سونے نہیں دوں گا" بوڑھا شرابی میرے سر پر کھڑا تھا۔ "سناؤ" اُس نے اِس طرح گرج کر کہا جیسے پُرانے زمانے کے بادشاہ درباری رقاصہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ "ناچو" میں خاموش رہا تو اُس نے میرے کمبل کا کونا پکڑا اور کھینچ کر فرش پر پھینک دیا۔ وہ اپنی فرمائش پوری کروانے پر تُلا ہوا تھا۔

"کیا مصیبت ہے" میں تنگ آکر چیخا" تم سے تو وہ جنگلی نیل گائے ہی بہتر تھی۔ کم از کم اُس نے گیت سننے کی فرمائش تو نہیں کی تھی" شور سن کر پولیس افسر اندر آگیا۔

"بوڑھا ابھی نشے میں ہے" اُس کے لہجے میں تأسف تھا" میری ڈیوٹی ختم ہونے کو ہے آپ میرے ساتھ گھر چلیں اور وہاں آرام کریں" میں نے تکلف برتنا چاہا تو وہ مُصر ہو گیا۔ "ایک ہی رات میں دو ناخوشگوار تجربے یقیناً آپ کو سویڈن کی سیاحت کے بارے میں بددل کر دیں گے۔ آپ ضرور میرے ساتھ چلیے۔

پولیس افسر کارل گُستاف ریبر کا گھر قصبے سے پرے جنگل کے شروع میں تھا۔ اُس کی بیوی انگرڈ اگرچہ انگریزی سے نابلد تھی لیکن اس کا بار بار" ناک سے مینکے" یعنی بہت بہت شکریہ کہنا اِس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ میری آمد سے بیحد خوش ہے۔ اُن کے بچے سکول جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بڑی لڑکی نے بڑے فخر سے مجھے اپنا ٹکٹوں کا البم دکھایا جس میں

پاکستان کے دو ٹکٹ چسپاں تھے۔ کچی مچھلی اور کافی کے ناشتے کے بعد میرا بستر بچوں کے کمرے میں لگا دیا گیا اور میں لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں بیدار ہو گیا "ہیلو" یہ کارل کی آواز تھی "تمہاری نیند میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں" اس نے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرے چند دوست تم سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ انہیں اس سے پہلے کسی پاکستانی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور ویسے بھی شام کے سات بج رہے ہیں" میں کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ "اولے بھی پولیس افسر ہے۔ سترو مبرگ ٹاؤن ہال میں خزانچی ہے اور یہ ہے روزنبرگ جس کا گھر ساتھ والے جنگل کے وسط میں ہے جہاں یہ لکڑیاں کاٹنے کا کام کرتا ہے" کارل نے دوستوں کا تعارف کروایا۔ اور بھی بہت سے لوگ تھے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے سویڈش بیئر پیش کی گئی۔ خواتین کو پاکستان کے شادی بیاہ کے رسم و رواج پردہ، مذہبی رسوم اور ثقافتی تقاریب کے بارے میں جاننے کا بیحد اشتیاق تھا۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ منگنی ہو چکنے کے باوجود مجھے اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے یا اس سے بات کرنے تک کی اجازت نہیں تو محفل میں سنسنی پھیل گئی "اوہ نو" اور "یہ کیسے ہو سکتا ہے" کے نعرے بلند ہوئے۔ "تو پھر تمہارے ہاں شادیاں کامیاب کیسے ہوتی ہیں" انگرڈ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "جب کہ تم اپنی بیوی کو پہلی مرتبہ شادی کے بعد دیکھتے ہو اور اس سے قبل میل ملاپ کے ذریعے تمہیں ایک دوسرے کو پرکھنے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا"

"دیکھیے ہمارے ہاں شادی کے وقت لڑکا اور لڑکی اکثر "غیر تجربہ کار" ہوتے ہیں میں نے باقاعدہ لیکچر بازی شروع کر دی "یورپ کی طرح لڑکا اپنی بیوی کا موازنہ اپنی گزشتہ محبوباؤں سے نہیں کر سکتا کہ ہائے اُن کے ہونٹ کتنے خوبصورت تھے۔ مارگریٹ کی ہنسی پھولوں کی لڑی تھی۔ ماریا کی آنکھیں نیلی جھیلیں تھیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ پاکستانی لڑکے کے نام جو بھی "لاٹری" نکل آئے تو وہ فوراً اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اُدھر لڑکی کے لیے خاوند

اُس کا پہلا محبوب ہوتا ہے اور اُسے اُس میں کوئی بھی خامی نظر نہیں آتی کیونکہ وہ اُس سے بہتر لڑکوں کی خوبیوں سے ناواقف ہوتی ہے۔ یہ کچھ اسی طرح جیسے یورپ میں جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہی جو لڑکا یا لڑکی نظر آجائے اُس سے والہانہ عشق ہو جاتا ہے اِس عشق کو آپ لوگ صرف (Teenage Crush) کا نام دیتے ہیں"

"یہ تو تم دُرست کہتے ہو" کارل کی بیوی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ شائد اُسے اپنا پہلا عشق یاد آگیا تھا "لیکن پہلی محبت کے احساسات ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں"

"وہ اِس لیے کہ دُوسری محبت گلی کی نکڑ پر کھڑی آوازیں دے رہی ہوتی ہے اور ہمارے ہاں اِس کا موقعہ ہی نہیں آنے دیا جاتا"

"سکول" کارل کی بیوی نے ہنستے ہوئے جام اٹھا کر کہا۔

"سکول" میں نے پانی کا گلاس اُٹھا کر لفظ دُہرایا" میں نے یہ لفظ ڈنمارک میں بھی سُنا تھا آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"وائکنگ لیٹروں کے زمانے میں رواج تھا کہ مہمان اور میزبان ایک ہی پیالے میں سے شراب پیتے تھے۔ اس پیالے کو "سکول" کہا جاتا تھا" کارل نے جو اُب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سُن رہا تھا آگے بڑھ کر جواب دیا" اب "سکول" جام صحت تجویز کرنے یا نیک خواہشات کے اظہار کا طریقہ ہے" ایک محفل میں "سکول" کے لفظ کا استعمال جتنا زیادہ ہو۔ وہ اتنی ہی کامیاب گنی جاتی ہے" "تو پھر سکول" میں نے کارل کی بیوی کی طرف دیکھا اور گلاس اُٹھالیا۔

"اوہنوں" کارل نے منہ بنالیا" میزبان کی بیوی کو سکول کہنا آداب محفل کے خلاف ہے"

"وہ کیوں؟" میں نے گلاس نیچے رکھ دیا۔

"فرض کرو ایک محفل میں بارہ افراد مدعو ہیں اور اگر ہر ایک فرد دس مرتبہ میزبان کی بیوی کو "سکول" کہے تو اُسے ایک سو بیس مرتبہ شراب پینی پڑے گی۔ نتیجہ ظاہر ہے" اُس نے

بناوٹی طور پر لڑکھڑا اِس کا مُظاہرہ کیا۔

"کارل" اُس کی بیوی نے پیار سے کہا "گیارہ بجنے کو ہیں اور تمہاری رات کی ڈیوٹی شروع ہونے کو ہے۔" کارل نے مہمانوں سے بھرپور معذرت کی اور وردی پہن کر پولیس سٹیشن چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب مہمان رُخصت ہونے لگے تو روزنبرگ نے مجھے دُوسری صبح اپنے گھر آنے کی دعوت دی "میں جیپ لے کر آ جاؤں گا اور ناشتے کے بعد تمہیں جنگل کی سیر کراؤں گا۔"

بھورے رنگ کی لکڑی کا بنا ہوا گھر گھنے جنگل کے عین وسط میں واقع تھا روزنبرگ کی بیوی ایپرن باندھے پھاٹک پر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ "خوش آمدید" اس نے ایپرن سے ہاتھ صاف کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ گھر کا اندرُونی حِصّہ نہایت صاف سُتھرا اور آراستہ تھا۔ کپڑے دھونے کی مشین، ٹیلیویژن، فرج جدید آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔

"جنگل میں اکیلے رہنے سے آپ گھبرا نہیں جاتیں؟" میں نے روزنبرگ کی بیوی سے دریافت کیا۔

"مجھے تو گھر کے کام کاج سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بچے صبح سویرے اپنی موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر لاگن کے سکول میں پڑھنے چلے جاتے ہیں۔ گھر کی صفائی اور کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہوں تو میرا خاوند کام سے واپس آ جاتا ہے۔ دوپہر کو کار لے کر جنگل میں رہنے والے کسی اور لکڑہارے کی بیوی سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ اور شام کو گھر کے تمام افراد ٹیلی ویژن کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔" ناشتے کی میز پر رکھی ڈبل روٹی میں سے ہمارے ہاں کی تنور کی گرم روٹی کی سوندھی مہک اُٹھ رہی تھی۔ "میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔" روزنبرگ کی بیوی نے ڈبل روٹی کاٹ کر مکھن کی ایک دبیز تہ چڑھا کر مجھے پیش کی۔ "دُودھ اور مکھن ہماری اپنی گائیوں کا ہے اور شہد ہمارے باغ میں لگے چھتوں سے حاصل کیا گیا ہے۔"

"سردیوں میں شدید برف باری کے دوران آپ کے لیے باہر کی دُنیا سے رابطہ قائم رکھنا خاصا دُشوار ثابت ہوتا ہوگا" میں نے گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر کر پوچھا۔ "ویسے تو برف باری کے دوران قصبے کو جانے والے تمام راستے مسدُود ہو جاتے ہیں مگر میونسپل کمیٹی کا ایک بُل ڈوزر روزانہ صبح چھ بجے آکر ہمارے گھر کے گرد تمام سڑکوں پر سے برف ہٹا کر جاتا ہے۔"

"بُل ڈوزر روزانہ صرف آپ کی خاطر بھیجا جاتا ہے" میں نے حیرت زدہ ہو کر پُوچھا

"ہاں کیوں نہیں؟ یہ کمیٹی والوں کا فرض ہے کیا میں میونسپل ٹیکس ادا نہیں کرتا؟"

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم جنگل کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔

سویڈن کو بجا طور پر جنگلوں اور جھیلوں کا ملک کہا جاتا ہے۔ ملک کے کُل رقبے کا پچپن فیصد حصّہ جنگلوں اور تیرہ فیصد دریاؤں اور جھیلوں پر مشتمل ہے۔ صرف نو فیصد رقبہ زیرِ کاشت ہے۔ چونکہ دریاؤں کا رُخ قدرتی طور شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت ہے اس لیے جب درختوں کو کاٹ کر شہتیروں کی صورت میں دریا بُرد کیا جاتا ہے تو یہ لکڑی بہتی ہوئی بحیرہ بالٹک کے ساحل پر پہنچ جاتی ہے جہاں اسی صنعت سے وابستہ فیکٹریاں قائم ہیں۔ ان تمام معلومات کا منبع روزنبرگ تھا جو جیپ چلانے کے ساتھ ساتھ گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔

"کیا آبی وسائل سے لکڑی بھیجنے کا طریقہ کار قدرے مہنگا نہیں" میں نے دریافت کیا۔ "بالکل نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق لکڑی کا ایک شہتیر آبی وسائل سے کسی بندرگاہ پر پہنچانا وہاں پوسٹ کارڈ لکھنے سے بھی ارزاں پڑتا ہے بلکہ ہم میں سے کئی لکڑہارے بالٹک کی بندرگاہوں پر کام کرنے والے دوستوں کے لیے تحفے یا رسائل کسی شہتیر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں جو ان تک بحفاظت پہنچ جاتے ہیں۔"

جنگل کے ایک حصّے میں مشینی آروں کی مدد سے کٹائی ہو رہی تھی۔ صنوبر، شمشاد اور بیرچ کے ہزاروں قد آور درخت اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ "صنوبر اور شمشاد

جس کا درخت نوّے سال سے پہلے پختہ نہیں ہوتا کاغذ کی تیاری کے لیے نہایت موزوں ہیں" روزنبرگ کہہ رہا تھا" دنیا کی کُل پیداوار کا دس فیصد کاغذ سویڈن میں بنایا جاتا ہے لکڑی کی صنعت میں دیا سلائیاں۔ فرنیچر اور ہارڈ بورڈ بھی شامل ہیں بلکہ ہم تو بُرادے سے شراب بھی تیار کرتے ہیں۔" جنگل سے واپسی پر ایک کھُلے میدان کے قریب روزنبرگ نے جیپ روک لی۔ ہم سے چند سو گز کے فاصلے پر کھُلی فضا میں تین نیل گائیں بڑے سکون سے چر رہی تھیں۔" وُہ بھی ہے تمہارے خونخوار بارہ سنگھے" اُس نے مُسکرا کر گایوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر تم چند روز رُک جاؤ تو پھر ان کا شکار کھیلا جا سکتا ہے۔ ابھی پابندی ہے۔ ویسے بھی میں اس علاقے کا فارسٹ رینجر ہوں اس لیے ظاہر ہے مجھ پر پابندی کا اطلاق قدرے شدت سے ہوتا ہے۔" دوپہر کو ہم واپس لاگن پہنچ گئے۔ کارل اور روزنبرگ کا اصرار تھا کہ میں چند روز اور ٹھہر جاؤں مگر میں نے تہِ دل سے ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ کارل کی بیوی نے جلدی سے چند سینڈوچ بنا کر میرے تھیلے میں رکھ دیئے اور وہ دونوں مجھے سٹاک ہوم جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آئے۔

سُنہرے بالوں والا ہنس مِکھ سویڈش لڑکا ٹیل کمیشن ایجنٹ تھا اور وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں لیپ لینڈ کے شہر کیرونا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے شام کے وقت لاگن سے لفٹ دی جہاں میں ایک بار پھر لفٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا اور واپس کارل کے ہاں جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غروبِ آفتاب سے قبل ہم نے ایک ایسی جھیل کے کنارے سفر کیا جو رقبے میں اتنی وسیع تھی کہ سمندر کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے بعد میلوں تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت اور کسانوں کے خوبصورت گھر آئے۔ ورنامو پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ نصف شب نے لن شوپنگ اور ریان شوپنگ کے جڑواں شہروں میں پایا جہاں دیا سلائیاں بنانے والے کارخانے رات کی شفٹ پر چل رہے تھے۔

" تم میرے ساتھ لیپ لینڈ تک کیوں نہیں چلتے۔ کیرونا کے نواح میں رہنے والے تمام

اسکیمو میرے دوست ہیں۔ میں اُن کے ہاتھوں خاندانی منصوبہ بندی کی ادویات فروخت کرتا ہوں" سفر کے دوران نیل اور میں خاصے بے تکلف ہو گئے تھے اور اُسے شمالی سویڈن تک کے طویل سفر کے لیے رفاقت کی تلاش تھی۔

"آرکٹک سرکل کے پاس اسکیمو لینڈ دیکھنے کا مجھے اشتیاق تو ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میں نے کوپن ہیگن سے روانہ ہوتے وقت ایک نہایت عزیز پاکستانی دوست ریاض کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا" میں نے معذوری کا اظہار کیا" اور ہاں ان اسکیمو حضرات کو خاندانی منصوبہ بندی کا شوق کیسے چرایا؟"

"اسکیمو کا سب سے قیمتی سرمایہ رینڈیر کا ریوڑ ہوتا ہے۔ کثرتِ اولاد سے ان ریوڑوں کی تعداد میں کمی کا خدشہ ہوتا ہے اور ایک معزز اسکیمو کے لیے چھوٹے ریوڑ کا مالک ہونا نہایت ناخوشگوار ہوتا ہے۔"

سفر کے دوران ہم سویڈن کے نظامِ حکومت، خارجہ پالیسی، تعلیم اور سماجی بہبود کے پروگراموں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ نیل کو اپنی حکومت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف تھا۔

"غیر جانبداری منافقت کا دوسرا نام ہے" وہ کہہ رہا تھا" ہمارے ملک نے تو اسے کاروبار بنا رکھا ہے۔ ۱۸۰۵ء کے بعد ہم کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب یورپ کے تمام ملک نازیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے تھے اور وہاں کے باشندے بھوکوں مر رہے تھے، ہم غیر جانبداری کا ڈھونگ رچا کر تماشہ دیکھتے رہے بلکہ ہٹلر کو جنگی سامان فراہم کر کے خوب ہاتھ رنگے۔ اسی دولت سے اس فلاحی مملکت کی تعمیر ہوئی۔

اب سویڈن کے ایک عام مزدور کو لیجئے۔ اُس کی نوکری کا ذمہ سرکار پر ہے۔ مگر "مزدوروں کی انجمن" فراہم کرتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جاتا ہے تو مزدوروں کے فلاحی ہسپتال میں مفت علاج کروایا جاتا ہے۔ جسمانی ورزش کے لیے مزدوروں کی کھیلوں کی تنظیم کا رُخ کرتا ہے اگر وہ مر جاتا ہے تو .... یعنی صبح سے شام تک یا تو بڑی سرکار اس کی نگہداشت کرتی ہے یا بڑی

اماں مزدوروں کی انجمن کے زیر سایہ رہتا ہے۔ ملک نہ ہوا چڑیا گھر ہوگیا جہاں جانوروں کی دیکھ بھال داروغے کے ذمے ہوتی ہے۔

میں نے اُسے بتایا کہ ترقی پذیر ملکوں میں سویڈن کو سماجی بہبود کے معاملے میں نمونے کا ملک سمجھا جاتا ہے۔

"وہ میں آپ کو بتاتا ہوں" اس نے غصّے سے سٹیرنگ پر ہاتھ مار کر کہا "جنسی بے راہروی میں ہم تمام دنیا کو مات کرتے ہیں۔ خودکشیاں تو قومی مشغلے کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ یورپ کے تمام ملکوں میں اتنے پاگل اور عادی شرابی نہیں جتنے ہم نے پال رکھے ہیں۔ ایک شخص کار چوری کرتا ہے تو اسے تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ بھئی بُری بات ہے ایسا نہیں کرتے دوسری بار پکڑا جائے تو ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ کہا جو تھا ایسا نہیں کرتے۔ تیسری مرتبہ دھر لیا جائے تو معذرت کے ساتھ دو چار ماہ جیل بھیج دیا جاتا ہے اور اس کے بیوی بچّوں کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہوگئی آپ کی سماجی بہبود اور مجرموں کی اصلاح، اُدھر ہفتے کی رات کو معدودے چند سویڈش نشے میں دُھت ہوئے بغیر گھر لوٹتے ہیں۔ پاگل پن وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور تو اور ہمارا عظیم ڈرامہ نویس سٹرنڈبرگ بھی پاگل ہو کر مرا تھا۔ اور پھر ہم جنسی کی لعنت . . . . یہ ہے ایک نمونے کی فلاحی مملکت' ہمیں ایک خونی انقلاب کی ضرورت ہے۔" اس نے مکّا لہراتے ہوئے فیصلہ دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے الفرڈ نوبل کا نام لیا۔

"ہاں وہ ذاتِ شریف۔ اُن کی بھی سنیئے" اُس نے چمک کر کہا "آج کی دنیا کی آدھی مصیبتوں کا سہرا اُس شخص کے سر ہے۔ ڈائنا مائٹ ایجاد کرنے والا آدمی بنی نوع انسان کی بھلائی کا دعوےٰ کیسے کر سکتا ہے؟ نوبل انعامات ایک ڈھکوسلے کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

نیسل جب مجھے سٹاک ہوم سے تیس میل ادھر اُتار کر اُپسالا جانے والی شاہراہ پر مڑا تو سویڈن کے بارے میری معلومات میں گرانقدر اضافہ ہو چکا تھا۔

سٹاک ہوم کی نیلی شفق

رات کے دو بجنے کو تھے مگر گھُپ اندھیرا ہونے کی بجائے ہر سُو ہلکی سی روشنی تھی جیسے شام کا دھندلکا ہو۔ سٹاک ہوم جانے والی سڑک، اونچے درخت اور لہلہاتے کھیت مدھم روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ سامنے سنگِ میل پر "سٹاک ہوم۔ ۴۵ کلومیٹر" کے الفاظ صاف پڑھے جا رہے تھے۔ اس خطّے میں گرمیوں میں کسی وقت بھی مکمل تاریکی نہیں ہو پاتی۔ رات کا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی تاریکی کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں ہے وہ سویڈن میں آکر مہمل ہو جاتا ہے۔ گیارہ بجے سُورج غروب ہوتا ہے تو صُبح دو بجے پھر طلوع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح تین بجے دھوپ ہمارے ہاں کی تیز دوپہروں کی مانند چمک رہی ہوتی ہے۔ طلُوع و غروب کے درمیانی وقفے میں بھی زمین اور فلک کے درمیان روشنی کی ایک مدھم چادر بچھی رہتی ہے۔ اہلِ سویڈن اس روشنی کو نیلی شفق کا نام دیتے ہیں۔ صُبح کی خنکی سے بچنے کے لیے میں نے اپنی ہراتی پوستین پہن لی اور وہیں سڑک کے کنارے گھاس پر سستانے کی غرض سے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پُرانی کار سڑک پر سے گذری۔ کچھ دُور جا کر ڈرائیور نے بڑے زور کی بریک لگائی اور کار پیچھے لے آیا۔ یہ ایک بوڑھی کسان عورت تھی۔ جھُرّیوں سے بھرپور چہرے پر حیرت اور خوف کی

پرچھائیاں تھیں۔ "سکول" مَیں نے وہیں لیٹے لیٹے بڑھیا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سکول" اُس نے ایک دم خوش ہو کر جواب دیا۔ "اگر شاک ہوم چلنا ہے تو بیٹھ جاؤ۔" مَیں اپنا سامان اُٹھا کر کار میں آ بیٹھا۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" بڑھیا نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "مَیں اپنے فارم سے نکلی ہی تھی کہ تم نظر آ گئے۔ مشرقی ناک نقشے کا ایک اجنبی رات کے اس پہر سنسان سڑک کے کنارے لیٹا ہُوا اور پھر یہ خوفناک کھال کا کوٹ۔ مَیں نے سوچا ہو نہ ہو ضرور کوئی بھوت ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" مَیں نے جمائی لے کر کہا۔

"کیا ہو سکتا ہے؟" بڑھیا نے چونک کر کہا اور پھر اپنا پوپلا مُنہ کھول کر ہنسنے لگی۔

بڑھیا نے مجھے شہر کے باہر اُتار دیا۔ یہ شاک ہوم کی نواحی آبادی تھی۔ خوشنما رہائشی فلیٹوں کی درجنوں جدید اور بلند عمارتیں پھولوں کے حسین قطعات میں گھری ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک بہت بڑا پارک تھا۔ ابھی صرف تین بجے تھے مگر سورج جیسے سوا نیزے پر ہو۔ ہر سو چندھیا دینے والی دھوپ تھی۔ سارا علاقہ بالکل سُنسان پڑا تھا۔ سڑکیں، پارک، فٹ پاتھ بالکل خالی تھے۔ دُور دُور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں ایٹمی دھماکہ ہونے والا ہے اور یکدم خبر ہونے پر مکین اپنے گھروں کو چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ مَیں نے پارک کے کونے میں لگے فون بُوتھ سے ریاض کو فون کیا۔ "ری آز سپیکنگ" نیند میں ڈوبی ہوئی ایک بھاری آواز آئی۔

"ابے او ری آز کے بچے۔ سورج سر پہ آ گیا ہے اور تم ابھی تک سو رہے ہو؟"

"کون بول رہا ہے؟" آواز میں گھبراہٹ کا پہلو نمایاں تھا۔

"آپ کے والد صاحب سیالکوٹ سے تشریف لائے ہیں۔" مَیں نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "مستنصر بول رہا ہوں بھئی۔" اس کے بعد جو کچھ ریاض نے کہا وہ ناقابلِ اشاعت ہے۔

میں ریاض کو کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ قانون کی ڈگری لینے کے بعد اُس نے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وکالت تو خوب چلی مگر آمدن نہ ہونے کے برابر تھی۔ اِس کی وجہ اُس کے لاتعداد دوست تھے جو اپنے جاننے والوں کے مقدمے اُس کے پاس لے آتے اور فیس کے طور پر صرف چائے پلا کر ٹرخا دیتے۔ ایک مشترکہ دوست کے کہنے کے مطابق آدھا پاکستان ریاض کا دوست ہے اور باقی آدھا اُس سے ابھی متعارف نہیں ہُوا۔ خوش قسمتی سے اُسے سٹاک ہوم یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کا وظیفہ مل گیا۔ کورس کے خاتمے پر "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے ریاض سویڈن میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا بلکہ شادی بھی کر ڈالی۔ مجھے فون بُوتھ سے باہر آئے ہوئے ابھی چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ ریاض اپنی کار پر پہنچ گیا اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اُس میں اور تین سال قبل کے ریاض میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ البتہ اُس کی مشہورِ زمانہ پھڑکتی ہوئی مونچھیں غائب تھیں۔ کالج میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے اُس کے پاس اچھے پتّے آجاتے تو غیر ارادی طور پر اُس کی بائیں مونچھ پھڑکنے لگتی۔ یار لوگ فوراً اپنے پتّے پھینک جاتے اور وہ کچھ بھی جیت نہ پاتا۔ وطن کے حالات اور دوستوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اُس نے میرا سامان کار میں رکھا اور ہم سولنا کی طرف روانہ ہو گئے جہاں طلبا کے ایک جدید ہوسٹل میں اُس کا قیام تھا۔ ہوسٹل پہنچے تو ریاض کی بیوی آرڈرے برآمدے میں واقع باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ریاض نے میرا تعارف کروایا۔ "ہیلو مُستنصر" آرڈرے نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر کہا اور ایپرن سے ہاتھ صاف کر کے مُجھ سے مصافحہ کیا۔ "ریاض نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ تم لوگ کمرے میں بیٹھو، مَیں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔" ناشتے سے فارغ ہو کر دیر تک وطن کی باتیں ہوتی رہیں۔

"مجھے یونیورسٹی جانا ہے اور ریاض کے دفتر کا وقت بھی ہوا چاہتا ہے۔" آرڈرے نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم تمام رات سفر میں رہے ہو اِس لیے بہتر ہے آرام

کر لو۔"

میرے قیام کا انتظام برابر والے کمرے میں تھا۔ یہ آرڈرے کی ایک سہیلی کا تھا جو گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کے لیے اپنے آبائی قصبے کو جا چکی تھی۔ کمرے کا سامان اور کتابوں کے شیلف اُس کے مکین کے سُلجھے ہوئے ذوق کا پتہ دیتے تھے۔ دیواروں پر مشہور مصوروں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ ماؤ، ہوچی من اور چے گویرا کی بڑی بڑی تصاویر بھی آویزاں تھیں۔ یہ شخصیتیں مخصوص نظریات سے قطع نظر اُصولوں کی خاطر قربانی اور انقلابی جدوجہد کی وجہ سے یورپ کی نئی نسل میں بے حد مقبول ہیں۔ میں آرام دہ بستر پہ لیٹا تو پچھلی رات کی تھکاوٹ کا احساس سفید چادروں میں بسی ہوئی شینل اور ہیلن کرٹس کی مہک میں جذب ہو گیا۔

میری آنکھ کھُلی تو آرڈرے کمرے کی صفائی میں مشغول تھی۔ "تم پورے بارہ گھنٹے سوئے ہو۔" اُس نے میرا سوٹ کیس پلنگ کے نیچے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج شب ہم اپنے دوستوں کے ہمراہ سٹاک ہوم سے باہر ایک پارٹی پر جا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ آج مڈسمر نائٹ (Mid Summer Night) ہے؟"

"وہ شیکسپیئر والی؟" مَیں نے ہانک لگائی۔

"وہ خواب تھی یہ حقیقت ہے۔" آرڈرے کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

مجھے یاد آیا کہ آج جون کی تیئیس تاریخ ہے اور موسم گرما کا نصف سفر مکمل ہو چکا ہے۔ "نصف گرمیوں کی شب" سویڈن کا ثقافتی تہوار ہے جسے یہاں کے باشندے کرسمس سے بھی زیادہ دھوم دھام کے ساتھ مناتے ہیں۔

ریاض کے کمرے میں بے شمار لوگ جمع تھے جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ میرا تعارف ہوا۔ "مشتاق صاحب بھی لاہور کے ہیں۔ یہاں فلاسفی میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔" مشتاق کے کندھوں تک پھیلے ہوئے لمبے بالوں پر شیشوں سے مزین بلوچی ٹوپی نہایت بھلی

لگ رہی تھی۔" اور فرصت اوقات میں فیشن کے رسالوں کے لیے فوٹو بناتے ہیں۔ مچھلیاں پالتے ہیں۔ مشرقی موسیقی کا ایک کلب چلاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

"ستار بھی بجاتے ہیں وغیرہ وغیرہ" مشتاق نے اپنی بھاری مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے گرہ لگائی۔

"اور یہ ہے فاروق" میرے سامنے ایک وجیہہ اور خوش وضع نوجوان کھڑا تھا۔ "کنگز گاٹن میں پاکستانی ملبوسات کی دکان کرتا ہے۔ جب اسے اپنے دوسرے "مشاغل" سے فرصت ملے تو!" فاروق نے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا۔ معلوم ہوا کہ اُس کا قہقہہ لگانے کا انداز سائک ہوم کی لڑکیوں کے لیے بم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پتلا دُبلا حامد انڈونیشیا کا تھا۔ "گلبرٹ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پاکستانی عیسائی ہے۔" ریاض نے ٹیپ ریکارڈر کے پاس کھڑے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ "اپنے کمرے کی پوری دیوار پر پاکستانی پرچم آویزاں کر رکھا ہے۔ ہندوستانیوں سے کہتا ہے جوتے اتار کر کمرے میں آؤ۔ پوتر جگہ ہے۔"

آر ڈرے نے کافی اور کریم کیک سے مہمانوں کی تواضع کی۔ اب سورج کے غروب ہونے کا انتظار تھا۔ "مڈسمر نائٹ" منانے کے لیے رات کا ہونا نہایت ضروری ہے چنانچہ گیارہ بجے تک انتظار کرنا پڑا۔ ہم سب ہوٹل کی سیڑھیاں اُتر کر کاروں میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ شہر سے آنے والی سڑک کے موڑ پر ایک ننھی مُنی "ببل کار" نمودار ہوئی جو واقعی ایک غبارے جیتنی تھی۔ کار ہمارے پاس آکر رُکی تو اُس کا سامنے کا پورا حصّہ دروازے کی صورت میں کھل گیا اور ایک نہایت پھرتیلی اور شوخ قسم کی لڑکی اُچک کر باہر نکل آئی۔ وہ ایک تیز سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے لبوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔

"ماگر یتا کی بچی کہاں مر گئی تھیں؟" آر ڈرے نے آگے بڑھ کر غصّے سے پوچھا۔ "ہم لوگ

تمہارا انتظار کرنے کے بعد اب جا رہی رہے تھے۔"

"ہمیں پیرس میں تاخیر ہو گئی تھی۔ پرواز ابھی ابھی یہاں پہنچی ہے۔ سیدھی ایئرپورٹ سے آرہی ہوں۔" اُس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

"مُستنصر، میری عزیز ترین سہیلی ماگریتا سے ہلو۔" آرڈرے نے تعارف کروایا۔ "سکینڈے نیوین ایئر سروس میں ایئر ہوسٹس ہے۔"

"ہیلو" اُس کے لبوں پر ایئر ہوسٹسوں کی مخصوص مصنوعی مسکراہٹ کھیل گئی۔ یہ تبسم یہ تکلّم اُس کی عادت ہی تو تھی مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے ابھی پوچھے گی۔ "آپنے اپنی حفاظتی پیٹی کس کر باندھ لی ہے نا؟ ہم پرواز کرنے والے ہیں۔" مارگریتا کی "ببل کار" میں چونکہ صرف دو نشستیں تھیں اس لیے اُسے ہوسٹل کے باہر پارک کر دیا گیا اور ہم مشتاق کی کار میں سوار ہو گئے۔ مارگریتا اور آرڈرے اگلی نشست پر تھیں۔ میں، ریاض اور ایک بیوقوف سی سویڈش لڑکی کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"مجھے اُمید ہے کہ آپ کا سفر خوش گوار طریقے سے کٹا ہو گا؟" ماگریتا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ماگریتا تم مُستنصر کے ساتھ اپنے ہوائی مسافروں ایسا سلوک کر رہی ہو۔" میرے کچھ کہنے سے قبل ہی آرڈرے نے ڈانٹ پلا دی۔ "تم اب پرواز پر نہیں ہو۔"

"سوری۔ بس عادت سی ہو گئی ہے۔" اُس نے جھینپ کر کہا۔

پہلے سٹاک ہوم کی جدید نواحی بستیاں گذریں پھر چھوٹے چھوٹے خوبصورت قصبے آئے۔ اب ہم بڑی شاہراہ سے مُڑ کر ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ یکلخت ہر سُو تاریکی چھا گئی۔ ہم صنوبر کے گھنے جنگل میں سے گذر رہے تھے۔ جنگل ختم ہوا تو دُور افق پر ایک جھیل نظر آئی۔

"جھیل کے کنارے ایک قدیم گاؤں ہے جس کے قریب کھُلی فضا میں ہر سال "مِڈسمر نائٹ"

کا جشن منایا جاتا ہے۔" آرڈرے نے مجھے بتایا۔

مشتاق، ماگریتا کو اپنی محبوب مچھلیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔" میں پچھلے سال پاکستان گیا تو سارا عرصہ مقامی مچھیروں کی مدد سے گوادر کے آس پاس بحیرۂ عرب میں مچھلیاں پکڑتا رہا اور پھر اُنہیں پانی سے بھرے پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر کے یہاں لے آیا۔ نہایت نادر اقسام ہیں۔ اب میں اُن کی نسل کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

" آپ مچھلیوں کے نَر اور مادہ میں کیسے تمیز کرتے ہیں" ساتھ بیٹھی بیوقوف سویڈش لڑکی نے جلدی سے سوال کیا۔

" بچوں کو نہیں بتایا کرتے " مشتاق نے جواب دیا اور پھر ماگریتا سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔" آپ کو مچھلیوں سے دلچسپی ہے ؟ "

" مجھے تلی ہوئی مچھلیاں بے حد پسند ہیں" ماگریتا نے شوخی سے جواب دیا۔

مشتاق نے مُنہ بنالیا۔

جھیل کے کنارے سینکڑوں لوگ سویڈن کے روائتی لباسوں میں ملبُوس خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ساتھ والے جنگل سے کاٹے ہوئے سفیدے کے تنے زمین میں گاڑ کر اُنہیں جنگلی بیلوں، خوشنما پھولوں اور ہرے بھرے پتّوں سے سجایا گیا تھا۔ سبزے کے اِن ستونوں کے پاس میزوں پر کھانے اور خاص طور پر پینے کی وافر مقدار موجود تھی۔ مَیں نے ہجوم سے دُور ایک پُرسکون کونے کا اِنتخاب کیا اور اپنی سفید برساتی نرم گھاس پر بچھا کر بیٹھ گیا۔ سب سے اونچے آرائشی تنے کے نیچے مقامی موسیقاروں کا ایک طائفہ سویڈن کے روائتی رقص کی دُھن بجانے لگا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر سجے ہوئے تنوں کے گرد ایک دائرہ سا بنا کر ناچنا شروع کر دیا۔ بوڑھوں کو رقص سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ وہ شراب کے تسلوں کے گرد کھڑے ہاتھوں میں اپنے وائکنگ آبا ؤ اجداد کی طرح سینگ نما جام لیے صرف شور مچانے پر ہی اِکتفا کر رہے تھے۔

"تم رقص کیوں نہیں کرتے ؟" ماگریتا بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ وہ مسکرا رہی تھی بالکل ننھے سے معصوم بچے کی مانند۔ مجھے احساس ہوا کہ اُس کی مسکراہٹ بے حد دلکش تھی۔ لمبی تڑنگی سنہری بالوں والی سویڈش لڑکیوں سے وہ یکسر مختلف تھی۔ اُس کا بوٹا سا قد اور کالے بال بالکل اطالوی لڑکیوں کی طرح تھے۔

"مَیں رقص کے فن سے ناواقف ہوں" مَیں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"بالکل مُشکل نہیں" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر شوخی سے کہا۔ "دائرے میں شامل ہو کر یونہی ہاتھ پاؤں ہلاتے رہنا۔ تمام روائتی رقص اِسی طرح کے ہوتے ہیں۔"

ہم نے ایک آرائشی تنے کے گرد رقص کرتے ہوئے لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کی تو ایکدم پیچھے سے کسی نے ہم دونوں کو دھکیل دیا۔ اب ہم دائرے کے درمیان میں کھڑے تھے اور تمام لڑکے اور لڑکیاں چیخ چیخ کر ہمیں رقص کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ماگریتا نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی جیسے پوچھ رہی ہو کیا خیال ہے ؟ مَیں نے سَر ہلا دیا، مجھ سے نہ ہو گا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پہ رکھ دیے اور ہنس کر کہنے لگی "بزدل"۔ مَیں نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کر دیے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ماگریتا کھلکھلا کر ہنس دی اور دونوں ہتھیلیاں کولہوں پہ جما کر روائتی دھن پر ایک تیز اور شوخ رقص شروع کر دیا۔ اُس کے قدم نپے تُلے تھے اور تال کے مطابق اُٹھ رہے تھے۔ چند لوگوں نے موسیقی کے ساتھ ساتھ تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ مَیں ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے اُس کی والہانہ ہنسی اور رقص کی بے ساختگی کے انداز دیکھتا رہا۔ موسیقی کی لَے تیز ہوئی تو ماگریتا نے پنجوں کے بَل تیزی سے گھومنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی تیزی سے حرکت کر رہی تھی کہ اُس کے چہرے کے نقش بھی دُھندلے سے دِکھائی دینے لگے۔ مگر اِس حالت میں بھی اُس کی سدابہار مسکراہٹ کی لہریں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ اُس کا سُرخ لباس اُس کے گرد ہوا میں ایک دائرے کی صورت میں گھوم رہا تھا جس کے درمیان ماگریتا کا سفید جسم ایک کنول کی مانند کِھلا ہوا تھا۔ موسیقی ختم ہوئی تو

دائرہ ٹوٹ گیا اور ہم کھانے کی میز پہ آ گئے۔

"یہ کچی مچھلی کے سینڈوچ کھاؤ، اہلِ سویڈن کی مرغوب غذا ہے اور مجھے بھی بیحد پسند ہے۔"

"لیکن تمہیں تلی ہوئی مچھلی نہایت اچھی لگتی ہے۔"

"وہ صرف ایک ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے والے مسافر سے پیچھا چھڑانے کیلئے کہا گیا تھا۔"

"اور جو مسافر ضرورت سے کم دلچسپی لے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اُسے کچی مچھلی کھلائی جاتی ہے۔" اُس کے نیم وا ہونٹوں پر ایک بار پھر بھرپور مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

موسیقی دوبارہ شروع ہوئی تو ایک بوڑھے سویڈش نے کمال خوش اخلاقی سے ماگریتا کو رقص کے لیے مدعو کیا اور وہ دونوں رقص کرتے ہوئے لوگوں کے دائرے میں شامل ہو گئے۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت جانا اور واپس اپنے کونے میں آ کر برساتی پر لیٹ گیا۔ لوگوں کا شور اور موسیقی کی آواز مدھم ہوتی گئی اور میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھُلی تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جھیل کی سطح اتنی روشن اور چمکدار تھی کہ اُس طرف دیکھنا بھی دُوبھر ہو رہا تھا۔ چند لوگ اب بھی رقص کر رہے تھے۔ باقی اِدھر اُدھر گھاس پر سو رہے تھے۔ مَیں کروٹ بدل کر اُٹھنے لگا تو معلوم ہوا کہ ماگریتا میرے پہلو میں بیٹھی بڑے مزے سے سینڈوچ کھا رہی ہے۔ "صُبح ہو گئی ہے؟" مَیں نے جماہی لے کر کہا۔

"صُبح نہیں ہوئی ابھی صرف سورج نکلا ہے۔ تین ہی تو بجے ہیں۔" اس نے سینڈوچ کاٹ کر ایک حصہ مجھے تھما دیا۔ تمام شب رقص کرنے کے باوجود وہ تازہ اور شگفتہ نظر آ رہی تھی میں نے

جھیل پر جا کر خنک پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور واپس آ گیا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"ریاض اور آرڈورے نصف شب کے فوراً بعد واپس شاک ہوم چلے گئے تھے۔ فاروق تین لڑکیوں کے ساتھ جنگل کی طرف گیا تھا۔ واپس نہیں لوٹا البتہ مشتاق یہیں پر ہے اور ایک بوڑھے کے ساتھ اس جھیل پر مچھلی کے شکار کا پروگرام بنا رہا ہے۔"

"تم بھی ریاض اور آرڈورے کے ساتھ چلی جاتیں۔"

"مَیں چلی جاتی تو یہاں سوئے ہوئے مسافروں کی دیکھ بھال کون کرتا؟" اُس کی مسکراہٹ میں شرارت کی پُھلجھڑیاں تھیں۔

آخر میں موسیقاروں نے ایک لوک نغمے کی دُھن چھیڑ دی۔ سب لوگوں نے گانا شروع کر دیا۔ "ویم کان سیگلا فراوٹن وِنڈ"

"اِس کا مطلب تو سمجھ میں نہیں آتا"۔ مَیں نے ماگریتا سے کہا جو اب میرے ساتھ بیاقی پر بیٹھی خاموشی سے نغمے کے بول سُن رہی تھی۔ اُس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور کہنے لگی "اس کا مطلب ہے.....

"کون ہے جو ہوا کی غیر موجودگی میں کشتی رانی کر سکتا ہے؟

کون ہے جو چپو کے بغیر نیّا کھے سکتا ہے؟

اور ـــــ کون ہے جو اپنے محبوب سے آنسو بہائے بغیر جُدا ہو سکتا ہے؟"

وُہ تھوڑی دیر کے لیے رُک کر نغمے کے بول سُنتی اور پھر ایک ایک لفظ کا ترجمہ کرتی جاتی۔

"مَیں ہوا کے بغیر کشتی رانی کر سکتی ہوں۔

مَیں چپّو کے بغیر نیّا کھے سکتی ہوں۔

لیکن..... اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا،

میں اپنے محبوب سے اشک بار ہوئے بغیر جُدا نہیں ہو سکتی۔"

نِصف گرمیوں کی شب کے خواب کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

چند سال پیشتر جب میں پہلی مرتبہ سویڈن آیا تو سٹاک ہوم سے چند میل اُدھر مجھے ایک سویڈش جوڑے نے لفٹ دی۔ مرد کی ٹانگیں فالج گرنے سے ناکارہ ہو چکی تھیں اسلیے کار اُس کی بیوی چلا رہی تھی۔ اُس شام موسم بے حد خراب تھا، بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ اُن دونوں نے مجھے اپنے گھر شب بسری کی دعوت دی لیکن میں نے انکار کر دیا اُس رات کیمپنگ میں شدید بارش ہوئی اور میرا چھوٹا سا خیمہ پانی میں تیرنے لگا۔ میں اپنے سامان پر بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا کہ ایک کار کی روشنیاں میرے خیمے پر پڑیں اور ساتھ ہی کسی نے میرا نام پکارا۔ یہ وہی میاں بیوی گستاف اور برگیتا تھے۔ "ہمیں گھر پہنچ کر احساس ہوا کہ اِس طوفانی رات میں تمہیں یہاں چھوڑ کر ہم نے سخت حماقت کی ہے۔ تم ابھی ہمارے ساتھ گھر چلو۔" وہ مجھے ساتھ لے آئے اور میں سٹاک ہوم کے قیام کے دوران اُنہی کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اُن کی بے لوث محبت اور پیار نے میرا دِل موہ لیا۔ آج میں اُن دونوں کو اتنے عرصے کے بعد ملنے جا رہا تھا۔ سلاؤسن کے علاقے میں واقع فلیٹ پر میں نے گھنٹی بجائی اور تھوڑی دیر بعد میرے سامنے برگیتا کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی والہانہ طور پر گلے لگا لیا اور پھر میرے ماتھے کو چوما۔ "تم نے ہمیں اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ کہاں ٹھہرے ہو! کتنے روز ہو گئے؟ شادی ہو گئی؟" اُس نے وہیں کھڑے کھڑے لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔

"برگیتا دروازے پر کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"مُستنصر آیا ہے گستاف، پاکستان سے۔"

گُستاف اپنی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ "ہا ہا۔ میرا پاکستانی بیٹا آ گیا

ہے" اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور اپنی ایک بیساکھی میز پر رکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ مَیں اپنی آنکھیں جھپکنا نہیں چاہتا تھا مبادا آنسو ٹپ سے بہ نکلیں۔

"ٹونی۔ ٹونی" گستاف نے آواز دی۔ پانچ چھ سال کا ایک خوبصورت بچّہ کمرے سے نکلا اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "مستنصر تمہیں یاد ہے ہمیں اولاد کی کتنی چاہت تھی۔ خدا نے پچھلی عمر میں ہمیں یہ چاند سا بیٹا دیا ہے" مَیں نے شفقت سے ٹونی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بھئی یہاں کیوں کھڑے ہیں سب لوگ۔ ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں" برگیتا میرا بازو پکڑ کر اندر لے گئی۔

"تم اب کم از کم ایک سال ہمارے پاس رہو گے" گستاف نے تحکمانہ لہجہ اختیار کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "تم جہاں بھی ٹھہرے ہو فوراً اپنا سامان لے کر یہاں آ جاؤ۔ تمہارا پُرانا کمرہ اتنے عرصے سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ بلکہ مَیں کار پر جا کر سامان لے آتا ہُوں۔ مَیں اب کار بھی چلا لیتا ہوں۔ والوا کمپنی نے میرے لیے خاص طور پر ایک کار تیار کی ہے جسے چلانے کے لیے ٹانگوں کا استعمال نہیں کرنا پڑتا، صرف ہاتھوں سے کام لیا جا سکتا ہے" مَیں نے اُنہیں بتایا کہ اب کی بار میں لنڈن سے نہیں بلکہ سیدھا پاکستان سے آ رہا ہوں اور ابھی مجھے اور بھی بہت سے ملک دیکھ کر سردیاں شروع ہونے سے قبل وطن لوٹ جانا ہے جہاں اُن جیسے ہی شفیق ماں باپ میری واپسی کے منتظر ہیں۔

برگیتا نے شام کے کھانے پر میرے لیے خصوصی طور پر پلاؤ اور بُھنا ہُوا گوشت پکایا جس کی ترکیب اُس نے عورتوں کے کسی رسالے میں پڑھی تھی۔ "سویڈن میں لوگ اب مشرقی کھانوں کی لذّت سے آشنا ہو رہے ہیں۔ مرچیں، ادرک، پودینہ اور گرم مصالحہ تقریباً ہر بڑے سٹور سے دستیاب ہے" برگیتا نے میری پلیٹ پلاؤ سے لبالب بھر دی۔

کھانے کے بعد مَیں نے اُنہیں وہ تحفے دیے جو مَیں خاص طور پر اُن کے لیے پاکستان سے لایا تھا۔ گستاف کے لیے ململ کا کڑھائی دار کُرتہ اور چاندی کے کف لنک۔ برگیتا کے لیے

کشمیری شال اور سندھی ہار۔ دونوں میاں بیوی نے ایک مرتبہ پھر اُٹھ کر میرے ماتھے کو چوما۔

"کم از کم آج رات تم ہمارے ہاں ہی ٹھہرو گے۔" گستاف نے کرُتہ اپنی قمیض کے اوپر ہی پہن لیا تھا۔

"اور کل ہم چند روز کے لیے اپنے سمر ہاؤس جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" برگیتا نے خالصتاً مشرقی انداز میں چادر اپنے سَر پر اوڑھتے ہوئے کہا۔ گستاف کا خوب صورت سمر ہاؤس سٹاک ہوم سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک گھنے جنگل میں تھا۔ لان میں بے تحاشا گھاس اُگی ہوئی تھی۔ مَیں نے گھاس کاٹنے والی زنگ آلود مشین کے کَل پُرزے کسے اور گھاس کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

"جوان بیٹے اِسی طرح بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں۔" گستاف نے جو آرام کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا پائپ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔ برگیتا اندر کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ شام کو ہم وہاں سے تھوڑی دور ایک قصبے میں گئے جہاں گستاف کے عمر رسیدہ والدین ایک آرام دہ گھر میں زندگی کے آخری ایّام بڑے سکون سے گذار رہے تھے۔ سمر ہاؤس میں گذارے ہوئے روز و شب مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے مَیں نے اپنے گھر سے باہر کبھی قدم بھی نہیں رکھا۔ مجھے وہاں ماں باپ کی شفقت اور اپنے گھر کا سا آرام مُیسّر تھا۔ جنگل کی دُھند آلود اور خوشگوار صبح مُجھے اور برگیتا کو اپنے درمیان پاتی۔ ہم دوپہر کے کھانے کے لیے کُھمب اکٹھے کرتے اور جنگلی پھُول چُن کر اُن کے گلدستے تیار کرتے جو سمر ہاؤس کے کمروں کی زینت بنتے۔ پچھلے پہر میں اور گستاف جھیل کی طرف سیر کے لیے نکل جاتے جہاں اُس کی اپنی موٹر بوٹ لکڑی کے ایک تختے سے بندھی ہوتی۔ میں اُسے سہارا دے کر موٹر بوٹ میں بٹھاتا اور انجن سٹارٹ کر دیتا۔ ہم جھیل کا ایک چکر لگا کر کشتی عین درمیان میں لے جا کر انجن بند کر دیتے۔ کشتی ساکن ہو جاتی تو ہم مچھلیاں پکڑنے کی ڈوری پانی میں ڈال دیتے۔ شام تک جتنی مچھلیاں پکڑتے وُہ رات کو کھانے کی

میز پر سج جاتیں۔

گستاف کی چھٹیاں ختم ہوگئیں اور ہم واپس شہر آ گئے۔ اُنہوں نے مجھے ہوسٹل سے باہر اُتار دیا۔ ریاض کے کمرے میں آڈرے کے علاوہ حامد اور فاروق بھی براجمان تھے۔

"تم کہاں غائب رہے اتنے روز؟ ہم آج پولیس کو اطلاع کرنے والے تھے۔" ریاض مجھ پر برس پڑا۔ اُس کی تشویش بجا تھی۔ مجھے سمر ہاؤس جانے سے قبل اُسے فون کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے بھرپور معذرت کی اور بڑی مشکل سے منایا۔

"میں تو کہتا تھا کہ مستنصر جیسے لڑکے کا سٹاک ہوم میں "محفوظ" رہنا ناممکن ہے۔ ضرور کسی لڑکی ڈڑکی نے اغوا کر لیا ہے۔" فاروق نے اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے میرے کندھے پر دھپ رسید کی۔ "بہرحال تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔ شام کا کھانا کسی ریستوران میں کھائیں گے۔"

"بارنز" سٹاک ہوم کا قدیم ترین اور سب سے مہنگا ریستوران ہے۔ ہم جوئے کے کمرے اور بار سے گذر کر ایک وسیع ہال میں آ گئے جہاں بے شمار لوگ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھے۔ ہم نے موسیقاروں کے ایک طائفے کے نزدیک ایک میز کا انتخاب کیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ "گراں قیمت ہونے کی وجہ سے یہاں صرف امیر بوڑھے اور غیر شادی شدہ بوڑھیاں ہی آتی ہیں۔" فاروق نے ایک تجربہ کار شکاری کی مانند "شکار گاہ" کا جائزہ لیا۔

"ہاں بوڑھیاں۔" حامد مُنہ کھول کر ہنسنے لگا۔ موسیقی شروع ہوئی تو وہ بھی نہایت سُست رو اور دھیمی قسم کی تھی۔ فاروق نے اپنی ٹائی کی گرہ دُرست کی۔ حامد نے ایک گہرا سانس لیا اور دونوں بڑے اعتماد سے کونے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ اُن کے ساتھ محوِ رقص تھے۔ میں آڈرے کو سمر ہاؤس میں گذارے ہوئے شب و روز کے بارے میں بتانے لگا۔ موسیقی ختم ہوئی تو فاروق لڑکی کے ساتھ واپس آ گیا۔ حامد اکیلا تھا۔

"کیا ہُوا میرے دوست؟" میں نے اُس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"میں نے لڑکی کو اپنی عمر پچیس سال بتائی تو کہنے لگی تم میرے لیے بہت ہی کم عمر ہو۔ پھر میں نے کہا کہ دراصل میں پینتیس سال کا ہوں تو وہ ناراض ہو کر چلی گئی کہ تم تو بالکل بوڑھے ہو۔"

"ویسے تمہاری ٹھیک عمر کیا ہے حامد؟"

"پینتالیس سال۔" حامد نے کھسیانے ہو کر جواب دیا۔ "ہم انڈونیشین شکل سے ہمیشہ کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔"

فاروق کی ساتھی لڑکی بے حد باتیں کر رہی تھی۔ "کتنا رومانی تخیّل ہے۔" وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "افریقہ کے گھنے جنگلوں میں کافی کے باغ۔ آپ کو شیروں وغیرہ سے ڈر نہیں لگتا؟"

"کون سے شیروں سے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ فاروق نے ایک زوردار ٹھوکا میری کمر میں رسید کیا۔ میں پھر بھی بات کی تہ کو نہ پہنچ سکا۔

"وہی جو رات کی تاریکی میں آپ کے مویشی اُٹھا لے جاتے ہیں۔"

"کون سے مویشی؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔" فاروق نے جلدی سے اردو میں کہا۔ "میں نے اسے بتایا ہے کہ افریقہ میں ہم دونوں کاشتکاری کرتے ہیں۔ لڑکیوں کو اپنی اصلی شہریت بتانے سے مُلک کی بدنامی ہوتی ہے۔"

"ہاں وہ شیر!" میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور جم کاربٹ کے سارے کارنامے اپنے نام سے موسوم کر کے سُنا دیے۔ فاروق اب بے حد خوش تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دَور چلا۔ فاروق اور اُس کی ساتھی لڑکی دوبارہ رقص کے لیے چلے گئے۔ وہ بڑے غور سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی۔ شاید فاروق اُسے اُن خونخوار ہاتھیوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو ہماری گنّے کی فصل کا ستیاناس کر جاتے ہیں۔ ریاض اور آرڈر سے کچھ دیر کے لیے اپنے کسی واقف کار جوڑے کی میز پر چلے گئے۔

"معاف کیجئے گا۔" میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک معمر ویٹر سر جھکائے سرگوشی کر رہا تھا۔

"میز نمبر فلاں پر ایک محترمہ آپ کی رفاقت کی خواہش مند ہیں۔ آپ اُن کے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گے ؟" اُس نے سر ہلائے بغیر دونوں آنکھیں گھما کر ہال کے نسبتاً تاریک حصے کی جانب اشارہ کیا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں ایک محترمہ ہاتھ میں جام لیے میری طرف دلنواز مسکراہٹوں کے انبار پھینک رہی تھیں۔ کم از کم پچاس کا سن ہو گا۔

"اُن سے کہیے گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں کیوں اپنی عاقبت کا ستیاناس کرتی ہیں۔" ویٹر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

"'بارز' رفاقت کی خواہش مند امیر عورتوں کا پسندیدہ ریستوران ہے۔" حامد نے بتایا۔

کافی پینے کے بعد فاروق کی معیت میں جوئے کے کمرے کی زیارت کی گئی۔

"مقصد جوا کھیلنا نہیں۔" فاروق نے سُرخ ٹھیپے رُولٹ کی میز پہ جماتے ہوئے کہا، "بلکہ ایک خوبصورت شام کے احساسات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ رقص و طعام کے ساتھ جوا بھی انہی احساسات میں شامل ہے۔" چنانچہ احساسات میں ہم آہنگی پیدا کی گئی اور نتیجے میں فاروق کو گھر جانے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ حامد سے اُدھار لینا پڑا۔

دُوسری صبح میں غسل خانے میں شیو بنا رہا تھا کہ باہر دستک ہوئی۔ میں نے تولیے سے صابن کا جھاگ پونچھا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

"صبح بخیر" باہر ماگریٹا کھڑی ہنس رہی تھی۔ "آج میری کوئی پرواز نہ تھی میں نے سوچا آرڈرے سے ہی مل آؤں۔"

"اگر تم آرڈرے سے ہی ملنے آئی ہو تو وہ ساتھ والے کمرے میں رہتی ہے۔" میں نے مذاق سے کہا۔ "فی الحال میرے بارے میں کیا خیال ہے ؟" ہم کمرے میں آ گئے۔

"بہت ہی اچھا خیال ہے۔" اُس نے شوخی سے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر سر پہ بندھا

سُرخ رومال اُتار کر اپنے سیاہ بال ٹھیک کرنے لگی۔ "ویسے بھی مَیں روزانہ آرڈرے کو فون کر کے تمہارے بارے میں دریافت کرتی تھی مگر تم جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔" مَیں نے اُسے گُلستان کے سمر ہاؤس کے بارے میں بتایا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ تم اب تک صرف سٹاک ہوم کے نواح میں گھومتے رہے ہو، شہر بالکل نہیں دیکھ پائے۔"

"اور آج . . . " مَیں نے اپنا کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کوئی پرواز نہیں اور تم آسمانی مسافروں کی بجائے ایک پاکستانی مسافر کو شہر کی سیر کراؤ گی۔"

"بالکل دُرست" وُہ فوراً صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور آج . . . موسم بھی خوش گوار ہے۔"

سویڈن میں پاگل پن، جنس اور الکوحل کے ساتھ موسم بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ موسم سرما میں یخ بستہ ہواؤں اور برفیلے طوفانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے سُورج نکل آئے تو روشنی صرف دو گھنٹے رہتی ہے۔ لوگ ایک نیم تاریک برفانی ماحول میں بے جان لاشوں کی طرح گھسٹتے پھرتے ہیں۔ فرانسیسی فلاسفر ڈیس کارٹیس سویڈن میں، ہی رائل لائبریری کے خنک کمروں میں سردی کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا تھا۔ ایک سویڈش کے لیے خوشگوار موسم کا مطلب چمکتی دھوپ اور نیلا آسمان ہے جو سال میں دس ماہ اُس کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

ہم ہوسٹل کے سامنے والے پارک کو عبور کر کے زمین دوز ریلوے سٹیشن پر آئے اور شہر کے قلب میں واقع سینٹرالن سٹیشن کے ٹکٹ خرید لیے۔ ریلوے کے ڈبے میں مسافروں کے درمیان دو بوڑھے فرش پر بے سُدھ پڑے تھے۔ "سویڈن کے لاکھوں عادی شرابیوں میں سے دو" ماگریتا کے چہرے پر ایک ناخوشگوار تاثر تھا۔ سینٹرالن آیا تو ہم دونوں اُتر گئے۔ مَیں دروازے کے ساتھ سٹال پر سگریٹ خرید کر پیچھے مُڑا تو ایک ایشیائی لڑکا ماگریتا سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

"مستنصر یہ بیچارہ راستہ بھول گیا ہے۔" ماگریتا کے لہجے میں تأسف تھا۔

درمیانے قد کا ایک خوش شکل لڑکا ہاتھ میں سٹاک ہوم کا نقشہ لیے بڑی معصومیت سے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ "آپ راستہ بھول گئے ہیں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔" مَیں نے آگے بڑھ کر انگریزی میں کہا۔ "راستہ وغیرہ نہیں بھولا جی!" اُس نے اُردو میں جواب دیا۔ اُس کے چہرے کی معصومیت غائب ہو چکی تھی۔ "یہ تو لونڈیاں پھانسنے کے چکر ہیں۔"

"جی۔۔۔۔!"

"جی ہاں۔ مَیں ویسے تو لندن میں نوکری کرتا ہوں مگر گرمیوں کی چھٹیاں میں سٹاک ہوم آجاتا ہوں۔ بڑی منت ہے یہاں پر ایشیائی لڑکوں کی۔۔۔۔" اُس نے لچّوں کی طرح مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "شہر کا نقشہ ہاتھ میں لے کر کسی بھی سٹیشن کے باہر کھڑا ہو جاتا ہوں اور پھر ہر حسین لڑکی سے راستہ پوچھتا ہوں۔ دس میں سے چھ فون نمبر دے جاتی ہیں۔ کم از کم تین ملنے کے لیے بھی آجاتی ہیں اور ایک۔۔۔۔ بڑی بدمعاش قوم ہے جی۔" اُس کے زوردار قہقہے نے چند راہگیروں کو ہماری طرف متوجہ کر لیا۔ مَیں نے ماگریتا کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے سٹیشن کے باہر آگیا۔

"کم از کم اُس بے چارے کو راستہ ہی بتا آتے۔" ماگریتا نے کہا۔

"وُہ بے چارہ تمام راستے بخوبی جانتا ہے۔"

سٹیشن کے سامنے والی سڑک پار کر کے ہم سینٹرل پُل پر آگئے۔ پُل کے پہلو میں سے سٹاک ہوم کے ٹاؤن ہال کو سیڑھیاں اُترتی تھیں۔ اوسٹبرگ کی تعمیر کردہ یہ عمارت وینس کے سینٹ مارک کلیسا سے بے حد مشابہت رکھتی ہے۔ سٹاک ہوم کا شہر بھی وینس کی طرح چند بڑے جزیروں کا مجموعہ ہے جنہیں اطالوی طرز کے پُل ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ ٹاؤن ہال دیکھنے کے بعد ہم شہر کی مشہور سڑک گُنگز گاٹن پر گھومتے رہے۔ کانسرٹ ہال، کُنگز اُپل، پَب کا ڈیپارٹمنٹل سٹور جہاں گریتا گاربو ایک معمولی سیلز گرل کی حیثیت سے عورتوں کے

ہیٹ فروخت کیا کرتی تھی۔ کنگز گاٹن کے بعد ہم شہر سے باہر شہزادہ یوجین کا محل دیکھنے گئے۔
شہزادہ یوجین کا محل گھنے درختوں اور سرسبز پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں سے سمندر کی ایک شاخ نہر کی صورت میں سٹاک ہوم کے شہر میں داخل ہوتی ہے۔ شہزادے کا محل ۱۹۴۸ء میں پبلک کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ پھولوں کے تختوں اور بلند درختوں کے درمیان چلتے ہوئے ہم سمندر کے کنارے آ گئے۔ جہاں بے شمار لوگ بینچوں پر بیٹھے دھوپ اور تازہ سمندری ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم ساحل کے ساتھ پانی میں ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔

"نہر کے پار سامنے والی پہاڑی پر میرا فلیٹ ہے۔" ماگریتا نے جدید عمارتوں کے ایک مجموعے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ اپنے سفید لباس میں بالکل کوپن ہیگن کی ننھی جل پری لگ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ننھی جل پری بندرگاہ کی طرف نظریں جمائے شہزادے کے انتظار میں سوگوار بیٹھی تھی اور ماگریتا نے کبھی سوگوار ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔ ہم شام ڈھلے شہر کے لیے واپس روانہ ہوئے۔ بس کی بجائے ہم سکانسن پارک کے گھاٹ سے ایک سٹیمر پر بیٹھ گئے جو شہر کے دوسرے حصے سلاؤسن جا رہا تھا۔ سمندر کی نم آلود ہوا میں خنکی تھی۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر ماگریتا کے کندھوں پر ڈال دیا۔ سٹیمر سکانسن کے تفریحی پارک سے لوٹتے ہوئے جوان لڑکے اور لڑکیوں سے پُر تھا جو باقی مسافروں کی موجودگی سے بے نیاز آزادانہ "چہلیں" کر رہے تھے۔ ایک سُرخ بالوں والی لڑکی گینگ وے پر تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور ایک دم میرے قریب آ کر میرے بالوں کی لٹ پکڑ کر کھچ سے قینچی کے ساتھ کاٹ ڈالی۔ "سوونیئر" وہ ناک سکیڑ کر مسکرا دی اور لٹ ہینڈ بیگ میں رکھ کر اُلٹے قدموں اُسی تیزی سے چلی گئی۔ "حجام کی بچی" میں نے بوکھلا کر کہا۔ ماگریتا نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں کالے بال، کالی آنکھیں اور گندمی رنگ بے حد پُرکشش سمجھے جاتے ہیں۔ سُرخ، سنہری اور بھورے بال اور آنکھیں دیکھ دیکھ کر ہم اُکتا چکے ہیں۔ سویڈن کے بچے بھی کالے رنگ کی گڑیاں پسند کرتے ہیں۔

اس لڑکی کو شاید تم ایک حسین گڈّے کی صورت میں نظر آئے تھے۔" میرا چہرہ سُرخ ہوگیا۔
سٹیمر سے اُتر کر ہم نے سلاؤسن کا پُل پار کیا اور "پارلیمنٹ کے جزیرے" پر آگئے جہاں شہر کی قدیم عمارتیں مثلاً رائل پیلس، ہاؤس آف نوبلز اور مرکزی کلیسا واقع ہیں۔ یہ سٹاک ہوم کا پُرانا حصّہ ہے جہاں اب بھی پتھریلی تنگ گلیاں اور بوسیدہ مکان ہیں۔ قدیم اور دیدہ زیب پُل مختلف حصّوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ ہم نے ایک پُل کے نیچے جھانکا تو پانی میں ہمارا عکس نظر آرہا تھا۔

"مَیں کل صُبح ایک پرواز پہ روم جا رہی ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد واپسی ہوگی۔ آج سے سات روز بعد اگر تم اسی شہر میں ہوئے تو گُنگز کلپان کی آٹھویں منزل پر فلیٹ نمبر بائیس میں ایک لڑکی رات کے کھلنے پر تمہارا انتظار کرے گی۔" ماگریتا نے اپنے عکس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اگر مَیں سات روز بعد اسی شہر میں ہوا تو اُس لڑکی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" مَیں نے اپنے عکس پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

"روم پہنچتے ہی میں "ترلیوی فوارے" پر جاؤں گی اور اُس کے پانی میں سکّے ڈال کر دُعا کروں گی کہ . . . "

"نہ نہ نہ یہ غضب نہ کرنا، وہاں تو پہلے سے ہی ڈھیروں سکّے پڑے ہوں گے۔" مجھے وینس کی ربیکا یاد آگئی۔ مَیں نے ماگریتا کو سینٹرال سٹیشن پہ چھوڑا اور خود زمین دوز ریلوے پر سوار ہو کر واپس ہوسٹل آگیا۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے گذر گیا۔ میرا زیادہ تر وقت گُستاف اور برگیتا کے ہاں گذرا۔ اُن کا بیٹا ٹونی اب مجھ سے مانوس ہو چلا تھا۔ ریاض اور آذر سے مجھے اپنے دوستوں سے ملاتے اور پارٹیوں پر لے جاتے۔ فاروق اور حامد سے جب بھی مُلاقات ہوئی وہ مجھے "ریستوران بارزز" چلنے کا مشورہ دیتے۔ مُشتاق کے کمرے میں مشرقی موسیقی کے ریکارڈ سُنتے ہوتے شیشے کے مرتبانوں میں

تیرتی رنگ برنگی پالتو مچھلیاں بالکل مخل نہ ہوتیں۔

بالآخر سٹاک ہوم میں میرے قیام کا آخری دِن آ پہنچا۔ اُس روز ماگریتا کو روم گئے ہوئے ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ سرِشام میں بس پر سوار ہو کر لنگز کلپان پہنچ گیا۔ ایک خوشنما پہاڑی پر گھنے درختوں کے درمیان جدید عمارتوں کا ایک جھنڈ جو ایک ہفتہ قبل مجھے شہزادہ یوجین کے محل سے نظر آیا تھا۔ مَیں خودکار لفٹ سے آٹھویں منزل پر پہنچا تو ماگریتا فلیٹ سے باہر برآمدے میں کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ آج اُس کی مُسکراہٹ میں حُزن کا پہلو نمایاں تھا۔

"مَیں دوپہر سے بالکونی پر کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مَیں نے تمہیں نیچے فٹ پاتھ پر آتے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا تھا مگر تم نے میری جانب دیکھا ہی نہیں۔" وُہ سیاہ رنگ کے ایک دیدہ زیب لباس میں ملبوس تھی جس کا گلا گول شیشوں کے بلوچی کام سے مزیّن تھا۔

"تم اِس لباس میں ایک بلوچی خانہ بدوش لڑکی لگتی ہو۔"

"تمہیں پسند ہے نا؟" اُس نے مچل کر کہا۔ "مَیں نے آج ہی یہ فاروقی کی دکان سے خریدا ہے۔ خالص پاکستانی ہاں!"

ماگریتا کا مختصر فلیٹ نفاست پسندی اور جمالیاتی حِس کا حسین مُرقّع تھا۔ ہم بالکونی پر چلے گئے۔ سٹاک ہوم کی درجنوں نہریں، خوبصورت جزیرے اور بلند عمارتیں بے ترتیبی سے ہمارے قدموں تلے پھیلی ہوئی تھیں۔ پورے شہر پر ایک سُرمئی سا اندھیرا چھایا ہُوا تھا جس میں لاتعداد برقی روشنیاں جذب ہو رہی تھیں۔ ماگریتا نے میری آمد سے قبل ہی بالکونی پر کھانے کی میز سجا دی تھی۔ میز پر دماسک کا میز پوش بچھا ہُوا تھا جس کے عین وسط میں سُرخ پھول ایک سفید گلدان میں بڑی نفاست سے سجائے گئے تھے۔ گلدان کے دونوں طرف بلّور کا ایک ایک شمع دان رکھا تھا جن میں درجنوں موم بتیاں روشن تھیں۔ نیچے سمندر سے ایک سیلی خوشبو کے ساتھ ہوا پہلو بدلتی ہوئی آتی، شمعوں کی لَو تھرتھراتی اور اُن کا پرتَو ماگریتا کے بلوچی لباس کے گول شیشوں میں منعکس ہو کر جھلمل جھلمل کرنے لگتا۔ ہم دونوں چُپ چاپ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ تیز

ہوا کے ایک جھونکے نے چند شمعیں گُل کر دیں۔ مَیں نے اُسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا۔

"مَیں نے بچپن میں واشنگٹن ارونگ کی "الحمرا کی کہانیاں" پڑھی تھی۔ غرناطہ جا کر مجھے خط لکھنا کہ وہاں کونسا ایسا فسوں ہے جو لوگوں کو سب کچھ چھوڑ کر وہاں جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

مَیں نے ماگریتا کی طرف دیکھا اُس کا گول چہرہ، گول بلوریں شیشے اور درجنوں شمعوں کی لَو آپس میں مدغم ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ستارے تھے یا شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ میں فیصلہ نہ کر پایا۔

"مَیں تمہیں الحمرا کے ایوانوں میں بیٹھ کر خط لکھوں گا۔ تم یہاں اِس بالکونی پر بیٹھی بہتے پانی کی مدھم آواز اور فواروں کی سُریلی رُن مُن سُن لوگی۔"

ماگریتا مجھے ہوسٹل تک چھوڑنے آئی۔ سنجیدگی نے اُس کے چہرے کا تاثر یکسر بدل دیا تھا اور وُہ ایک مختلف انسان نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ کے بغیر ماگریتا نامکمل تھی۔

"اگر تم پسند کرو تو مَیں کل صبح تمہیں سٹاک ہوم سے چند میل دُور ناروے جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آؤں گی۔"

"تمہیں خدشہ ہے کہ مَیں کہیں پھر واپس نہ آجاؤں؟"

اُس نے میری بات کا جواب دیئے بغیر کار سٹارٹ کی اور شہر جانے والی سڑک پر مُڑ گئی۔

ماگریتا کی ننھی مُنّی بل کار کارل ستاد جاتی ہوئی شاہراہ پر بالکل بچّوں کا کھلونا لگ رہی تھی۔

"ہم سٹاک ہوم سے پچاس میل دُور تو آ گئے ہیں۔ اب تم واپس چلی جاؤ۔"

"بس تھوڑی دُور اور . . ." اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ کارل ستاد آیا تو میں زبردستی اُتر گیا۔

"اگر مَیں نے آج پرواز پر نہ جانا ہوتا تو مَیں ناروے کی سرحد تک تمہارے ساتھ جاتی۔" اُس نے کار کی چابی سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "یاد ہے جب ہم مِڈسمر نائٹ کے جشن پر گئے تھے

تو آرڈرے نے کہا تھا، "ماگریتا تم مستنصر کے ساتھ اپنے ہوائی مسافروں ایسا سلوک کر رہی ہو۔ مَیں نے تو اُسی شام اپنے آپ کو بدل لیا لیکن تم تو مُسافر ہی رہے نا؟"

ماگریتا کی کار سٹاک ہوم کی شاہراہ پر کچھ دیر نظر آتی رہی اور پھر کاروں اور دیوہیکل ٹرکوں کے ہجوم میں کھو گئی۔

"مَیں ہوا کے بغیر کشتی رانی کر سکتی ہُوں
مَیں چپّو کے بغیر ناؤ کھے سکتی ہُوں
لیکن ——
مَیں اپنے محبوب سے اشک بار ہوئے بغیر جُدا نہیں ہو سکتی۔"

پھولوں کے دیس میں

ناروے کا صدر مقام اُوسلو شمالی یورپ میں میرے سفر کی انتہا تھی۔ یہاں سے مجھے ایک مرتبہ پھر سویڈن، ڈنمارک اور جرمنی کے راستے ہالینڈ جانا تھا۔ چند روز کے قیام کے بعد ایک چمکتی ہوئی صُبح کو جب اُوسلو کے شاہی محل کے باہر محافظ دستوں کی ڈیوٹی تبدیل ہو رہی تھی۔ مَیں سویڈن کے دوسرے بڑے شہر گوٹنبرگ کے لیے روانہ ہوا۔ اُس روز شاید اکثر کاروں والے میری ہی تلاش میں سفر کر رہے تھے۔ چنانچہ پچھلے پہر تک گوٹنبرگ پہنچ گیا۔ جس علاقے سے گزر رہا وہاں اُن دنوں سٹرابیری پھل کا موسم تھا۔ ہر دس بیس میل کے فاصلے پر دہقانی لڑکیاں روایتی لباسوں میں ملبوس سٹرابیری کے سُرخ بیروں کی ٹوکریاں لیے سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ کار کھڑی کیجیے اور وہ دو کرونر کے عوض آپ کے سٹرابیری کی ایک ٹوکری دے دیں گی۔ جب بھی مجھے کوئی نئی لِفٹ مِلتی تو ڈرائیور میرے لیے ایک ٹوکری خرید لیتا۔ "تم نے شاید اِس سے پہلے سٹرابیری کا پھل نہیں کھایا۔ سویڈن کی خاص چیز ہے۔" اگرچہ پچھلے

تمام ڈرائیور مجھے کئی ٹوکریاں کھلا چکے تھے مگر میں اُن کا دل رکھنے کی خاطر پھل کھانے لگتا۔ گوٹنبرگ پہنچنے تک سویڈش مہمان نوازی میرے دانت کھٹے کر چکی تھی۔ گوٹنبرگ کے نواحی قصبے گنگ لاو سے باہر دریائے گوٹا کے کنارے ایک جنگل میں میرے سویڈش دوست راڈنی کا مکان تھا۔ راڈنی سے میری واقفیت لاہور میں ہوئی جہاں وہ سویڈش بچوں کے ایک سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ ہر شام راڈنی دریا کے کنارے سرکنڈوں سے بندھی ہوئی اپنی سپیڈ بوٹ کھولتا اور ہم دونوں قصبے کی چھوٹی چھوٹی نہروں کے راستے اس کے دوستوں سے ملنے چلے جاتے۔ رات گئے جب واپس لوٹتے تو دریائے گوٹا اور اس میں سے نکلنے والی نہروں کے کنارے جنگلی گھاس اور خودرو بیلیں دُھند سے اَٹی ہوتیں۔ کناروں سے چند گز کے فاصلے پر گھنا جنگل سویڈن کی نیلی شفق میں نہایا ہوتا۔ سپیڈ بوٹ نہروں کے کمان نما پُلوں کے نیچے سے گزرتی تو پل بھر کے لیے مکمل تاریکی چھا جاتی۔ دریا کی پُرسکون سطح کو چیرتی ہوئی سپیڈ بوٹ آگے بڑھتی تو یخ پانی کی پھوار ہمارے کپڑے بھگو جاتی اور لہریں کناروں پر اُگے ہوئے سرکنڈوں میں طلاطم برپا کر دیتیں۔ گھر قریب آتا تو خاموشی اور دُھند میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ دُھند ایک اُجلے بادل کی طرح دریا کی سطح پر بچھی ہوتی۔ میری آمد سے چار روز بعد راڈنی مجھے اپنی کار پر ہیلسنور جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آیا۔

ہیلسنور (ڈنمارک) کی کیمپنگ سمندر کے کنارے کرون برگ قلعے کے پہلو میں تھی۔ میں اپنا خیمہ نصب کر کے اِس قدیم شہر کی سیر کو نکل گیا۔ رات واپس آیا تو ساحل کے ساتھ کرون برگ قلعہ کی کائی زدہ دیواریں، تانبے کی چھت، گنبد اور مینار آسیب زدہ لگ رہے تھے۔ قلعے کی پوری عمارت دُھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں ایک خونیں ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ سلطنت کے لیے ایک قتل ہوا اور پھر مقتول بادشاہ کی رُوح ہر شام اِسی قلعہ کی دیوار پر نمودار ہوتی اور

اپنے بیٹے ہیملٹ کو انتقام پر اُبھارتی۔ ہیملٹ جو ڈنمارک کا شہزادہ تھا اور جسے شیکسپیئر نے لازوال کر دیا۔ بہر حال یہ سارا واقعہ ایک ادبی اختراع ہے۔ اصلی ہیملٹ شاید ہلسنور کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ جب فریڈرک دوم نے کرون برگ قلعہ تعمیر کروایا ہیملٹ اُس سے سات سو برس پیشتر مورس کے جزیرے میں دفن ہو چکا تھا۔ اُس کا نام آملتھ تھا۔ ایک قبائلی سردار کا اکلوتا بیٹا۔ سرداری کے لالچ میں آملتھ کے چچا نے اُس کے باپ کو قتل کر ڈالا۔ اِس گھناؤنے جرم میں اُس کی ماں بھی شامل تھی۔ اُنیس سالہ آملتھ سارا دن قلعہ کے آتش دان کی ٹھنڈی راکھ کو کریدتا رہتا اور ہر سوال کا جواب ایسے دیتا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ایک شب اُس نے اپنے چچا کے محافظ کو شراب پلا کر مدہوش کر دیا اور چچا کو قتل کر کے سردار بن بیٹھا۔ ۱۲۰۰ء میں ساکسو گراماٹیکس نامی ایک ڈینش نے اس واقعے کو کہانی کا رُوپ دیا۔ ۱۶۰۱ء میں لنڈن کے گلوب پلیئرز کرون برگ قلعہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے آئے۔ اِن میں ایک گمنام ایکٹر شیکسپیئر نام کا تھا۔ شیکسپیئر نے اس ڈینش کہانی کو ڈرامے کی صورت میں لکھا مگر جائے واقع مورس کے جزیرے سے ہلسنور کے کرون برگ قلعہ میں تبدیل کر دی۔ حقائق سے قطع نظر رومان پسندی اب بھی قلعہ کی دیواروں پر ہیملٹ کے باپ کی روح دیکھ لیتی ہے۔ بلکہ شہر والوں نے سیاحوں کی تسلی کے لیے یہاں ہیملٹ کی قبر بھی بنوا رکھی ہے

ہلسنور کے بعد میں ڈنمارک کے چھوٹے قصبوں اور ساحلی دیہاتوں سے ہوتا ہوا کوپن ہیگن پہنچ گیا۔ اگرچہ "ہچ ہائکنگ" بے حد دلچسپ ذریعۂ سفر ثابت ہوئی تھی مگر اب میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ تین ماہ کے قلیل عرصے میں مجھے ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس کی سیاحت کے بعد پورا ہسپانیہ بھی دیکھنا تھا۔ لہٰذا میں نے ریل اور بس کا "شریفانہ" سفر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بذریعہ ریل کوپن ہیگن سے ہمبرگ (جرمنی) جاتے ہوئے وارڈن برگ کا طویل ترین ریلوے پُل دیکھا۔ ہمبرگ سے سیدھا

فرینکفورٹ آگیاجہاں اب پھر بارش ہو رہی تھی۔

جی ہاں فرینکفورٹ میں اب پھر بارش ہو رہی تھی۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیوں کہ میں اب اِس شہر کی گیلی اور کہر آلود عمارتیں دیکھے بغیر ہالینڈ جا رہا تھا جہاں وِیرن کے قصبے میں میرا ایک پاکستانی دوست میری آمد کا منتظر تھا۔ حنیف لاہور میں سائیکلیں بنانے والے ایک کارخانے میں انجنیئر تھا اور اِن دنوں ہالینڈ میں سائیکلوں کی صنعت کا جائزہ لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اہلِ ہالینڈ سائیکلوں کے اتنے شیدائی ہیں کہ اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سائیکل پر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے نقشے پر وِیرن کا تعین کیا۔ پہلے آرنہم جانا ہوگا۔ بارہ بجے ہماری گاڑی فرینکفورٹ کے گندے اور پُر ہجوم سٹیشن سے نکلی۔ تھوڑی دُور بعد جرمنی کا مشہور دریا رائن ساتھ ہو لیا۔ دریا کے چوڑے پاٹ میں بادبانی کشتیاں۔ سامان بردار کشتیاں اور جہاز ہر سُو بکھرے پڑے تھے۔ دوسرے کنارے پر سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں ننھے مُنّے گاؤں تھے۔ چوٹیوں پر خوبصورت پریوں کے قلعے ایک لمحہ کے لیے گاڑی کی کھڑکی سے نظر آتے اور پھر طلسماتی طور پر غائب ہو جاتے۔ جرمنی کے صدر مقام بُون سے گزر کر ہم کولون پہنچے جہاں رائن کے کنارے گوتھک طرزِ تعمیر کا کلیسا یورپ بھر میں بے مثال ہے۔ کولون سے ہالینڈ جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر میں شام کے ساڑھے سات بجے آرنہم پہنچ گیا اور وہاں سے ایک مقامی گاڑی کے ذریعے وِیرن تک آگیا۔

وِیرن ایک بہت ہی معمولی قسم کا قصبہ تھا جو بہ مشکل ایک درجن دکانوں اور چند سو رہائشی مکانوں پر مشتمل ہوگا۔ میں نے پھولوں کی ایک دکان سے حنیف کا پتہ دریافت کیا اور قصبے کی اکلوتی سڑک کے بیچوں بیچ چلنا شروع کر دیا۔

سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ چند بچے سڑک کے درمیان چاک سے کھینچی ہوئی لکیروں پر "کیڑی کاڑا" قسم کا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی سائیکل سوار بھی آنکلتا۔ ہالینڈ کے لوگ انگریزوں کی مانند اپنے گھر کو قلعہ بنا کر نہیں رکھتے بلکہ سرے سے چار دیواری بنانے کا رواج ہی نہیں۔ سرِ شام لوگ آرام کرسیاں باغیچے میں ڈال کر پڑوسیوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہیں اور سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ باغیچوں میں گڑیوں اور چکیوں کے ماڈل سجے ہوتے ہیں۔ میں اِن باغیچوں کے سامنے گزرتا تو اکثر لوگ مسکرا کر ہاتھ ہلاتے۔ وہ مجھے اور میرے پیچھے گھسٹتے ہوئے سوٹ کیس کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ چند بچے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور اُن میں سے ایک نے راہبر کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔ قصبے کی آخری حد سے چند سو گز پرے ریلوے لائن کے ساتھ ایک پرانی طرز کا فارم نما گھر تھا جس کے باغیچے میں حنیف آرام کرسی پر دراز کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنی ہینڈل بار نما مونچھوں کو ایک بل دیا اور کرسی سے اُٹھ کر بڑی بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری آمد سے وہ قطعاً خوش نہیں ہوا۔

"تمہیں اِن فتنوں نے تنگ تو نہیں کیا؟" اُس نے اکتاہٹ سے بھرپور لہجے میں میرے گرد گھیرا ڈالے ہوئے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ "میں نے تو اِن کے روزمرہ کے تعاقب سے بچنے کے لیے شام کو گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ جہاں جاتا ہوں پیچھے ہو جاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ اِن کے لیے ایک پاکستانی عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔" اُس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور مکان کے اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں ایک ڈچ مرد اور عورت آرام دہ صوفوں میں دھنسے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ "مسٹر اور مسز کیپ جن کی فیکٹری میں مَیں تربیت حاصل کر رہا ہوں۔" حنیف نے تعارف

کروا دیا۔

"تم ضرور مستنصر ہو گے۔" کپ کے وجیہہ چہرے پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "حنیف بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"واقعی!" میں نے حنیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ایک کونے میں میری موجودگی سے بے خبر اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجانے میں مشغول تھا۔

حنیف کی شخصیت صرف ہالینڈ میں ہی نہیں بلکہ لاہور میں بھی ایک عجوبے سے کم نہ تھی۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں کار کی موجودگی میں بھی سائیکل پر فیکٹری جاتا۔ کسی بڑی دعوت پر مدعو ہوتا تو اپنے درجنوں سوٹ چھوڑ کر کسی پرانی سوئیٹر کے ساتھ کارڈرائے کی پتلون اور پاؤں میں چپل پہن کر وہاں پہنچ جاتا۔ کسی موضوع پر بحث چھڑتی تو ہمیشہ کہتا کہ اگر ایسا ہے تو کیا خرابی ہے اور اگر ویسا ہو جاتا تو کون سی قیامت برپا ہو جاتی۔ اپنی سنکی طبیعت کی وجہ سے اکثر لوگوں میں انتہائی غیر مقبول تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس میں منافقت اور تصنع نام کو نہ تھا۔ حنیف کا باطن خلوص اور پیار کا ایک ایسا برفانی تودہ تھا جو دوستی کے جذبے کی ہلکی سی آنچ سے پگھل کر ابلنے لگتا۔

لکڑی کی تنگ سیڑھیاں طے کر کے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا جہاں اس نے میرے لیے ایک علیحدہ پلنگ ڈلوا لیا تھا۔

"تمہارے پرجوش استقبال نے میری روح کو گرما دیا ہے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے جل کر کہا۔ حنیف کی دھیمی طبیعت کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود اس کی سرد مہری میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے خود ہی تو مجھے سٹاک ہوم میں لکھا تھا کہ ایمسٹرڈیم جانے سے قبل ڈیرن میں میرے پاس ضرور رکنا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگوں گا؟" اس کے باوقار چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ برف کا تودہ پگھل رہا تھا۔ "تم آ گئے۔ بس ٹھیک ہے۔ کھانے کا

وقت ہوا چاہتا ہے تم جلدی سے کپڑے بدل کر نیچے آجاؤ۔"

اُس شب ہم نزدیکی شہر ایپل ڈارن میں واقع ایک مشہور رلیستوران "میوزیم ٹیورن" میں گئے۔ جیساکہ نام سے ظاہر ہے "میوزیم ٹیورن" رلیستوران کم اور عجائب گھر زیادہ تھا۔ قدیم وضع کے چھوٹے سے ہال میں کھانے کی میزوں پر اور دیواروں پر بے شمار شیشے کے مرتبان دھرے تھے جن میں مختلف انواع کے جانوروں کے لاشے کسی آبی محلول میں تیر رہے تھے۔ مگرمچھ، گرگٹ، کچھوے، گلہریاں اور جانے کیا کیا، مرتبانوں کے اوپر حنوط شدہ پرندے قطار اندر قطار اپنے بے جان پر پھیلائے ماحول کو اور بھی وحشت ناک بنا رہے تھے۔ گول گول آنکھوں والے اُلو، کریہہ النظر چمگادڑیں۔ لمبی چونچوں والے گدھ۔

"مجھے یہاں آکر بڑا سکون ملتا ہے۔" حنیف نے سنجیدگی سے کہا "دنیا کی بے ثباتی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کل کلاں مر جاؤں تو مجھے بھی شیشے کے مرتبان میں ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تم کھاؤ گے کیا؟"

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔" ہماری میز پر رکھے مرتبان میں ایک کریہہ الشکل چھپکلی اوندھی تیر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ فراعنہ کے مصر میں کسی بڑی دعوت میں کھانے سے قبل مہمان کو دنیا کی اِسی بے ثباتی کا احساس دلانے کے لیے اُس کے سامنے ایک مَمی پیش کی جاتی۔ میرا خیال ہے کہ کھانے کے دَوران میزبان ممی اُٹھا کر واپس تابوت میں رکھ آتا ہوگا تاکہ آئندہ دعوت پر کام آئے مگر یہاں تو سینکڑوں جانوروں کی ممیاں پورے ماحول کا ایک لازمی جزو تھیں۔ حنیف کے اصرار پر مَیں نے مچھلی منگالی اور بہ مشکل چند ٹکڑے نگلے۔ وہ کم بخت چھپکلی اب اوندھی تیرنے کی بجائے سیدھی ہو گئی تھی۔

ہم رات گئے واپس لوٹے۔ مَیں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ مکان کے ساتھ ہی ریلوے کا پھاٹک تھا۔ گاڑی کی آمد سے چند منٹ قبل پھاٹک پر

خطرے کی تیز گھنٹی زور زور سے بجنے لگتی۔ گاڑی گزرتی تو دھمک کی وجہ سے پورے مکان پر کپکپی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یہ سلسلہ تمام رات جاری رہا اور میں بالکل نہ سو سکا۔

"آج ہم تمہیں اپنے ملک کا سب سے خوبصورت گاؤں اور سب سے عجیب و غریب قصبہ دکھائیں گے۔" دوسری صبح ناشتے پر کپ نے مجھے ہالینڈ کے مشہور پنیر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیتے ہوئے کہا۔

"بہت ہی عجیب و غریب" حنیف نے جو سیاہ کافی پی رہا تھا مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ آج بہتر موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

"تم لوگ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں بوڑھوں کو ناشتہ دے آؤں۔" کپ اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ حنیف نے بتایا کہ کپ عادات و اطوار کے لحاظ سے خالصتاً مشرقی ہے۔ اگرچہ مقامی رواج کے مطابق اُس کے عمر رسیدہ والدین کو کسی "بوڑھوں کے گھر" میں پڑا ہونا چاہیے مگر اس نے انہیں اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور ان کا بے حد خیال رکھتا ہے۔ فیکٹری میں تربیت کے دوران دوستی ہو گئی تو اپنے گھر بُلا لیا اور کرایہ بھی وصول نہیں کرتا۔ ہالینڈ کی روایتی کنجوسی سے شدید نفرت کرتا ہے اور تو اور ہر اتوار کو اپنی سیکرٹری کے گھر جا کر اُس کی کار صاف کرتا ہے

ہم کپ کی سُرخ کار پر قصبے سے باہر نکلے تو سامنے ایک بارات آ رہی تھی۔ دولہا اور دلہن شادی کے روایتی لباس میں ملبوس ایک سنہری بگھی پر سوار تھے جسے دو مُشکی رنگ کے چاک و چوبند گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے اور بھی درجنوں بگھیاں تھیں جن پر باراتی سوار تھے۔ اِس قافلے کے دونوں طرف گھڑ سوار ہاتھوں میں بِگل لیے بارات کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔" دُولہا میری فیکٹری میں سائیکلوں کے ہینڈل بار بناتا ہے۔" کپ نے بتایا۔

"فیکٹری میں مزدور ہے تو شادی کا یہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کیسا!" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"اِس سارے شو کا خرچہ صرف دو ہزار گلڈر مقرر ہے۔ بارات کے ماہرین کی دکان سے بگھیاں، گھوڑے اور بگل نواز ایک گھنٹہ کے لیے اِسی کرائے پر اُٹھتے ہیں۔"

آج اتوار تھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ بے شمار سائیکل سوار قریبی دیہات اور نہروں کے کنارے پکنک منانے جا رہے تھے ایک سائیکل کی ٹوکری میں ایک ننھا منا بچہ بڑے مزے سے لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ سڑک کے ساتھ کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی نہروں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ نہروں کے کنارے دیوزاد تتلیوں کی مانند اپنے چوڑے پر پھیلائے درجنوں ہوائی چکیاں ساکن کھڑی تھیں جیسے ذرا سی آہٹ سے جھٹ فضائے بسیط میں پرواز کر جائیں گی۔ ہالینڈ کی ہوائی چکی واقعی کسی زمانے میں دُھن کی پوری اور کام کی پکی ہوا کرتی تھی۔ پچیس ہزار مربع میل کے کل رقبے میں سے ہالینڈ کا سوا چار ہزار مربع میل زیرِ آب ہے۔ تقریباً پورا ملک سطح سمندر سے دس فٹ نیچے ہے۔ دُنیا کی اور کوئی قوم اہلِ ہالینڈ کے اِس بظاہر ناممکن کارنامے کی ہمسری نہیں کر سکتی کہ انہوں نے اپنا ملک خود اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا۔ پورے ہالینڈ کا آدھا رقبہ سمندر کو خشک کر کے حاصل کیا گیا ہے۔ آج سے ایک ہزار سال قبل ہالینڈ یعنی "نشیبی علاقے" کے باشندوں نے اپنے دلدل اور پانی سے گھرے ہوئے مکانوں اور زمینوں کو وُسعت دینے کا خواب دیکھا۔ اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے بند باندھے، نہریں کھودیں اور اپنے ہاتھوں سے پانی کا نکاس کیا۔ زمانہ بدلا تو انسانی ذہن کی اختراع نے ہوائی چکیوں کو جنم دیا جو زمین کو خشک کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔ بجلی کی ایجاد اور جدید مشینوں نے ہوائی چکیوں کی افادیت کو ختم کر دیا اور نکاس کے لیے واٹر پمپ استعمال ہونے لگے۔ اب یہی ہوائی چکیاں جن کی بدولت ہالینڈ کا ملک نقشے پر اُبھرا اپنی افادیت کی مدت پوری کر کے

پنشن یافتہ بزرگوں کی مانند آرام کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ہمارے سامنے سڑک کے کنارے ایک ہوائی چکی پر پھیلائے کھڑی تھی۔ ہم کار سے اُتر کر اندر چلے گئے۔ پہلی منزل پر ٹورسٹ آفس تھا۔ ایک بل دار آہنی سیڑھی آخری منزل تک جا رہی تھی۔ ہوائی چکی کا نظامِ کار خاصا پیچیدہ معلوم ہوتا تھا۔ لوہے کی بڑی بڑی گراریوں اور بھاری زنجیروں کا ایک جنگل۔ بوڑھے رکھوالے نے ہمیں بتایا کہ اس ہوائی چکی سے اب بھی آٹا پیسنے کا کام لیا جاتا ہے۔

تھوڑی دُور جانے کے بعد سڑک کے دائیں کنارے ایک بورڈ نظر آیا "گیتھورن بائیں طرف" میں نے بائیں جانب دیکھا وہاں کسی قصبے کی بجائے ایک پُرسکون نہر بہہ رہی تھی۔ ہم کار سے اُتر کر نہر کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی کے مالک ڈچ لڑکے نے کشتی کے پچھلے حصے پر نصب انجن کے پٹے کو زور سے کھینچا۔ انجن سے پھٹ پھٹ کی متواتر آواز آنے لگی اور ہم نہایت سُست روی سے نہر کی پُرسکون سطح پر تیرنے لگے۔ کنارے پر چند قہوہ خانوں اور ہرے بھرے کھیتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک نکتے پر نہر نوّے درجے کا زاویہ بناتے ہوئے دائیں ہاتھ مڑ گئی تھی۔ ڈچ لڑکے نے موڑ پر کشتی کا انجن بند کر دیا اور کمر کے ساتھ بندھے ہوئے سینگ نما بگل کو ہاتھ میں لے کر پُوری قوّت سے بجایا تاکہ موڑ کے دوسری جانب سے آنے والی کشتیوں کو ہماری آمد کی خبر ہو جائے اور اس طرح تصادم نہ ہونے پائے۔ جب دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو لڑکے نے انجن دوبارہ سٹارٹ کر دیا۔

"مستنصر اپنا کیمرہ تیار رکھو۔" کپ نے میرا کندھا دبا کر کہا "تم ہالینڈ کا حسین ترین قصبہ دیکھنے والے ہو۔"

مَیں نے چمڑے کے کیس میں سے اپنا مُووی کیمرہ نکالا۔ ایک ہاتھ سے ہینڈل کو مضبوطی سے تھاما اور دوسرے سے فوکس دُرست کر کے آنکھ ویوفائنڈر

(View Finder) پر جما دی۔ کشتی دھیرے سے دائیں طرف مڑی تو کیمرے کی آنکھ میں سبز اور نیلے رنگوں کا ایک سمندر اُبل پڑا۔ منظر پورے طور پر واضح نہ تھا۔ مَیں نے لینز گھما کر فوکس پھر درست کیا۔ میں کیمرے کی آنکھ سے گیتھورن کا خوبصورت قصبہ دیکھ رہا تھا۔ قصبے کے بیچوں بیچ بہنے والی پُرسکون نہر کے کنارے کسانوں کے قدیم وضع کے مکان درختوں اور خودرَو بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سورج کی تیز کرنیں گھنے درختوں میں سے چھَن چھَن کر پانی کی سطح سے ٹکرائیں اور پھر کیمرے کے لینز سے ٹکرا کر شوخ رنگوں میں بکھر جاتیں۔ سفید بطخوں کے ایک غول نے کشتی کے انجن کی آواز سُن کر پَر پھیلائے اور تیزی سے تیر کر دوسرے کنارے پر چلی گئیں۔ لمحہ بھر کے لیے نہر کی پُرسکون سطح پر ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا۔ پانی میں منعکس خوبصورت گھر، بیلوں کے جھنڈ اور درخت تھوڑی دیر کے لیے گھُل مِل سے گئے اور پھر اِس عکسی تصویر کے خدوخال دوبارہ اُبھر آئے۔ میری اُنگلی متواتر کیمرے کے بٹن پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ فلم تیزی سے سرک رہی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں کو لکڑی کے درجنوں کمان نما پُل آپس میں ملا رہے تھے۔ ایک پُل آیا تو اُوپر کھڑے دیہاتی بچوں نے ہم پر پھولوں کی پتیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہمارے گرد مکمل سکوت تھا جسے صرف انجن کی پھٹ پھٹ کی بے ہنگم آواز توڑ رہی تھی۔ جب کبھی کشتی چلانے والا لڑکا اپنا سینگ نما بِگل بجاتا تو کناروں کے ساتھ ساتھ تیرنے والی بطخیں بدک کر کسی گھر سے سبز کُنج میں گھُس جاتیں۔

”ایک نظر اِدھر بھی۔“ کِپ نے سرگوشی کی۔

مَیں نے کیمرے کی آنکھ سے نظر ہٹا کر بائیں جانب دیکھا۔ ایک ننھی مُنّی ندی بڑی نہر سے جُدا ہو کر چند سو گز کے فاصلے پر واقع قصبے کے واحد کلیسا تک چلی گئی تھی۔ ہر گھر کے ساتھ ذاتی کشتیاں کھڑی کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے گھاٹ بنے ہوئے تھے

کیپ نے بتایا کہ یہاں رہنے والے کسان اپنے ڈھور ڈنگر سمیت اِنہی کشتیوں پر اپنے کھیتوں کو جاتے ہیں۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی اِنہی کشتیوں پر سجا کر قصبے میں فروخت کی جاتی ہیں۔ دائیں جانب سیاہ لکڑی کی ڈھلوان چھت کے ایک قدیم مکان کے باغیچے میں ایک بوڑھا باریش مصوّر اپنے سامنے کینوس رکھے تصویر کشی میں مگن تھا۔ ہماری کشتی پاس سے گزری تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے تصویر اُٹھا کر رُخ ہماری طرف کر دیا۔ تصویر میں گہرے سبز اور چمکتے نیلے رنگوں کی بھرمار تھی۔ خودرَو گھاس۔ بیلوں اور گھنے درختوں کا شوخ سبزہ۔ شفّاف آسمان اور پانی کی نیلگوں لہریں۔ کیپ نے ہاتھ ہلا کر تصویر کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور ہماری کشتی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دُور جا کر نہر کا پاٹ قدرے چوڑا ہو گیا اور ہم بائیں ہاتھ مُڑ کر قصبے کے پچھواڑے سے ہو کر واپس اُسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ "گیتھورن" یا "پانی کا سینگ" واقعی ہالینڈ کا خوبصورت ترین قصبہ ثابت ہوا۔ "خوبصورت ترین کے بعد اب سب سے عجیب و غریب کی باری آتی ہے۔" میں نے کشتی سے باہر قدم رکھتے ہوئے کیپ سے کہا۔

"ابھی نہیں" کیپ نے اُنگلی اُٹھا کر کہا "پہلے دوپہر کا کھانا کھا لیا جائے۔" ہم نہر کے کنارے ایک ریستوران میں چلے گئے۔

ہالینڈ کے ہر باشندے کو جتنا قلق انڈونیشیا کے چھُٹ جانے کا ہے اُتنا شاید دوسری جنگِ عظیم کے دَوران جرمنوں کے ہاتھوں پٹ جانے کا بھی نہیں۔ انڈونیشیا کا ذکر چھِڑ جائے تو ڈچ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بڑی دردناک قسم کی آہیں بھرنا شروع کر دیتے ہیں اور مُنہ پھُلا کر یوں بیٹھ جاتے ہیں جیسے کسی ننّھے بچّے کا رنگین غبارہ ہاتھ سے چھُوٹ گیا ہو۔ میں نے چاول۔ پاپڑ اور مُرغ کے قتلوں پر مشتمل ایک انڈونیشی کھانے کا آرڈر دیا تو کیپ پر بھی اِسی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حنیف نے بڑی مشکل سے منایا۔ ہالینڈ میں انڈونیشی کھانے روزمرہ کی خوراک

کا ایک لازمی جُزبن چکے ہیں یہاں تک کہ خالص یورپی کھانوں میں بھی کشمش اور
انناس کا استعمال ہوتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کار میپل جانے والی شاہراہ
پر موڑ دی۔ اب ہم "سٹاپ ہارس" کا قصبہ دیکھنے جا رہے تھے۔

سٹاپ ہارس کے چند سو مکانوں پر مشتمل قصبے کی تمام سڑکیں اور گلیاں مکمل
طور پر سنسان پڑی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم بھوتوں کے قصبے میں آ گئے
ہوں۔ قصبے کے شروع میں ایک بورڈ آویزاں تھا۔

"یہاں فوٹوگرافی قطعی طور پر ممنوع ہے۔ خلاف ورزی
کرنے والے نتائج کے خود ذمہ دار ہوں گے۔"

مَیں نے حیرت سے کِپ کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھالے
دوسرے سے کار کے شیشے اُوپر چڑھا رہا تھا۔ "مَیں نے تمہیں ہالینڈ کا سب سے
عجیب و غریب قصبہ دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔" اُس کے لہجے میں سنجیدگی تھی مکانوں
کی گھاس پھونس کی ڈھلوان چھتوں کے اُوپر لکڑی کی چمنیاں تھیں۔ ہر دروازے
پر مکینوں کا مکمل شجرۂ نسب نقش تھا۔ گھروں کے باغیچے بھی بالکل ویران پڑے تھے
سٹاپ ہارس کے مکین ازمنۂ وُسطےٰ کے ایک ایسے مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں
جس نے صدیوں سے اپنے عجیب و غریب رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقے
نہیں بدلے۔ جدید روشنی کو سُم قاتل سمجھتے ہیں اور اِس چھوٹے سے جزیرے میں
اپنی روایات کو سینے سے لگائے اُسی راہ پر گامزن ہیں جس کا تعین اُن کے آباؤاجداد
نے زمانۂ قدیم میں کیا تھا۔ اتوار کے روز کسی قسم کا کام کرنا گناہِ کبیرا سمجھتے ہیں۔
یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء کے عظیم سیلاب میں انہوں نے اتوار کے روز ٹوٹے ہوئے
بند کی مرمت سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے آج سٹاپ ہارس کے کوچہ و بازار
ویران پڑے تھے۔ آج اتوار تھا۔ اِس قصبے کا اپنا علیحدہ کلیسا ہے اور وہاں کے

پادری کا ہر لفظ اِن کے لیے خدائی احکام کا درجہ رکھتا ہے۔ سگرٹ اور شراب کے قریب نہیں پھٹکتے۔ لڑکے اور لڑکیوں کی شادیاں گاؤں کے مکین آپس میں ہی کرتے ہیں۔ اگر کوئی باہر کا لڑکا مقامی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے تو کہا جاتا ہے کہ قصبے کے لوگ اُسے پکڑ کر دہکتے ہوتے تانبے کے سکوں سے داغ دیتے ہیں۔ شادی کی رسم بے حد عجیب و غریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکی جوان ہونے پر اپنے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رکھتی ہے۔ اس کا محبوب بظاہر چوری چھپے رات کو کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آجاتا ہے اور شب بسری کے بعد صبح سویرے اُسی راستے واپس چلا جاتا ہے۔ اگر معینہ مدت کے بعد لڑکی کا پاؤں بھاری ہو جائے تو والدین دونوں کی شادی کر دیتے ہیں۔ ورنہ لڑکی کے لیے عشق کے امتحان اور بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ صرف روایت ہے اور چونکہ شاپ ہارس کے باشندے اپنے فرقے کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو کرنے پر تیار نہیں ہوتے اس لیے اِس روایت کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔

کِپ نے کار ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ یہاں بھی مکمل خاموشی تھی۔

"توجہ مبذول کیے بغیر مکان کے باغیچے میں دیکھو۔" حنیف نے سرگوشی کی۔

باغیچے میں ایک ننھی منی لڑکی شاپ ہارس کے روایتی لباس میں ملبوس ایک سیاہ پوش گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ لڑکی نے لمبے سیاہ چُغے کے ساتھ اُسی رنگ کی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ کپ نے کار کھڑی کر دی۔ میں نے آہستہ سے کیمرہ اٹھا کر رُخ گڑیا کی جانب پھیر دیا۔ ابھی شاید ایک فٹ فلم بھی نہ بنی ہوگی کہ مکان کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکلی جس نے شاید کھڑکی سے ہماری کار اور کیمرے کو دیکھ لیا تھا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے ہماری جانب دیکھا اور گڑیا کو گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ کپ نے فوراً کار سٹارٹ کر دی اور ہم واپس بڑی سڑک پر آگئے۔ میں ایک مشّاق شکاری کی مانند کیمرے کو بندوق کی طرح ہاتھ میں تھامے فلم بنانے کے لیے "شکار" کی تلاش میں تھا۔

اس مرتبہ قسمت نے یاوری کی۔ ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر سٹاپ ہارس کے مکینوں کا ایک جوڑا بڑے آرام سے سائیکلوں پر جارہا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے تصویریں کھینچنے لگا۔ جوڑے نے اپنے فرقے کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ عورت نے کالے چُغے کے علاوہ سر پر لیس (LACE) سے آراستہ ایک تکونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس کی وضع امریکہ کی دہشت پسند تنظیم کلو کلکس کلان (K.K.K) کی ٹوپیوں ایسی تھی۔ ہم بالکل آہستہ رفتار سے اُن کے پاس سے گزرے تو مَیں نے کیمرے کا رُخ ان کی طرف موڑ دیا۔ ایک دَم وہ دونوں سائیکلوں سے اُتر کھڑے ہوئے اور سڑک سے پتھر اٹھا اٹھا کر ہماری کار پر برسانے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ ایک پتھر کار کے شیشے پر آلگا اور مَیں نے کیمرہ نیچے کر لیا۔ کپ نے فوراً کار کی رفتار تیز کر دی اور ہم سٹاپ ہارس کے قصبے سے باہر نکل آئے۔ واپس ڈیرن پہنچنے تک تمام لوگ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ دراصل ہم سب بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ اتوار کے مقدس دن اُن کی فلم بنا کر مَیں نے انہیں اپنا ازلی دشمن بنا لیا ہے اور اب چاہے میں کہیں بھی چلا جاؤں سٹاپ ہارس کے مکین ہاتھوں میں دہکتی سلاخیں لیے مجھے آلیں گے۔

اُس شب ہم نے کھانا گھر پر ہی کھایا کیونکہ ٹیلی ویژن پر ایک بہت ہی خصوصی پروگرام دکھایا جانا تھا۔ آج خلائی جہاز اپالو گیارہ چاند پہ اُتر رہا تھا۔ علی الصبح نیل آمسٹرانگ ایک آؤٹ آف فوکس بھوت کی طرح چاند پر اُترا۔ "انسان کا ایک قدم مگر انسانیت کے لیے ایک عظیم جَست" چاند پر انسان کے اوّلین الفاظ۔ سٹاپ ہارس کا قصبہ ایک قدم اُٹھا کر ہی رُک گیا تھا اور دنیا ایک عظیم جست لگا چکی تھی۔ مجھے اس سائیکل سوار جوڑے کا خیال آگیا جنہوں نے صرف تصویر اُتارنے کے جرم میں ہمیں پتھر مارے تھے۔ شاید وہ بھی اِس وقت ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں گے۔ ازمنہ وسطےٰ

کی ذہنیت کا انسان چاند کے انسان کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ شاید وہ اِس وقت نیل آمسٹرانگ کو کوس رہے ہوں۔ اُس نے آج چاند پر قدم رکھنے کی جرأت کیونکر کی؟ آج تو اتوار تھا۔

اگلی صبح حنیف اور کِپ اپنے کام پر چلے گئے اور مَیں ناشتے کے بعد کِپ کی پُرانی سائیکل لے کر قصبے کی سیر کو نکل گیا۔ ہالینڈ کا ملک ہموار ہونے کی وجہ سے سائیکل سواری کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ ہر شاہراہ کے پہلو میں سائیکل سواروں کے لیے علیحدہ راستے بنے ہوئے ہیں۔ میں تمام صبح قصبے سے ملحقہ کھیتوں اور نہروں کے کنارے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر گھر لوٹا تو حنیف کام سے واپس آچکا تھا اور مکان کے پچھواڑے میں آرام کرسی پر لیٹا دھوپ سے بچاؤ کے لیے چہرے پر اخبار پھیلائے اونگھ رہا تھا۔ میں بھی اِس شاندار مشغلے میں شامل ہوگیا۔ شام کو کِپ بھی آگیا اور ہم کار پر گھومنے چلے گئے۔ اگلے چند روز یہی سلسلہ جاری رہا۔ صبح سائیکل پر آوارہ گردی۔ پچھلے پہر حنیف کی رفاقت میں اونگھنا اور پھر شام کو کِپ کے ساتھ کسی نزدیکی شہر یا قصبے کی سیر۔ اِس سے پہلے کہ یہ سُست رَو معمول مجھے مکمل طور پر کاہل بنا دیتا میں نے دِیرن سے ہالینڈ کے دِل ایمسٹرڈیم جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حنیف کو روانگی کے بارے میں بتایا تو اُس نے اپنی روایتی قنوطیت کا مظاہرہ کیا۔ "لندن آج کل رنگ و نسل کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ پیرس والے تو ویسے ہی چور ہیں اور ہسپانیہ؟ بھلا دو چار بھلے مانس بھینسوں کو قتل ہوتے دیکھنے کے لیے اتنی دُور جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ میری مانو تو یہیں دِیرن میں پڑے رہو۔ ستمبر میں اکٹھے ہی پاکستان چلیں گے۔"

کِپ کا رویہ حقیقت پسندانہ تھا۔ "میں کل فیکٹری سے چھٹی کر لوں گا۔ پہلے

تمہیں ہالینڈ کا سب سے بڑا بند "زوڈرسی ڈائک" یا "ساؤتھ بیبی ڈیم" دکھائیں گے
اور پھر واپسی پر ایمسٹرڈیم میں اتار دیں گے۔"

دوسری صبح سورج طلوع ہونے سے قبل ہی ہم شمالی سمندر کے درمیان تعمیر کردہ عظیم بند کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم آلز میر سے گزرے جو ہالینڈ میں پھولوں کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ "بلومین سینٹرم" بقول کپ۔ میں نے ٹیولپ کے پھولوں کے کھیت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو معلوم ہوا کہ ان کا موسم مئی میں ختم ہو گیا تھا۔ ہوائی چکیاں اور ٹیولپ کے پھول ہالینڈ کا امتیازی نشان بن چکے ہیں۔ ٹیولپ کا پھول بیج سے نہیں بلکہ ایک پیاز نما گانٹھ کو زمین میں دبا کر اگایا جاتا ہے۔ ٹیولپ در اصل ترکی کا پھول ہے اور اس کے معنی بھی "ترکی قبا" کے ہیں۔ اس کی گھٹی ہوئی چوڑی پتیوں پر فی الواقع ایک مشرقی پگڑی کا گمان ہوتا ہے۔ سولہویں صدی میں آسٹریا کے ایک سفیر نے ٹیولپ کی گانٹھیں ترکی سے لا کر یورپ میں متعارف کرائیں۔ ہالینڈ میں اس کا فروغ ایک ماہر نباتات کالسیس کے ہاتھوں ہوا۔ ٹیولپ کے شوخ رنگوں اور بناوٹ نے اہلِ ہالینڈ کے دل موہ لیے۔ ماہرین نے نت نئے رنگوں اور بناوٹوں کے ٹیولپ اگانے شروع کیے تو پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ اسی دور میں نئی قسم کے ٹیولپ کی ایک گانٹھ کی قیمت دو ہزار ڈالر تک ادا کی گئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں لوگوں نے بھوک سے مجبور ہو کر ان گانٹھوں سے پیٹ پالا اور ٹیولپ کی بے شمار نادر اقسام نذرِ شکم ہو گئیں۔ اب ہالینڈ میں پھول صرف خوبصورتی اور شاعری کی علامت نہیں رہے بلکہ ایک منافع بخش تجارت بن گئے ہیں۔ ایمسٹرڈیم کے شپول ہوائی اڈے سے ہر سال کروڑوں روپے کے پھولوں کے بیج، ٹیولپ کی گانٹھیں، گلاب کے پودے اور تازہ چنے ہوئے پھول دنیا کے دوسرے ملکوں کو برآمد کیے جاتے

ہیں۔ آرلزمیر میں ہم نے کئی "شیشے کے گھر" دیکھے جن کے اندر درجۂ حرارت حسبِ ضرورت کرکے ہر موسم میں پھول اگائے جاتے ہیں۔ آرلزمیر کا پنیری یا گلِ راحت بھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کپ نے ہمیں پھولوں کے ایک تاجر سے ملایا جو روزانہ تازہ پھولوں کے ٹوکرے بذریعہ ہوائی جہاز شاہِ ایران کو بھیجتا ہے۔

آرلزمیر سے ہم ہارلم پہنچے جو پھولوں کی تجارت کا ایک اور بڑا مرکز ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے الکمار کے شہر میں کھایا جو اپنے پنیر کی نسبت مشہور ہے۔ حنیف کی رگِ شاعری پھڑکی اور فی البدیہہ فرمایا۔

لو وہ چودھویں کا چاند اُبھرا
جیسے الکمار کے زرد پنیر کا لذیذ ٹکڑا

مَیں نے وزن کے بارے میں اعتراض کیا تو کہنے لگا۔ "وزن سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پنیر مزیدار ہونا چاہیئے۔"

اب ہم جس سڑک پر جا رہے تھے اُس کی ایک جانب زوڈرزی کی عظیم جھیل ٹھاٹھیں مار رہی تھی اور دوسری طرف نکاسئ آب سے حاصل شدہ زمینوں پر جدید قصبے اور لہلہاتے کھیت تھے۔ پچھلے پہر ہم زوڈرزی کے ڈائنک یا بند پر پہنچ گئے۔ ایک عظیم بند بپھرے ہوئے سمندر کے بیچوں بیچ تیر کی طرح ایک لامتناہی تکتے تک چلا گیا تھا۔

سمندرِ شمالی کو ڈائنک کی تعمیر سے مقید کرنے کی تجویز لیلی نامی شخص نے پیش کی جس کے تحت ایک بڑے بند کے ذریعے شمالی ہالینڈ کے صوبے کو فریزین ساحل کے ساتھ ملانا مقصود تھا۔ ڈائنک کی تعمیر دونوں طرف سے بیک وقت شروع ہوئی۔ لاکھوں ٹن پتھر اور مٹی سمندر کی تہہ میں غرق کیے گئے اور پانی میں سے بند اُبھرتا گیا۔ مئی ۱۹۳۲ء میں ڈائنک کے دونوں سرے مِل گئے۔ سطحِ سمندر سے اکیس فٹ بلند

نوّے گز چوڑا بند اُنیس میل سے زائد لمبا ہے۔ سمندر کے اِس حصّے کو قید کرنے کے
بعد اِسے مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر پانی کی نکاس کا مرحلہ شروع ہوا۔ زمین کو
نمکیاتی مادوں سے پاک کر کے نئی سڑکیں اور پُل تعمیر کیئے گئے۔ آب رسانی۔ فون اور
بجلی کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ اب جہاں کسی زمانے میں سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا وہاں
خوبصورت قصبے اور کھیت ہیں جو ۔ کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد کے خواب
کی تعبیر ہیں۔ جس مقام پر ڈائک کے دونوں سِرے آپس میں مِلے تھے وہاں ایک یادگار
کھڑی ہے۔ ہم یادگار کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پلیٹ فارم تک چلے گئے جہاں سے
پورے ڈائک کا منظر سامنے آگیا۔ ہم زوڈرزی ڈائک دیکھنے کے بعد ایمسٹرڈیم جانے
والی شاہراہ پر گامزن ہوئے تو مجھے ڈائک کی یادگار پر کندہ عبارت کے الفاظ یاد
آگئے۔ " زندہ قومیں اپنے مستقبل کی تعمیر کرتی ہیں "



ایک خوبصورت نظم۔ ایمسٹرڈیم

ڈانک سے واپسی پر حنیف اور کپ مجھے ہالینڈ کے سب سے بڑے شہر ایمسٹرڈیم کے ایک پرسکون علاقے میں واقع "ہوٹل کاک" کے باہر اتار کر خود واپس ڈیرن چلے گئے۔ "ہوٹل کاک" کے طرزِ تعمیر سے ظاہر تھا کہ چند سو برس پیشتر یہ عمارت کسی ڈچ سوداگر کا شاہانہ گھر تھا۔ ڈھلوان چھتیں۔ شیشے کی قدِ آدم کھڑکیاں اور دبیز چوبی دروازہ جس پر لوہے کا بھاری کنڈا لٹک رہا تھا۔ ڈیسک پر اپنا نام و پتہ رجسٹر میں لکھنے کے بعد میں نے سامان کمرے میں رکھا اور شام کے کھانے کے لیے ہال میں واپس آ گیا۔ ہال کے ایک کونے میں چند نوخیز لڑکے اور لڑکیاں "جیوک باکس" پر بجنے والی تیز موسیقی پر دھم دھما دھم ناچ رہے تھے۔ یورپ میں جہاں نئی نسل نے تمام پرانی اقدار سے منہ پھیرا ہے وہاں روایتی رقص کی بھی مٹی پلید کی ہے۔ وہ وقت گئے جب ایک یورپی نوجوان صرف اس لیے خودکشی پر مائل ہو جاتا تھا کہ اس نے والز ناچتے ہوئے غلط قدم اٹھانے کی وجہ سے اپنی ہم رقص کا پاؤں مسل دیا تھا۔ جس طرح تجریدی مصوری کے لیے صرف ایک برش اور چند رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح آج آپ کو ایک ماہر رقاص بننے کی خاطر صرف کانوں کے پردے پھیر دینے والی موسیقی اور ایک مضبوط اعصابی نظام درکار ہے۔

ایمسٹرڈیم کا امریکی یہودی جوشش

ہمُن، چھُن، چھُن، چھُن کی دھمک پر کان رکھیے اور جسم کے تمام اعضا ڈھیلے چھوڑ کر جو چاہیے کر گذریئے۔ "فروگ" اسی بلا کا نام ہے۔ "جرک" میں جھٹکے لگتے ہیں اور "منکی" یعنی "بندر" میں ظاہر ہے آپ کو بندر ناچ ناچنا پڑے گا۔

ہال کے دوسرے حصّے میں کھانے کا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک خوبصورت ڈچ لڑکی کھانا دے رہی تھی۔ مَیں نے سبزی گوشت کے گاڑھے مرکّب کا ایک پیالہ خریدا اور کاؤنٹر کے ساتھ سٹول پر بیٹھ گیا۔ ساتھ والے سٹول پر ایک سُرخ بالوں والا ہپّی بیئر پینے میں مشغول تھا۔ وُہ کاؤنٹر پر جُھک کر بیئر کا گھونٹ بھرتا تو شانوں تک آئے ہوئے سُرخ بال اُس کی آنکھوں کے آگے آجاتے۔ وُہ اپنی عینک کی پتلی کمانیاں بالوں میں چھُپے ہوئے کانوں سے چھُڑاتا۔ عینک کاؤنٹر پر رکھتا اور جیب سے کنگھی نکال کر بڑے ٹھسّے سے بال سنوارتا۔ عینک اُٹھا کر دوبارہ ناک پر جماتا اور پھر بیئر پینے میں مصروف ہو جاتا۔ عام ہپّی کی موجودگی کا احساس قوّتِ بینائی استعمال کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ قوّتِ شامّہ پر موقوف ہوتا ہے لیکن یہ صاحب وضع قطع سے خاصے صاف سُتھرے دِکھائی دے رہے تھے۔ مَیں نے گاڑھے مُرکّب کا چمچہ بھر کر مُنہ میں ڈالا تو ایک دم اُبکائی آگئی۔ نہایت بد ذائقہ تھا۔ مَیں نے منہ بنا لیا۔

"بدمزہ ہے نا؟" سُرخ بالوں والے ہپّی نے ماتھے پر سے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا اور پھر مُسکرا کر کہنے لگا۔ "پہلے دن مَیں بھی پھنس گیا تھا۔"

مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہالینڈ میں صرف بیئر اچھی ملتی ہے۔" اُس نے ایک لمبا گھونٹ بھرا اور خالی مگ کاؤنٹر پر کھٹکھٹانے لگا۔ "میرا نام جوشوا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی۔"

"اور میرا نام مُستنصر ہے، لاہور پاکستان۔" مَیں نے بھی امریکی طریقۂ تعارف اپنا لیا۔

"پاکستانی؟" اُس نے ہونٹ بھینچ کر مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "پھر تو شاید تم میری رفاقت پسند نہ کرو۔ مَیں امریکی یہودی ہوں۔"

" ہر قومی سانحہ پر ہتھیاروں سے مسلّح ہو کر یہودی رہائشی علاقوں پر چڑھ دوڑنے کی طرح مشرق والوں نے نہیں ڈالی۔ مَیں سیاح ہوں اور ذات، صفات اور بھیس پر یقین نہیں رکھتا۔"

اُس کے چہرے پر رونق آگئی۔ " ہم ہپیوں کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں ؟"

" تمہاری امن پسندی اور عالمی بھائی چارے کی اقدار سے بھلا کون اختلاف کر سکتا ہے؟ لیکن اخلاقی اقدار کی پامالی اور منشیات کا استعمال میری سمجھ سے باہر ہے۔"

" مَیں تمہیں کل اپنے چند دوستوں سے ملاؤں گا۔ اُن سے مل کر شاید تم ہپیوں کو بہتر طور پر سمجھ سکو۔"

" کیا وہ بھی امریکی ہیں ؟"

" یہ تو قومی یادگار کی سیڑھیوں پر جا کر معلوم ہو گا کہ وہ کہاں کے باشندے ہیں۔"

" تم نے دوست کا لفظ استعمال کیا تھا ؟"

" اور تم بھی عالمی بھائی چارے کا لفظ استعمال کر کے بھول گئے ہو۔ تمام ہپی ایک دوسرے کے دوست ہیں چاہے وہ کسی بھی ملک یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔"

ہال کے دوسرے حصے میں ابھی تک وہ دھم دھما دھم والا رقص جاری تھا۔ یکایک چند لڑکیوں پر جو وجد طاری ہوا تو انہوں نے موسیقی کی دھمک کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے اپنے آپ کو لباس کی قید سے آزاد کرنا شروع کر دیا۔

" یہ کیا ہو رہا ہے ؟ " میں نے گھبرا کر جوشوا سے پوچھا۔

" جو بھی ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے۔ " اُس نے اپنی عینک دُرست کرتے ہوئے پُرسرت لہجے میں کہا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی شکلوں سے لگتا تھا جیسے وہ وہیں بیٹھے بٹھائے منجمد ہو گئے ہوں۔ وہ سب بے حس و حرکت ٹکٹکی باندھے اُن لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مَیں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ لڑکیاں اپنے لباس تلے جامۂ غسل پہنے ہوئے تھیں۔ کئی چہرے جامۂ غسل کی غیر متوقع رکاوٹ دیکھ کر تنک سے گئے۔ لڑکیوں نے شیشے کی قدِ آدم کھڑکی کے کواڑ کھولے، اور آزاد

آسمان کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر یکلخت ہا ہا۔ ہُو ہُو کا شور مچاتیں باہر سڑک پر کُود گئیں جہاں زوروں کا مینہ برس رہا تھا۔

"آج پورے تین روز بعد بارش ہوئی ہے۔" کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی صحت مند ڈچ لڑکی نے اپنے بلاؤز کے بٹن ٹٹولتے ہوئے ہم سے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اُن کے ساتھ غُسل میں شریک ہو جاؤں۔"

"ہو سکتا ہے اِس کمبخت نے لباس کے نیچے جامۂ غسل پہلے سے پہنا ہی نہ ہو۔" مَیں نے گھبرا کر سوچا اور اِس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی اور اپنا اصلی جامہ اتارتی مَیں جوشوا سے اگلی صُبح ملنے کا وعدہ کر کے دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آگیا۔ سونے سے پہلے مَیں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا۔ سڑک کے عین وسط میں جوشوا اپنے تمام کپڑوں سمیت ہندوستانی سادھوؤں کی مانند آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنے گرد بارش میں نہاتی ہوئی لڑکیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر والی صحت مند لڑکی کے بارے میں میرے شکوک دُرست تھے۔

دوسری صُبح جوشوا (جسے اب میں جوش کے نام سے پکارتا تھا) اور مَیں ہوٹل سے بذریعہ ٹرام منٹ ٹاور یعنی ایمسٹرڈیم کے ٹکسالی دروازے آئے اور پھر شہر کی خوبصورت ترین سڑک اور خرید و فروخت کے سب سے بڑے مرکز کالور سٹراٹ پر چہل قدمی کرنے لگے۔ یہاں میکانکی آمدورفت کی ممانعت تھی چنانچہ لوگ بے دھڑک ہو کر سڑک کے عین درمیان میں چل رہے تھے۔ لاہور کے انارکلی بازار کی مانند یہاں پر بھی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی کمی تھی۔ اکثریت صرف رونق میلا دیکھنے کے لیے اُمڈ آئی تھی۔ کالور سٹراٹ کے نزدیک دریائے ایمسٹل ہے جس پہ ڈیم یعنی بند باندھا گیا تو نواحی آبادی ایمسٹرڈیم کے نام سے موسوم ہوئی۔ اِسی طرح دریائے روٹر پہ بند باندھنے پر روٹرڈیم وجود میں آیا۔ اہل ہالینڈ جب بھی اپنے شہروں کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ روٹرڈیم کو حرکت سے بھرپور شہر کہتے ہیں۔ ہیگ کو "بزرگی" کا جامہ اوڑھا دیا جاتا ہے اور ایمسٹرڈیم "ایک خوبصورت

نظم ہے جو دھیرے دھیرے دل میں اُترتی رہتی ہے۔" ایک ایسے ملک میں جو بظاہر بے جان اور بے حد سپاٹ ہے ایمسٹرڈیم ایک دھڑکتے ہوئے حساس دل کی مانند ہے۔ ایک ایسا دل جس میں سینکڑوں نہریں حیات آفریں شریانوں کی مانند پھیلی ہوئی ہیں۔ اِن عجوبۂ روزگار نہروں نے شہر کو سینکڑوں خاموش اور چمکتے ہوئے تالابوں سے چھید ڈالا ہے۔ تالابوں کے گرد پُرانے زمانے کے ڈچ سوداگروں کے شاہانہ مکان کھڑے ہیں۔ سفید کھڑکیاں۔ خوبصورت زینے اور قدیم چوبی دروازے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اور بھی دیدہ زیب ہو گئے ہیں۔ ایک جدید شہر ہونے کے باوجود ایمسٹرڈیم میں دیہاتی اطوار کی جھلک موجود ہے۔ مُنٹ ٹاور کے پاس کشتیوں میں سجے ہوئے پھولوں کا بازار، سکون اور خاموشی، تنگ گلیوں میں سے آتی ہوئی لوک دُھنوں کی سحر انگیز موسیقی۔ کبھی کبھار شیشے کی چھت والی کشتی اِس خوبصورتی میں تیر جاتی تو پانی میں ہلکے تلاطم کی وجہ سے نہر میں تیرتی ہوئی لاتعداد سفید بطخیں اپنے پَر پھڑپھڑا کر کمان نما پُلوں کے نیچے گھس جاتیں۔ ہر جگہ بہتا ہوا پانی، نیلگوں آسمان، لائم کی زرد کلیاں، ایلم کے خوبصورت پتّے۔ نہروں پر لیٹے ہوئے پُلوں کے بل کھاتے جنگلوں سے نیچے جھانکیں تو اپنا عکس جھلکنے لگتا ہے۔

اگرچہ ایمسٹرڈیم ملک کا صدر مقام ہے لیکن کاروبارِ حکومت ہیگ سے چلایا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال اکثر سیاحوں کے لیے پریشان کُن ثابت ہوتی ہے۔ اور تو اور کبھی سادہ لوح ڈچ بھی اِس گتھی کو سلجھا نہیں پاتے۔ صدیوں سے اِن دونوں شہروں میں مُلک کا صدر مقام بننے کی رسہ کشی جاری رہی۔ ۱۸۰۶ء میں جب نپولین نے یورپ کے اکثر ملک اپنے بہن بھائیوں میں بطور "جیبی" بانٹے۔ تو ہالینڈ لُوئی بوناپارٹ کے حصے میں آیا۔ لُوئی نے ایمسٹرڈیم کو صدر مقام قرار دیا اور ہیگ حکومت اور شاہی نشست کا حقدار ٹھہرا۔ یہ ترتیب کسی قسم کے ردوبدل کے بغیر اب تک چلی آ رہی ہے۔ ایمسٹرڈیم صرف ایک خوبصورت شہر ہی نہیں بلکہ بہت بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ دُنیا میں ہیروں کی سب سے بڑی منڈی اِسی شہر میں واقع ہے۔ ایمسٹرڈیم کے جوہری ہیروں کی تراش خراش میں دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مبارک حویلی موچی دروازے سے برآمد شد

کوہِ نور قلعہ لاہور میں آیا اور پھر سکھوں کی شکست پر لندن منتقل ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کو ہیرے کی دیسی تراش خراش پسند نہ آئی چنانچہ اِسے یورپی وضع دینے کے لیے ایمسٹرڈیم کے ماہر جوہریوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ کالور سٹراٹ میں گھومنے کے بعد جوش مجھے حسبِ وعدہ قومی یادگار کے چوک میں اپنے دوستوں سے ملانے لے آیا۔ جہاں سیڑھیوں پر بھانت بھانت کے ہپی اُٹھنے بیٹھنے اور سونے کی مختلف حالتوں میں بکھرے پڑے تھے۔ جوش نے بتایا کہ اس سال یورپ کے ہپیوں نے ایمسٹرڈیم کی قومی یادگار کی سیڑھیوں کو اپنا مرکز قرار دیا ہے چنانچہ دُنیا بھر کے ہپی زیارت کے لیے چلے آرہے ہیں۔ مَیں اور جوش بھی اس ہجومِ ہپیاں میں بیٹھ گئے اور وہ مجھے امریکیوں کے ہپی بن جانے کی وجوہات بتانے لگا۔ "میری ماں واشنگٹن کی ایک مشہور خاتون صحافی ہیں اور وہ شاکی ہیں کہ اِس دَور میں امریکہ میں دیانت دارانہ صحافت ایک ناممکن امر ہے۔ کانگرس کے لیڈروں اور امیر تاجروں کی مرضی کے بغیر ایک لفظ بھی لکھنا گویا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ ایک خاص ٹولے نے اپنے شخصی وقار اور فائدے کی خاطر پورے امریکی معاشرے کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اِن حالات میں نئی نسل ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہے۔ تعلیم و تدریس کے ادارے البتہ کسی حد تک خود غرضی کے اِس زہر سے پاک ہیں۔ اِن اداروں میں چند گنے چنے لوگ موجودہ اقدار اور معاشرتی برائیوں کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیے ہوئے ہیں۔ انجلا ڈیوس، مارکوس اور پاکستان کے اقبال احمد اِن میں سرِ فہرست ہیں۔ امریکی معاشرے نے اعلیٰ تہذیب و تمدن کا جو جامہ اوڑھ رکھا ہے نئی نسل کو اُس کے پیچھے چھپے ہوئے گھناؤنے اور مکروہ چہرے کا علم ہوگیا ہے۔ یہی حالت یورپ کی ہے جہاں خود غرضی اور مادی ترقّی کی بنیادوں پر استوار معاشرے میں سے سڑاند اُٹھ رہی ہے۔ نوجوان طبقہ سکون، امن اور سچائی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ ہم سکون کی خاطر چرس پیتے ہیں تو لوگ مشتعل ہو کر اِس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چرس پینے والا شخص ہمیشہ پُرامن رہتا ہے اور اِس کے مُضرِ صحت اثرات پر ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کیا جا سکا۔ اُدھر شراب جیسی لعنت اور تمباکو نوشی جیسے مضرِ صحت

نشے کی کھلی چھٹی ہے۔ آج تک یورپ میں نوجوانوں کی جتنی تحریکیں بھی اُبھری ہیں، ہپّی ازم اُن سب میں سے پُرامن ہے۔ ہم مغرب سے مایوس ہو چکے ہیں اور اپنی نجات کے لیے مشرق کا دامن تھامنا چاہتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ہمیں مشرقی موسیقی بے حد پسند ہے اور ہم روز بروز مشرقی لباس اور عادات واطوار کے گرویدہ ہوتے جا رہے ہیں۔"

مَیں نے اپنے گرد نگاہ ڈالی تو جوش کے دلائل میں حقیقت کا رُوپ نظر آیا۔ اکثر ہپّی لڑکے اور لڑکیوں کا لباس مشرقی تھا۔ کھدّر کے کُرتے، واسکٹ اور ساڑھیاں۔ ایک صاحب ستار بجا کر راہگیروں سے پیسے کھرے کر رہے تھے۔ ایک گنجا ہپّی مجسّمے کے اوپر ایک ٹانگ پر کھڑا بنسری بجا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اِتنا جھوم رہا تھا کہ ہر لحظہ یہی خطرہ رہتا کہ ابھی دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ چند ہپّی فٹ پاتھ پر دستکاریوں کی دکان لگائے بیٹھے تھے۔ انگوٹھیاں، چوڑیاں، کنگن اور تسبیحیں اُن کے اپنے ہاتھوں کی بنی تھیں۔ سیڑھیوں پر بیٹھے ہُوئے تمام ہپّی بغیر کسی رکھ رکھاؤ اور بناوٹ کے ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھے۔ سنٹرل سٹیشن سے آنے والی سڑک پر جب کوئی نیا ہپّی نمودار ہوتا تو سب لوگ باآوازِ بُلند اُسے خوش آمدید کہتے۔ وُہ اپنا مختصر اثاثہ زمین پر رکھ کر وہیں لیٹ جاتا اور اپنے سفر کے بارے میں بتانے لگتا۔

" مَیں افریقہ سے آ رہا ہوں، وہاں ایک امیر ہپّی نے ایک اجتماعی فارم بنا رکھا ہے جس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھُلے ہیں۔ فارم پر معمُولی محنت کے بدلے رہائش اور خوراک کا انتظام ہو جاتا ہے۔ مَیں وہاں زندگی میں پہلی مرتبہ پیار اور دوستی کے جذبے سے آشنا ہوا۔"

" یونانی جزیروں کی غاریں بے حد آرام دہ ہیں۔ سمندر سے مچھلی پکڑنا بھی آسان ہے۔ میک ناس کا جزیرہ آج کل زرد پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ مَیں وہیں سے آ رہا ہوں۔"

نووارد اپنی داستان کہہ چکتا تو سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاتے اور وہ مزے سے وہیں پاؤں دراز کر کے اونگھنے لگتا۔

یادگار کے سامنے چند ہپّی لڑکے اور لڑکیاں بے تحاشہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

"اِن کو کیا ہُوا ہے ؟" مَیں نے جوش سے دریافت کیا۔

"فٹ بال کھیل رہے ہیں۔"

دونوں ٹیمیں بڑے زور و شور سے ایک دوسرے کے گول پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے عالمی چیمپین شپ کا مسئلہ درپیش ہو۔ ہپی کھلاڑیوں کے چہرے سکون اور مُسرت کے جذبات سے بھرپور تھے۔ گول کیپر نہایت چابکدستی سے گول کی حفاظت کر رہا تھا۔ جب کبھی گول ہو جاتا تو ارد گرد کھڑے تماشائی تالیاں بجاتے۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں نے سر کھُجلاتے ہُوئے غور سے دونوں ٹیموں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "فٹ بال تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہا۔" مَیں نے جوش سے پُوچھا تو کہنے لگا۔ "فٹ بال کی کیا ضرورت ہے۔ تخیّل کی پرواز ہی کافی ہے۔"

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم یادگار کے سامنے والی گلی میں واقع "مانزا ریستوراں" میں چلے گئے جو کم خرچ ہونے کی وجہ سے ہپیوں میں بے حد مقبول تھا۔ دروازے کے ساتھ خوراک کے کوپن فروخت ہو رہے تھے۔ کوپن خرید کر ہم کاؤنٹر پر آ گئے جہاں چند بوڑھی عورتیں کوپنوں کے عوض چائے اور کھانا دے رہی تھیں۔ یہاں بھی ہپیوں کا راج تھا۔ اکثر ہپیوں کی کوشش تھی کہ بوڑھی عورتوں کو غچّہ دے کر چائے کے کوپن کے بدلے گوشت کی پلیٹ مِل جائے مگر وہ اِن ہتھکنڈوں سے واقف تھیں اس لیے اُنہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر جوش کی جانب دیکھا تو ایک گنجا ہپّی بڑے مزے سے میری کھانے کی پلیٹ اُٹھا کر چل دیا۔ مَیں نے شور مچایا تو وہ فوراً واپس آ گیا اور بھرپور معذرت کے بعد پلیٹ میز پر رکھ دی۔ ایک صاحب خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے تمام میزوں کا چکر لگا رہے تھے۔ "ظاہر ہے آپ اتنی زیادہ خوراک اکیلے نہیں کھا سکتے۔" وہ ہر ایک کو کہہ رہے تھے۔ "ایک آلو تو عنایت کر دیجیے۔" تھوڑی دیر میں اُنہوں نے خاصی خوراک اکٹھی کر لی۔ اس کے بعد ہاتھ میں مشروب پینے والا تنکا لے کر آ گئے۔ "مَیں آپ کے کوکا کولا میں سے ایک چُسکی لے لوں ؟"

مانزہ میں خوراک ہوٹل کاک جیتنی ہی بدمزہ تھی مگر قیمتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔
ہم وہاں کافی دیر بیٹھے رہے اور جوش کے "دوستوں" کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہوتا رہا مثلاً پاکستان میں آج کل چرس کا کیا بھاؤ ہے؟ وہاں کے ملنگ بھنگ میں بادام کیوں استعمال کرتے کرتے ہیں؟ میں نے اُنہیں جو کالیاں کے قریب "بیلے" یعنی دریائی جنگل میں پائی جانے والی خودرو بھنگ کے بارے میں بتایا کہ کس طرح وہاں چرنے والی بھینسیں کبھی کبھار آنکھیں موندھ کر جھومنے لگتی ہیں۔

مانزا سے پچھلے پہر باہر نکلے تو دھوپ ڈھل چکی تھی اور شہر کی نہروں کے کنارے خوب رونق تھی۔ رَوکن نہر کے کنارے لوگوں کا ہجوم پانی میں جھانک رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ نہر میں ایک کار گر گئی تھی جسے کرین کی مدد سے نکالا جا رہا ہے۔ ایمسٹرڈیم میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی موڑ یا گھاٹی پر ڈرائیور نے بروقت کار آہستہ نہ کی اور سیدھا نہر میں سدھارا۔ اِس حادثے میں ہمیشہ کی طرح ڈرائیور بچ گیا تھا اور کنارے پر کھڑا کرین والوں سے استدعا کر رہا تھا کہ کار میں کرین کا کنڈا لگاتے وقت احتیاط برتی جائے۔ وہ بڑی مشکل سے یہ کار ایک شام کے لیے اپنے باپ سے مانگ کر لایا تھا۔

"مستنصر" جوش نے مجھے ٹھوکا دیا۔ "وہ لڑکیاں دیکھ رہے ہو؟ مشرقی لگتی ہیں۔" شلوار قمیض میں ملبوس دو پاکستانی لڑکیاں پُل سے نیچے پانی میں جھانک رہی تھیں۔ میں اُن کے پاس چلا گیا۔

"آپ پاکستان سے آئی ہیں؟" مُدت بعد وطن کے جاتے پہچانے لباس کو دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے وطن کے بارے میں کچھ بتائیں۔

"جی ہاں" اُن میں سے ایک نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا اور منہ پھیر لیا۔ اِس سے قبل کہ میں کچھ اور کہتا دوسری محترمہ نے چمک کر کہا۔ "آپ کو فلرٹ کرتے شرم نہیں آتی؟" میں روہانسا ہو کر واپس چلا آیا۔

"کیا بات ہے دوست ؟" جوش نے مجھے واپس آتے دیکھ کر پوچھا۔ "کامیابی نہیں ہوئی؟"

"یہ بات نہیں ، وہ ہندوستانی ہیں ۔" میں نے جھوٹ بول دیا۔ "چلو واپس ہوٹل چلتے ہیں ۔"

"ہوٹل ؟ بالکل نہیں ۔ ایمسٹرڈیم کی خوبصورتی شام کو ہی تو نکھرتی ہے ۔ آج میں تمہیں ایک ایسے ریستوران میں لے چلتا ہوں جہاں شاید ہی کوئی پاکستانی گیا ہو ۔" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں نے چلتے چلتے پل پہ نگاہ ڈالی ۔ وہ پاکستانی لڑکیاں ابھی تک وہیں کھڑی تھیں مگر اب اُن کے پاس دو سفید فام سیاح بھی تھے جن کے ساتھ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں ۔

رُوکن نہر کے کنارے چلتے ہوئے ہم دائیں ہاتھ پہ واقع ایک زیرِ زمین ریستوران کی سیڑھیاں اتر کر اندر چلے گئے ۔ ریستوران میں مجھے کوئی ایسی غیر معمولی خوبی یا برائی نظر نہ آئی کہ وہاں پاکستانیوں کا گذر ہی نہ ہو سکے ۔ بلکہ ریستوران کا تمام عملہ مشرقی شکل و صورت کا تھا۔ سیاہ بال، پستہ قد، اور چوڑی ناکیں ۔

"وات ڈو یُو لائک سَر ؟" ایک ویٹر نے جھک کر دریافت کیا۔ اُس کا لہجہ اطالوی لگتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے ؟" جوش نے ویٹر سے مخاطب ہو کر بڑے ٹھسّے سے کہا۔ "میرے دوست کا نام حُسین ہے ۔"

"حُسین ؟" ویٹر کے ہاتھ سے مینو کارڈ گرتے گرتے بچا۔

"ہاں حُسین ۔ لیکن اُردن والا نہیں ۔ یہ میرا دوست ہے اور پاکستان سے آیا ہے ۔"

"خوش آمدید جناب ۔" ویٹر نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ پہلے پاکستانی ہیں جو اس اسرائیلی ریستوران میں تشریف لائے ہیں ۔"

"اسرائیلی ؟" اب میرے حیران ہونے کی باری تھی ۔

"سراسر اسرائیلی " جوش نے ہنس کر کہا۔ "تم ہی نے تو کہا تھا ۔ میں سیّاح ہوں ۔ ذات، صفات

اور بھیس پر یقین نہیں رکھتا۔"

سامنے دیوار پر ستارۂ داؤد سے مزیّن اسرائیل کا سفید اور نیلا جھنڈا آویزاں تھا۔ اُسکے اوپر بین گورین کی تصویر تھی۔ مَیں نے غور کیا تو برتنوں پر بھی نیلا ستارہ بنا ہُوا تھا۔

"مَیں نے تمہارے لیے اسرائیل کی ایک روایتی خوراک منگوائی ہے۔" جوش نے ویٹر کو آرڈر لکھاتے ہوئے مجھے بتلایا۔

یہ روایتی خوراک خستہ نان، گوشت کے ٹکڑوں اور تیز سُرخ مرچوں پر مشتمل تھی۔ "اصل میں یہ فلسطینی عربوں کی مرغوب غذا تھی۔ اسرائیلیوں نے اسے اپنا لیا ہے۔" جوش مرچوں کے چٹخارے لے رہا تھا۔

"ہاں جب پُورا مُلک ہتھیا لیا جائے تو غذا اپنانے میں کیا حرج ہے۔" مَیں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے پلیٹ میں سُرخ مرچیں نہیں بلکہ مظلوم عربوں کا خون جما ہُوا ہے۔

"یہاں سیاست پر گفتگو کرنا منع ہے۔" جوش نے مینو کارڈ کی آخری سطر پہ اُنگلی رکھ کر کہا۔

"کیا یہاں انسانیت کے بارے میں گفتگو کرنا بھی منع ہے؟" میرے لہجے میں تلخی کا عنصر تھا۔ "تم نے آزاد اسرائیلی ریاست امریکہ کے کسی کونے میں کیوں نہ قائم کی؟ سویڈن کا شمال بھی تو بے آباد پڑا تھا! بیلفور کی نظریں آسٹریلیا کے ویرانوں پر کیوں نہ پڑیں؟ کیا یہ ضروری تھا کہ تم لاکھوں بے گناہوں کو بے گھر کر کے فلسطین میں ہی اپنے قدم جماتے؟"

ریستوران کے تمام ویٹر ایک کونے میں کھڑے ہو کر ہمیں شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بھئی میں اسرائیل کی طرف داری تو نہیں کر رہا۔" جوش کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

ہم نے جلدی سے بل ادا کیا اور باہر آ گئے۔

"تمہیں معلوم ہے۔" جوش نے غمزدہ ہو کر کہا۔ "سبھی یہودی اسرائیل کے قیام کو برحق نہیں سمجھتے۔ میں خود اس بات کا حامی ہوں کہ عربوں اور یہودیوں کو امن و آشتی سے رہنا چاہیے۔ میں ظلم کے خلاف ہوں چاہے وہ اسرائیل میں ہو یا ویت نام میں۔"

"یا کشمیر میں!" میں نے گرہ لگائی۔

"بالکل۔" وہ ہنس دیا۔ "چلو اب ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں اکثر پاکستانی جاتے ہیں۔"

"تھاربک پلان" چوک کے گرد و نواح میں ایمسٹرڈیم کی شبینہ زندگی کی جھلکیاں اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھیں۔ چوڑی سڑک کے دونوں طرف کلبوں، شراب خانوں اور ہوٹلوں کی بھرمار تھی۔ ہر کونے پر کسی نہ کسی محترمہ سے پالا پڑ جاتا جن کے لبوں پر "وانٹ گڈ ٹائم" کا استفسار ہوتا۔ ہیمبرگ کی ریپا بہان کی طرح یہاں بھی اکثریت سیاحوں اور ملاحوں کی تھی۔ صبح سے اب تک ہمارا زیادہ وقت پیدل چلنے میں صرف ہوا تھا اور میں اب بے حد تھک چکا تھا۔ جوش کو واپس ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو سامنے اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "میرے ایک ڈچ دوست نے اس کلب کے "نے بن" کی تعریف کی تھی۔ ذرا اندر جھانک لیں پھر چلتے ہیں۔" جوش نے صرف جھانکنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ٹکٹ خرید لیے اور ہم اندر چلے گئے۔ ایک نیم تاریک کمرے میں سٹیج کے سامنے چند میزیں لگی تھیں جن پر بیٹھے ہوئے لوگ مے نوشی میں مصروف تھے۔ ہم بھی ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ویٹر کے اصرار کے باوجود شمپین کی بجائے صرف کوکا کولا کا آرڈر دیا۔ تمام میزیں مردوں سے پُر تھیں جو ایک دوسرے سے نہایت بے تکلفی اور پیار سے بات چیت میں مصروف تھے۔ عورتوں کی غیر موجودگی بے حد معنی خیز تھی۔

ایک دم اسٹیج پر تیز برقی قمقمے جل اُٹھے اور ایک موٹے ڈچ نے کھڑے ہو کر شو شروع ہونے کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے ایک نہایت حسین "محترمہ" وارد ہوئیں۔ اُنہوں نے گھٹنوں تک لمبا بھڑکیلا سُرخ لباس پہنا ہوا تھا اور سنہری بالوں کے جہازی سائز جُوڑے

میں پرندوں کے رنگ برنگے پَر اُلکا رکھے تھے۔ گانے کے بول چونکہ فرانسیسی میں تھے اِسلیے میرے پلّے تو کچھ نہ پڑا البتہ سامعین نے دِل کھول کر داد دی۔ گانے کے دوران میں مجھے ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس ہوئی جیسے یہ سب کچھ نقلی ہو اور کہیں نہ کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔ اِس کے بعد تین "لڑکیوں" نے ایک بے حد ہیجان خیز رقص پیش کیا۔ میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رقص کے بعد ایک لمبی تڑنگی "لڑکی" اسٹیج پر آئی اور مائکروفون کو ہاتھ میں لے کر گانا شروع کر دیا۔ اب موسیقی نہایت دھیمے سُروں میں بج رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے گانا بند کر دیا اور موسیقی کی دُھن پر بلاؤز کے بٹن کھول کر لباس اُتارنا شروع کر دیا۔ تماشائیوں نے اِس حرکت کا استقبال نعروں اور سیٹیوں سے کیا۔ مَیں نے مُنہ پھیر لیا اور جوش سے باہر چلنے کے لیے کہا۔ وہ شو کے خاتمے تک بیٹھنا چاہتا تھا۔ مَیں کُرسی سے اُٹھا اور دروازے کی جانب چل دیا۔ یکدم تماشائیوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر کمرہ سر پہ اُٹھا لیا۔ مَیں نے مُڑ کر اسٹیج کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف لنگوٹ میں ملبوس ایک جوان لڑکا کھڑا تھا جو جُھک کر تماشائیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں زنانہ کپڑے اور دوسرے میں نقلی بالوں کی ایک وِگ تھی جو اُس نے حسین لڑکی کا روپ دھارتے ہوئے پہن رکھی تھی۔ اَب مجھے اپنی بے چینی کا جواز مِلا۔ شو میں گانے اور ناچنے والے سب نوخیز لڑکے تھے جنھوں نے تماشائیوں کے ایک خاص "جذبے" کی تسکین کی خاطر عورتوں کا سوانگ بھر رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے مجھے ابھی ستے ہو ے ئی۔ مَیں جلدی سے باہر آگیا اور پیدل ہی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

نہروں کے کنارے مکمل خاموشی اور سکون تھا۔ شاہراہوں کی روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ مدھم چاندنی میں سفید گھر اور پُلوں کے آہنی جنگلے پانی میں جھول رہے تھے۔ مَیں اتنی ساری خوبصورتیاں چھوڑ کر اُس جہنم میں چلا گیا تھا جہاں بے راہرو مردوں، آوارہ عورتوں اور بدنام کلبوں نے ایمسٹرڈیم کے حسین شہر کو داغدار کر دیا تھا۔

نہریں اور زرد کلیاں

اگرچہ ہالینڈ کے زمینی مناظر میں پرشکوہ اور حیرت انگیز عناصر کا فقدان ہے مگر یہاں کے باشندوں میں فن اور خوبصورتی کا شعور کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اُن کا اعلیٰ ذوق روز مرہ کی زندگی اور رہنے سہنے کے طریقوں میں پوری طرح اُجاگر ہے۔ شاندار طرزِ تعمیر، دیدہ زیب روایتی لباس، گھروں کی سجاوٹ اسی فہم کا حصّہ ہیں۔ اہلِ ہالینڈ کی اِن فنکارانہ صلاحیتوں نے دنیا کے عظیم ترین مصوّروں کو جنم دیا۔ فرانز ہال، پیٹر ہوگ، ریمبرانت، رُوسوڈل، جان سٹین، ورمیر اور فان گوگ ہیکلِ مصوّری کے ستون مانے جاتے ہیں۔ ایمسٹرڈیم کا رائک میوزیم یورپ کے بہترین عجائب گھروں یعنی لینن گراڈ کے ہرمے تاژ، پیرس کے لُوور، لنڈن کے نیشنل آرٹ، فلارنس کے اوفیجی اور میڈرڈ کے پراڈو کا ہم پلّہ شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میونسپل میوزیم میں جدید مصوّروں کے شاہکار دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کا دن میں نے انہی دو عجائب گھر دیکھنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ جوش جو پچھلی شب خاصی دیر سے واپس لوٹا تھا۔ ابھی تک سو رہا تھا۔ مَیں نے اُسے جگانا مناسب خیال نہ کیا اور تیار ہو کر میونسپل میوزیم کی طرف چل دیا جو ہوٹل کاک کے نزدیک واقع تھا۔

عجائب گھر کے دفتر میں مجھے اپنی برساتی اور کیمرے جمع کروانے پڑے۔ کیمرے اس لیے کہ فوٹوگرافی ممنوع تھی اور برساتی میں کسی شاہکار تصویر کو لپیٹ کر رفوچکر ہوا جا سکتا ہے۔ میں نے ٹکٹ کے ساتھ تصاویر کی فہرست بھی خرید لی۔ پکاسو، شگال، لاٹرک، گوگین اور پھر فان گوگ میں نے اسی ترتیب سے عجائب گھر کے مختلف کمرے دیکھنے شروع کر دیے۔ اکثر تصاویر نہایت عامیانہ تھیں اور مجھے متاثر نہ کر سکیں۔ جدید مجسموں کے حصے پر کباڑ خانے کا گمان ہوتا تھا۔ زنگ آلود برتن، آہنی تاریں، ٹوٹی ہوئی سائیکلیں، ٹائر اور نہ جانے کیا کیا الابلا جوڑ کر "زندگی کیا ہے؟" کا عنوان دے دیا گیا تھا۔ لوہے کے سینکڑوں تکونے ٹکڑے کینوس پر چپکا کر "مشکلات" کا نام دے دیا گیا۔ میں فنونِ لطیفہ کی اس شعبدہ بازی کو دیکھ کر باہر برآمدے میں آ گیا اور مخالف سمت میں واقع بڑے دروازے سے گذر کر ایک وسیع اور روشن کمرے میں داخل ہو گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تیز رنگوں کے ایک جنگل میں آ نکلا ہوں۔ رنگوں کی بوچھاڑ سے میری آنکھیں چُندھیا گئیں۔ سرو کے گہرے سبز درختوں نے میرا گھیراؤ کر لیا۔ میں جَو اور مکئی کے روپہلی کھیتوں کی باس سونگھ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف سُورج مکھی کے زرد چمکیلے پھول کھل رہے تھے۔ سامنے سورج ایک آتشیں سیّال گولے کی مانند نیلگوں آسمان کو چھید رہا تھا۔ یہ مشہور مصوّر ونسنٹ فان گوگ کی تصاویر تھیں۔ میں اس سے پہلے یہ تصاویر مصوّری کے رسالوں میں دیکھ چکا تھا مگر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اصل اور نقل میں اتنا حیران کن فرق ہو گا۔ فان گوگ کی تصاویر کو اصل رُوپ میں ہی دیکھ کر اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فان گوگ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا۔ اُس کی طبیعت میں شروع سے ہی لاأبالی پن اور بے چینی کا عنصر نمایاں تھا۔ اُسے مصوّری سے جنون کی حد تک عشق تھا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عشق میں ان حدوں کو بھی پھلانگ گیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تصاویر بناتے وقت اُسے احساس ہوا کہ تصاویر کو حقیقت سے قریب تر لانے کے لیے ذاتی طور پر ان تجربوں میں سے گذرنا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بیلجیئم جا کر کچھ عرصہ کوئلے کی کانوں میں بطورِ مزدور کام

کرتا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُس نے مصوّری چھوڑ کر پادری بننے کا ارادہ کر لیا۔ یہ دَور عارضی ثابت ہوا۔ پیرس میں قیام کے دوران میں اُسے اُس وقت کے غیر معروف مصوّروں ڈیگاس، ملنے، مونے، سیزان، سیورت اور گوگین سے ملنے کا اتفاق ہُوا جو مصوّری کی سابقہ روایات سے بغاوت کرکے اپنی تصویروں کو شوخ و شنگ رنگوں سے سیراب کر رہے تھے۔ اُن دِنوں گہرے اور سیاہی مائل رنگ استعمال کیے جاتے تھے۔ تیز رنگ لگانے والے مصوّر نقّادوں کی نظر میں ہرف کھلنڈرے بچّوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِن کھلنڈرے بچّوں نے جن میں فان گوگ بھی شامل تھا، مصوّری کی ایک نئی طرز اثر پرستی (IMPRESSIONISM) کی بنیاد رکھی جس میں تصویر کے مجموعی تاثر پر زور دیا جاتا تھا۔ فان گوگ کی مصوّری کا سنہری دَور جنوبی فرانس کے قصبے آرلز میں شروع ہُوا۔ وُہ ہر صُبح خالی کینوس اور رنگ لے کر باہر نکل جاتا اور آرلز کے چمکتے سورج کے تلے مکّی اور جَو کے لہلہاتے کھیتوں، سَرو کے درختوں اور ٹیڑھی پگڈنڈیوں کی نقاشی کرتا۔ وہ کسانوں سے کہتا، "جیسے تم کُنواری زمین میں ہل جوت کر اناج پیدا کرتے ہو اسی طرح میں بھی اپنے خالی کینوس پر بُرش ، چلا کر رنگوں کی فصلیں اُگاتا ہوں۔" اُس کی تصویریں گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہروں کے سورج کی دِیوانگی سے بھرپُور تھیں اور اِسی سُورج نے اُسے سچ مچ دِیوانہ کر دیا۔ جب ریشل نامی ایک طوائف نے تفریحاً اُس کے کان کا تحفہ مانگا تو مُحبّت کے بھُوکے اور دِیوانے فان گوگ نے اُسی وقت اُسترے سے اپنا کان کاٹا اور یہ کہہ کر اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیا۔ "دِیوانگی میں بھی مسرّت ہے جسے صرف دِیوانے ہی جان سکتے ہیں۔"

اُس کا بڑا بھائی ریو جو پیرس میں ایک تصویریں فروخت کرنے والی دکان پر ملازم تھا۔ اپنے بھائی کی یہ حالت نہ دیکھ سکا اور اُسے سینٹ ریمے کے پاگل خانے میں داخل کروا دیا۔ فان گوگ پاگل خانے میں بھی مصوّری کرتا رہا۔ میونسپل میوزیم کے متعدد کمروں میں فان گوگ کے پیرس، آرلز اور سینٹ ریمے دَور کی کئی تصاویر رکھی ہیں۔ اِن میں ایک

حسّاس مصوّر کی آہستہ اور تکلیف دہ نشوونما کی پرچھائیاں ہیں۔ تخلیقی جدوجہد کی آگ کو جلائے رکھنے کی کوشش، پھر اظہار کی پختگی کی طرف ایک قدم، پیرس کا تیئتر، آرلز کا جذباتی دھماکہ اور آخر میں سینٹ ریمے کا دردناک انجام جو اُس کی ایک تصویر میں ایک اندھی پگڈنڈی کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

یکایک فان گوگ کو احساس ہُوا کہ اُس کے اندر تخلیق کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ سرد ہو رہی ہے۔ وُہ پہروں ہاتھ میں بُرش تھامے خالی کینوس کو گھورتا رہتا مگر ایک ہلکا سا خط بھی نہ لگا پاتا۔ ایک تپتی دوپہر کو جلتے سُورج کے نیچے اپنے پیارے سَرو کے درختوں اور سنہری کھیتوں کے درمیان فان گوگ نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اُس کے بھائی سمیت جنازے میں صرف سات افراد شریک ہوئے۔ تدفین سے قبل لیو نے اپنے بھائی کی لاش کے گرد اُس کی بنائی ہوئی خوبصورت تصاویر سجا دیں۔ کمرے میں رنگوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا جس کے درمیان فان گوگ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ شاید میونسپل میوزیم کے ان کمروں میں وہی تصاویر ہیں جو فان گوگ کی لاش کے گرد سجی تھیں۔ فان گوگ آوارز کے قبرستان میں سُورج مُکھی کے چمکیلے پھولوں کے سائے میں دفن ہے۔

میونسپل میوزیم سے باہر نکلا تو بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مَیں نے اپنی برساتی اوڑھ لی اور دوپہر کے کھانے کے لیے مانزا ریستوران کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ قومی یادگار کی سیڑھیاں خالی پڑی تھیں اور وہاں اونگھنے والے ہپّی بارش سے بچاؤ کی خاطر ٹاؤن ہال کے برآمدوں میں پناہ لے چکے تھے۔ مانزا کا سستا اور بدمزہ کھانا نگلنے کے بعد مَیں نے رائک میوزیم کا رُخ کیا۔

رائک میوزیم میں دوسرے ڈچ مصوّروں فرانز ہال، جان سٹین اور ورمیر کے علاوہ عظیم ریمبرانٹ کے درجنوں شاہکار رکھے ہیں جن میں "نائٹ واچ" سرفہرست ہے۔ اگرچہ اس تصویر کو مونا لیزا کے خالق ڈی ونچی کی "لاسٹ سپر" اور مائیکل اینجلو کی "لاسٹ ججمنٹ"

کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے مگر مجھے یہ تصویر بالکل متأثر نہ کرسکی۔ اِسے میری کم فہمی سمجھیے لیکن اگر ریمبرانت کا نام اس سے وابستہ نہ ہوتا تو میں شاید اسے دیکھے بغیر گذر جاتا۔ البتہ مجھے ریمبرانت کی بنائی ہوئی "ماں کی تصویر"، "یہودی دلہن" اور "شادی شدہ جوڑا" جو اُس کے بیٹے "ٹائٹس کی شادی پر بنائی گئی تھی، بے حد پسند آئیں۔

رائکس میوزیم کے درجنوں وسیع ہال سرسری طور پر دیکھ کر میں باہر آگیا۔ اب میری منزل مصور ریمبرانت کا گھر تھا جو "جوڈن بریس ستراٹ" یعنی یہودیوں کی گلی میں واقع تھا۔ ریمبرانت جو مایئکل اینجلو اور ڈی ونچی کے بعد یورپ کا سب سے بڑا مصوّر شمار ہوتا ہے۔

ریمبرانت وان رائن لائڈن شہر میں ایک ہوائی چکّی چلانے والے کے گھر پیدا ہوا۔ اُسے یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا مگر ریمبرانت پڑھائی چھوڑ کر ایمسٹرڈیم چلا گیا اور وہاں ایک سٹوڈیو بنا کر مصوّری شروع کر دی۔ بہت جلد وُہ شہر کے امیر سوداگروں کا پسندیدہ مصوّر بن گیا اور تصویروں کی آمدنی جوڈن بریس ستراٹ میں یہ خوبصورت گھر خریدنے میں معاون ثابت ہوئی۔ مگر یہ شُہرت اور امارت عارضی تھی۔ ریمبرانت تاجروں کی تصاویر بناتے وقت اُن کی سرمایہ دارانہ خباثت اور کاروباری فریب کو اُن کے چہروں پر اُجاگر کر دیتا۔ اُن امیر تاجروں کو بھلا حقیقت سے کیا سروکار ہو سکتا تھا وُہ تو صرف خوبصورت تصاویر چاہتے تھے چاہے اُن کی اپنی شکل وصورت کریہہ المنظر ہی کیوں نہ ہو۔ تاجروں کی گاہکی منقطع ہونے پر اُس کی آمدنی بالکل ختم ہو گئی اور بالآخر اُسے یہ گھر بیچ کر ایک پُرانے اور گندے محلّے میں زندگی کے آخری ایام بسر کرنے پڑے جہاں لوگ اُس کی تصویروں کا مذاق اڑاتے اور اُسے خبطی بڑھا کہہ کر پکارتے۔ غربت وافلاس کے پہلو بہ پہلو کئی اور آفتوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ اُس کی بیوی اور چاروں بچّے یکے بعد دیگرے مر گئے۔ بوڑھا اور بے سہارا ریمبرانت فاقہ کشی کی حالت میں بھی تصویر کشی کرتا رہا۔ ریمبرانت کا دوست اور ڈاکٹر فان لون ایک کتاب میں لکھتا ہے۔ "جب ریمبرانت مرا تو اُس کے گھر سے اتنے پیسے بھی نہ نکلے جن سے

اُسے دفن کرنے کے لیے ایک لکڑی کا تابوت بنوایا جا سکتا۔ چند پیشہ ور گورکن جو اُس وقت شراب کے نشے میں مدہوش تھے اُس کی لاش ایک عام کپڑے میں لپیٹ کر کسی غیر معروف قبرستان میں دفن کر آئے "

ڈھائی سو برس پیشتر ریمبرانت اسی گھر میں اپنی بیوی ساسکیا اور بیٹے ٹائٹس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ گھر کی پہلی منزل میں کھانے کے کمرے کی میز اور کرسیاں جُوں کی تُوں پڑی ہیں۔ وہ کرسی جس پر ریمبرانت شام کے وقت آرام کرتا تھا۔ دوسری منزل میں ایک چھاپہ خانہ ہے جہاں وہ تیزاب کے ذریعے تانبے پر نقش و نگار بنا کر کاغذ پر چھاپا کرتا تھا۔ چھاپہ خانے اور گھر کے دوسرے حصّوں میں ریمبرانت کے بنائے ہوئے خاکے ٹنگے ہیں جن میں سے چند ایک ادھورے ہیں۔

مَیں ریمبرانت کے گھر سے باہر نکلا تو بارش تھم چکی تھی۔ نہروں کے کنارے ایلم اور لائم درختوں کے تلے چلنے والے لوگ ابھی تک چھتریاں تانے ہوئے تھے۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا آتا تو درختوں کے پتوں پر جمع شدہ پانی لوگوں پر برس پڑتا۔ میونسپل میوزیم اور رائکس میوزیم کے درجنوں ہال کمروں میں سارا دن گھومنے سے میں تھک چکا تھا۔ اس لیے سرِ شام ہی واپس ہوٹل روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے ہال میں جوش پہلے روز کی طرح کھانے کے کاؤنٹر پر بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ وہ آج ایمسٹرڈیم کے مشہورِ زمانہ ہیروں کی تراش خراش کے کارخانے دیکھنے گیا ہوا تھا۔ مَیں نے مذاق سے پوچھا کہ سناؤ کوئی چھوٹا موٹا ہیرا بھی ہاتھ لگا یا نہیں؟ مُنہ لٹکا کر کہنے لگا کوشش تو بہت کی تھی لیکن وہ جوہری کمبخت نہایت کائیاں ہیں۔ فرش پر پڑے برادے اور کاغذوں کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ہر شام کام ختم ہوتے پر تمام کوڑا کرکٹ جمع کر کے ایک آہنی انگیٹھی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح کاغذ اور بُرادہ وغیرہ تو جل جاتا ہے اور تراش خراش کے دوران گم شدہ ہیرے کی کنیاں انگیٹھی کی تہ میں جُوں کی تُوں پڑی مل جاتی ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم میں ہالینڈ پر قبضے کے دوران میں نازیوں نے یہاں کی نوّے فیصد یہودی آبادی کو بڑی بے دردی سے تہ تیغ کر دیا۔ اُن میں ایک ننھی مُنّی لڑکی بھی تھی جس کے معصوم جسم میں موت زہریلی گیس کے دھوئیں کی صورت میں سرایت کر گئی۔ ہالینڈ میں ہٹلر کے منصوبے "آخری حل" کے تحت تمام یہودیوں کا باقاعدہ قتلِ عام شروع ہوا تو وہ ننھی لڑکی اور اُس کا خاندان جان بچانے کی خاطر اپنے مکان کی بالائی منزل کے کمروں میں رُوپوش ہو گئے۔ باہر سڑک سے یوں لگتا جیسے پُورا مکان خالی پڑا ہے لیکن اُن دو کمروں میں آس اور اُمید کے دِیے جلتے جن کی لَو بڑھانے میں وہ لڑکی سب سے آگے تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز نازی اُس کے پیارے شہر ایمسٹرڈیم سے باہر نکال دیے جائیں گے اور وہ ایک بار پھر آزادی سے اپنے گھر کے سامنے نہر کے کنارے سائیکل چلا سکے گی۔ وہ مکان کے پچھواڑے میں کُھلتی ہوئی کھڑکی سے باہر تکتی رہتی جہاں سے اُسے صرف نیلے آسمان کا ایک ٹکڑا اور درخت کی چند شاخیں نظر آتیں جن سے اُسے وقت اور موسموں کے تغیر و تبدل کا اندازہ ہوتا رہتا۔ شام ہوتی تو وہ ایک کونے میں لکڑی کے فرش پر بیٹھ کر موم بتّی کی مدھم روشنی میں اپنی ڈائری کے اوراق لکھتی۔ "شاید بہار کی آمد ہے۔ مَیں نے آج کھڑکی میں سے درخت کی شاخوں پر چند سفید کلیاں دیکھی ہیں۔"

"خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے۔ مَیں نے دو روز سے کُچھ نہیں کھایا۔ مجھے بے حد بھوک لگی ہے۔"

"آج سارے رات گھر کے باہر فٹ پاتھ پر جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز سُنائی دیتی رہی اور ہم میں سے کوئی بھی سو نہ سکا۔ آخر مجھ میں اور دُوسری چھوٹی لڑکیوں میں کیا فرق ہے جو نازی مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں؟"

ایک روز جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز باہر فٹ پاتھ کی بجائے مکان کی چوبی سیڑھیوں پر سنائی دی۔ اُس لڑکی کو اُس کے خاندان سمیت ایمسٹرڈیم کے دوسرے

یہودیوں کے ساتھ فوجی ٹرکوں میں بند کرکے ایک اجتماعی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ دوسری صبح اُس ننھی مُنّی لڑکی کو برہنہ کرکے ایک آہنی کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ اِس کمرے کے پچھواڑے میں کوئی کھڑکی نہ کھلتی تھی جہاں سے نیلا آسمان نظر آسکے۔ چھت کے سوراخوں میں سے سفید کلیوں کی بجائے زہریلی گیس کا سفید دُھواں نِکلا اور اُس کا نازک جسم گیس چیمبر کے چمکیلے فرش پر تڑپنے لگا۔ این فرینک مرگئی۔

جنگ کے اختتام پر این فرینک کا باپ جو نازیوں کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنے خاندان کی تلاش میں ایمسٹرڈیم واپس آیا۔ ویران مکان کے ایک کمرے میں این کی ڈائری کے اوراق بکھرے پڑے تھے۔ اُس نے چند دوستوں کی مدد سے "این فرینک کی ڈائری" کو شائع کروا دیا اور راتوں رات این فرینک ایک گمنام لڑکی سے یورپ میں یہودیوں پر ڈھائے جاتے والے نازی مظالم کی علامت بن کر اُبھری اور پوری دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ہم این فرینک کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ مکان جسے اب عجائب گھر کی شکل دے دی گئی ہے نہر کے کنارے پر واقع دوسرے مکانوں سے کسی طور مختلف نہ تھا سوائے دروازے پر آویزاں ایک چھوٹی سی تختی کے جس پر "این فرینک ہاؤس" کے الفاظ لکھے ہیں۔ ہم لکڑی کی بنی ہوئی تنگ سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے بالائی منزل پر چڑھنے لگے۔ اِنہی سیڑھیوں پر جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز نے این فرینک کو موت کا پیغام سنایا تھا۔ اِن کے کمرے کی کھڑکی اُسی طرح کھلی ہوئی تھی۔ باہر نیلا آسمان اور درختوں کی ہری بھری شاخیں نظر آرہی تھیں مگر اُن پر سفید کلیاں نہیں تھیں۔ موسم بہار گذر چکا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر اِن کے ہاتھوں اخباروں سے تراشی ہوئی تصاویر چسپاں تھیں۔ مجھے وہاں اُس چھوٹے سے ویران کمرے میں کھڑے ہوئے این فرینک کی بے بسی اور تنہائی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔

مکان کی پہلی منزل پر "این فرینک فاؤنڈیشن" کا دفتر ہے جس کی لائبریری میں این فرینک

کی ڈائری کے دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے ہوئے نسخے موجود ہیں۔ دیواروں پر این اور اس کے خاندان کی تصاویر آویزاں ہیں۔ فاؤنڈیشن کے ایک رُکن نے مجھے بتایا کہ اُن کا ادارہ ماضی میں کیے گئے مظالم کی تلافی حال میں ہونے والے مظالم کو روکنے کی صورت میں کر رہا ہے۔ اس کا ثبوت وہ پوسٹر اور تصاویر ہیں جو ویت نام میں امریکی مظالم کے بارے میں شائع کیے گئے ہیں۔ ادارہ اسی مکان کے پہلو میں "این فرینک ہوسٹل" بھی چلاتا ہے جہاں سیاح معمولی کرائے کی ادائیگی سے قیام کر سکتے ہیں۔ مَیں نے "ملاقاتیوں کے رجسٹر" میں اپنا نام و پتہ درج کیا اور چندے کے صندوق میں دو گلڈر کا سکّہ ڈال کر باہر آ گیا۔

مکان کے باہر شہر کی زندگی اُسی طرح رواں دواں تھی۔ نہر کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک کالے بالوں والی ننھی مُنّی لڑکی سائیکل چلا رہی تھی۔ اُس نے لکڑی کے بنے ہوئے ڈچ طرز کے "کلاگ" جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ میرے پاس سے گذری تو مَیں نے مُسکرا کر "ہیلو" کہا۔ اُس نے شرارت سے سائیکل کی تیز گھنٹی زور زور سے بجائی اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ "این فرینک کے بال بھی تو کالے تھے۔" مَیں نے سوچا۔

آج ایمسٹرڈیم میں میرا آخری دن تھا۔ مَیں دوسری صبح ہیگ اور برسلز سے ہوتا ہوا لنڈن جا رہا تھا۔ سینٹرل سٹیشن سے سفر کا ایڈوانس ٹکٹ خرید کر میں منٹ ٹاور کے قریب پھولوں کے بازار کی طرف چلا گیا جہاں سے شہر کی مختلف نہروں کی سیر کے لیے خوبصورت کشتیاں چلتی تھیں۔ مَیں نے کنارے سے ٹکٹ خریدا اور ایک کشتی میں سوار ہو گیا۔ شیشے کی چھت اور آرام دہ نشستوں سے مزیّن خوبصورت کشتی غیر ملکی سیاحوں سے پُر تھی۔ وُہ بھی میری طرح ایمسٹرڈیم کی نہروں کا حُسن قریب سے دیکھنے آئے تھے۔ انجن سٹارٹ ہوئے۔ ڈرائیور نے بھونپو بجایا اور ہم نہر کی پُرسکون سطح پر تیرنے لگے۔ کشتی کے سرے پر ہالینڈ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف نہر کے کناروں پر خوبصورت شاہ بلوط، چوڑے پتّوں والے ایلم اور لائم درختوں کی قطاریں

تھیں جن کے پیچھے ایمسٹرڈیم کے قدیم تاجروں کے شاہانہ مکان کھڑے تھے۔ اِن مکانوں کی قدیم وضع اور دیدہ زیب طرزِ تعمیر برقرار رکھنے کی خاطر عمارت میں کسی قسم کا ردّوبدل کرنا خلافِ قانون ہے۔ اکثر مکان اب تجارتی اداروں اور بینکوں کے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارا گائیڈ بے حد دلچسپ تھا۔ نہروں کے کنارے پر واقع تاریخی عمارتوں اور قدیم پُلوں کی نشان دہی کرنے کے علاوہ وُہ چھوٹے چھوٹے چٹکلے بھی بیان کرتا چلا جاتا۔

"خواتین و حضرات! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہالینڈ کے ایک باشندے پیٹر سٹائی وسن نے دریائے ہڈسن کے کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اسے نیو ایمسٹرڈیم کا نام دیا؟ بعد میں اِسے انگریزوں نے ہتھیا لیا اور اپنے شہر یارک کا نام دے کر نیویارک کردیا۔"

"ہم کینیڈا کی طرف سے وارد ہوجاتے تو اب اُس کا نام نیو پیرس ہوتا۔" ایک فرانسیسی بوڑھے نے خوش دلی سے کہا۔

"دائیں ہاتھ والے مکان میں لُوئی نپولین کا قیام تھا اور بائیں ہاتھ پر وُہ جگہ ہے جو آج سے پانچ سو سال قبل ایک اصطبل تھی۔"

"اوہ واقعی؟" ایک عورت نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔ "اور اب کیا ہے؟"

"اب بھی اصطبل ہے۔" گائیڈ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور یہ ہے وُہ کلیسا جس کی نقل پیرس میں کلیسائے نوٹرڈیم کے نام سے مشہور ہے۔"

فرانسیسیوں نے اس بے عزّتی پر خوب شور مچایا۔

"آپ اِن چار منزلہ مکانوں کو تو دیکھ ہی رہے ہیں جن کے کمروں کی چوڑائی منزل بہ منزل گھٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ پچھلی صدی کے ڈچ سوداگروں کے شاہانہ مکان ہیں۔ پہلی منزل پر بڑے کمرے میں گھر کا مالک اور اُس کی بیوی قیام پذیر ہوتے تھے۔ دوسری منزل جو نسبتاً چھوٹی ہے بچّوں کے لیے مخصوص تھی۔ تیسری منزل جس پر صرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے نوکروں کا کوارٹر تھا۔"

"اور آخری منزل پر کیا گھوڑے باندھتے تھے؟" ایک لمبے تڑنگے امریکی نے سیاحوں کو

محفوظ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"نہیں جناب" گائیڈ نے کہا۔ "چوتھی منزل کی چھوٹی کوٹھڑی سانس کو رکھنے کے لیے تھی"

"کس کی سانس؟ عورت کی یا مرد کی؟" ایک امریکی عورت نے تڑاخ سے پوچھا۔

"اگر امریکہ ہوتا تو یقیناً عورت کی سانس رکھی جاتی مگر ہم ترقی یافتہ ملک ہیں اس لیے یہاں مرد کی سانس کے رہنے کا انتظام تھا"

"اور یہ اوپر والی منزل پر لوہے کا کنڈا کیا سانس کو لٹکانے کے کام آتا تھا؟" ایک موٹے جرمن نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں" گائیڈ نے ہنس کر جواب دیا "اس کے ساتھ رسّا لٹکا کر سامان اُوپر چڑھایا جاتا تھا"

"شہر میں تقریباً ساڑھے چار سو نہریں اور اُن کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان نہروں پر ساڑھے پانچ سو پُل ہیں۔"

"باقی سو پُل کیا خشکی پر تعمیر کیے گئے ہیں؟" کسی نے نعرہ لگایا۔

"یہ وُہ پُل ہے جہاں سے بیٹلز نے چھلانگ لگائی تھی۔ پُلوں کے ساتھ آہنی کنڈوں والے لمبے بانس اس لیے رکھے گئے ہیں تاکہ اگر کسی صاحب کا ہیٹ، ہوا سے اُڑ کر نہر میں جا گرے تو بانس کی مدد سے نکالا جا سکے"

ہم یکے بعد دیگرے سات خوب صورت سجے سجائے پُلوں کے نیچے سے گذرے۔ ان سات پُلوں کو "سات بہنوں" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

"یہ پُل صرف لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ سامنے والے پُل کو "مریل پُل" کہا جاتا ہے کیونکہ معمار کا نام SKINNY یعنی "مریل" تھا۔ یہاں سے پورے شہر کا گندا پانی بحرالکاہل میں سے ہو کر امریکہ پہنچ جاتا ہے۔" امریکیوں نے اس بات کا بے حد بُرا منایا۔

اب شام ہو چکی تھی۔ نہروں میں چلتی ہوئی کشتیوں، درجنوں پُلوں، سوداگروں کے شاہانہ مکانوں اور شاہ بلوط کے درختوں میں نصب شدہ قمقمے ایک دم جل اُٹھے اور ہزاروں

جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کا عکس پانی میں جھولنے لگا۔ شہر کی نہروں کا چکر پورا کرنے کے بعد جب کشتی ہمیں واپس پھولوں کے بازار کے پاس لائی تو ایمسٹرڈیم کی سرمئی شام گہری رات میں ڈھل چکی تھی اور ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ مَیں کشتی سے اُترا اور ٹرام میں سوار ہونے کی بجائے پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایمسٹرڈیم میں یہ میری آخری شام تھی۔ مَیں نے ایک پُل پر سے نیچے جھانکا۔ دودھیا چاندنی کی تہ آسمانوں سے اُتر کر ایمسٹرڈیم کی نہروں پر بچھ گئی تھی۔ لائم درختوں کے سُرخ پتّے اور زرد کلیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ مَیں پُل کے ساتھ سیڑھیوں سے اُتر کر نہر کے کنارے چلا گیا اور جُھک کر شفّاف پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ زرد کلیوں کا ایک گچھا بہتا ہوا آیا اور میری اُنگلیوں میں اٹک گیا۔ مَیں نے کلیوں کو بھینچ لیا اور پانی سے نکال کر اپنے گالوں کو چُھوا۔ اِن میں خوشبو تھی۔ خوشبو خوبصورتی کی جو ایمسٹرڈیم میں تھی۔ خوشبو حُسن کی جو میری نظر میں تھا۔

"جب موسمِ بہار کا آغاز ہوگا مَیں ایک مرتبہ پھر
اپنی محبوبہ کے لیے ایمسٹرڈیم سے گُلِ لالہ لے کر آؤں گا
ہاں ! ایک محبت بھرے دِل کا تحفہ
مَیں تمہارے لیے ایمسٹرڈیم سے گُلِ لالہ لے کر آؤں گا۔"
(ایک ڈچ لوک گیت)

شہرِ بے مثال ۔ لنڈن

ایمسٹرڈیم کے سنٹرل سٹیشن سے ہیگ تک کا فاصلہ تیز رفتار ٹرین نے صرف پینتالیس منٹ میں طے کر لیا۔ میں سٹیشن پر اپنا سامان رکھ کر شہر کی سیر کو نکل گیا۔ یورپ والوں کا یہ کہنا بالکل دُرست ہے کہ ہیگ یورپ کا سب سے بڑا قصبہ ہے اور اس کے باشندے کچھ نہ کرنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں "قصرِ امن" جہاں عالمی عدالت کا اجلاس ہوتا ہے شہر کی واحد قابلِ ذکر عمارت ہے۔ پورا دن ہیگ میں گزارنے کے بعد میں شام کی گاڑی سے بلجیئم روانہ ہو گیا۔ راستے میں روٹرڈیم کا شہر آیا ہے جسے دوسری جنگِ عظیم میں مکمل طور پر تباہ ہونے کے بعد از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ برخٹ سے گزر کر ہم بلجیئم کے صدر مقام برسلز میں پہنچے جسے یورپ کے بدصورت ترین شہر کا خطاب ملنا چاہیئے۔ رات کے ساڑھے دس بجے ہم بلجیئم کی بندرگاہ آسٹنڈ پر پہنچ گئے جہاں سے انگلستان کی بندرگاہ ڈوور کے لیے سٹیمر چلتے ہیں۔ بلجیئم کے کسٹم سے فارغ ہو کر ہم ایک بجے چلنے والے سٹیمر میں سوار ہو گئے اور رات کی تاریکی میں رودبارِ انگلستان عبور کر کے صبح ساڑھے چار بجے ڈوور پہنچ گئے۔ اگرچہ آج کل اکثر پاکستانیوں

کو انگلستان میں داخلے کے لیے بیشمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن خلافِ توقع برطانوی کسٹم کے حکام میرے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور بغیر کسی تردد کے میرے پاسپورٹ میں انگلستان میں چھ ماہ قیام کا پروانہ لکھ دیا۔ کسٹم ہاؤس کے پہلو میں ڈوور کا ریلوے سٹیشن ہے جہاں لنڈن جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں آج کئی برسوں کے بعد پھر انگلستان کی سرزمین پر کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ ڈوور کا وہی پرانا اور گہر آلود سٹیشن جہاں سے میں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں یورپ کی سیر کو جایا کرتا تھا، وہی آرام دِہ اور قدامت کی بُو سے رچی ہوئی گاڑی اور نیلی وردی میں ملبوس کائیں ریلوے گارڈ۔ ہماری گاڑی جب ڈوور سے نکلی تو سورج کی پہلی کرنیں انگلستان کے ہرے بھرے کھیتوں اور خوابیدہ قصبوں کو روشن کر رہی تھیں۔

وکٹوریہ سٹیشن کے باہر کھڑی ہوئی لاتعداد ٹیکسیوں اور کاروں کے ہجوم سے نکل کر جب میں سڑک پر آیا تو لنڈن ابھی تک پچھلی شب کے ہنگاموں کے بعد میری طرح نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ دُودھ تقسیم کرنے والی لاریوں اور سڑکیں صاف کرنے والے ٹرکوں کے علاوہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ لنڈن میرے لیے اجنبی شہر تھا۔ میں جانتے پہچانے راستوں کو ماپتا ٹرافلگر سکوئر میں آگیا۔ صبح کی ہلکی دُھوپ ابھی تک چوک کے وسط میں ایستادہ بلند و بالا ستون کی چوٹی پر اکڑوں کھڑے لارڈ نیلسن کی ترچھی ٹوپی تک ہی آئی تھی۔ ٹرافلگر سکوئر کے مشہورِ زمانہ کبوتر بھی شاید ابھی تک نیشنل گیلری کے یونانی ستونوں اور سینٹ پال گرجا کے گنبد میں محوِ خواب تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ٹورسٹ آفس کھلنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے اور جب تک سیاحوں کا یہ خضرِ راہ دکھانے کے لیے ہاتھ نہ تھامے لنڈن جیسے شہر میں قیام و طعام کا مسئلہ حل نہ ہو سکتا تھا۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے متواتر سفر سے خاصا تھک چکا تھا۔ میں نے بڑے فوارے کے سامنے ایستادہ ایک بنچ پر اپنا سامان رکھا اور وہیں لیٹ گیا۔ فوارے کے وسط میں ایک دیوزاد مچھلی کا مجسمہ گلپھڑے

پھیلائے منہ سے گیلنوں پانی اُگل رہا تھا۔ مجھے استنبول میں کانسطنطائن کے زیرِ زمین آبی محل کی گول گول آنکھیں مٹکاتی مچھلیاں یاد آگئیں۔ شٹراپ انسٹراپ! جانے کب میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مندروں کی سُریلی گھنٹیوں اور ڈھولکیوں کی تھاپ کے سنگ بھجن گانے کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ "ہری اوم" ایک آواز آئی۔ مندر میں ہزاروں سُندر اور کومل من موہنی داسیاں محوِ رقص تھیں۔ "ہری کرشنا" ایک اور آواز آئی۔ پائل کی جھنکار نے میرے نیم خوابیدہ ذہن کے دروازوں پر چھن چھن دستک دی۔ یا وحشت! میں نے لیٹے لیٹے سوچا۔ یہ لندن کی بجائے کہیں بنارس میں ورُود تو نہیں ہوگیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو کسی کائیاں ہندو پجاری کی بجائے میرے بنچ کے سرے پر ایک بوڑھا انگریز ہاتھ میں صبح کا اخبار تھامے اپنا پوپلا منہ نیم وا کیے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

"صبح بخیر" اس نے اپنا بوسیدہ ہیٹ سر سے اُٹھا کر کہا "ہری اوم۔ ہری کرشنا تمہارے ہم وطن ہیں شاید" اور نیشنل گیلری کے سامنے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا جہاں سے موسیقی اور بھجن الاپنے کی صدائیں آرہی تھیں۔ پانچ انگریز لڑکے اور دو لڑکیاں ہندو براہمنوں اور مندروں میں رقص کرنے والی داسیوں کا رُوپ دھارے فٹ پاتھ پر ناچ رہے تھے۔ لڑکوں کے سر سوائے براہمنوں کی روائتی چُٹیا کے مکمل طور پر منڈھے ہوئے تھے۔ ان بہروپیوں نے سفید دھوتیاں اور کھڑاویں پہن رکھی تھیں اور ہاتھوں میں گھنٹیاں اور گلے میں ڈھولکیاں لٹکا رکھی تھیں جنہیں وہ ایک ایک کر بڑے بے سُرے انداز میں بھجن الاپتے ہوئے بجا رہے تھے۔ آگے آگے ایک حسین اور متناسب جسم کی پستہ قد لڑکی صرف دھوتی میں ملبوس، شانوں پر بال بکھرائے۔ ماتھے پر تلک جمائے مندروں کے رقص کی ایک بھدی نقل کر رہی تھی۔ ڈھولکی پر تھاپ پڑتی تو دُودھیا باہیں فضا میں بلند ہو جاتیں اور وہ ہندوستانی رقص فراموش کر کے خالصتاً مغربی انداز

میں "بندر ناچ" ناچنے لگتی۔ دوسری لڑکی ہاتھ میں پیتل کی گڈوی لیے اس تماشے کو دیکھنے والے ہجوم سے چندہ مانگ رہی تھی" لنڈن کے ہندو مندر کے لیے چندہ دیجئے۔ ہری اوم" وہ کہہ رہی تھی۔ میں بھی بنچ سے اٹھ کر اس جلوس کے ساتھ ہولیا۔ لڑکی میری طرف آئی اور گردن کو ہلکا سا بل دے کر اپنے کٹے ہوئے بال اک ادا سے جھٹکے اور بولی" مندر کے لیے چندہ۔"

"میں تو مندر ڈھانے والے قبیلے کا فرد ہوں" میں نے شرارت سے کہا" ہاں البتہ تم جیسی حسین داسی اس مندر میں ہو تو ..." اور اس کی نیلی نیلی کاجل بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے وقوفوں کی طرح مسکرانے لگا۔ لڑکی نے غصے سے پھر اپنے بال جھٹکے اور میرے ساتھ کھڑے ہوئے امریکی سیاح کے آگے دستِ سوال دراز کر دیا۔

"شوَر ہنی" (Sure Honey) بے شمار کیمروں سے لدے پھندے امریکی نے لڑکی کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر اپنی جیکٹ کی لاتعداد جیبیں باری باری ٹٹولیں اور آخر کار دس شلنگ کا ایک نوٹ گڈوی میں ڈال دیا۔

یکدم مجھے یاد آیا کہ میرا سامان ابھی تک بنچ پر پڑا ہے کہیں وہ بوڑھا انگریز اسے لے کر چمپت ہی نہ ہو جائے۔ میں جلدی سے واپس آیا تو میرا سامان جوں کا توں پڑا تھا اور بوڑھا اپنا اخبار پڑھنے میں محو تھا۔ میں نے سامان کندھے پر اٹھایا اور سڑک پار کر کے پکاڈلی کی طرف چل دیا جہاں ریجنٹ سٹریٹ میں ٹورسٹ آفس واقع تھا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آفس کھلنے میں ابھی چند منٹ باقی ہیں۔ باہر فٹ پاتھ پر بیشتر سیاح دفتر کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پورے نو بجے دروازہ کھلا تو لوگ بھیڑوں کی مانند اندر گھس گئے اور جو میری طرح شرافت کے آداب کی خاطر تواضع میں مصروف رہے وہ باہر فٹ پاتھ پر ہی کھڑے رہ گئے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی اور سیاحوں کے جم غفیر میں کوئی کمی نہ آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اندر ٹورسٹ آفس نہیں بلکہ گردوارہ صاحب ہے جہاں کڑاہ پرشاد تقسیم کیا جا رہا ہے

خدا خدا کر کے میری باری آئی اور میں نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی لڑکی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"مجھے تقریباً دو ہفتوں کے لیے ارزاں قسم کی رہائش درکار ہے۔"

"تقریباً کتنی ارزاں؟" لڑکی نے بے دلی سے پوچھا۔

"یہی کوئی دس شلنگ روزانہ"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کر اے فقیر لندن میں دھرم شالے نہیں ہوتے اور پھر میز پر پنسل بجا کر بولی "ناممکن۔ ہاں البتہ ایک پاؤنڈ اور دس شلنگ شاید۔"

"توبہ! توبہ!" میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "بی بی اللہ میاں کو جان دینی ہے کیوں غریبوں کا خون کرتی ہو۔" بی بی میرا وعظ سنے بغیر میرے پیچھے کھڑے سیاح کے ساتھ پینگیں بڑھانے لگی اور میں باہر چلا آیا۔

"سن بیری بلم سچ بول رے اب کیا ہو گا؟" میں نے دل سے سوال کیا۔ "اب کیا ہونا ہے مؤرکھ؟" دل نے کھٹ سے جواب دیا "سو جانا رات کو ہائڈ پارک میں اور چلے جانا صبح سویرے فرانس کے شہر پیرس میں جہاں رہتی ہے ایک شہزادی...."

دل صاحب نے کچھ بے پر کی ہانکنی شروع کر دی۔ میں نے بڑی مشکل سے چپ کرایا اور آلتی پالتی مار کر ریجنٹ سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اب میں منہ کھولے راہ چلتے لوگوں کو تک رہا تھا کہ ہے کوئی سخی بابا جو لندن شہر میں رہائش کا بندوبست دس شلنگ میں کروا دے۔ یکایک میرے ذہن میں وحید چغتائی کا نام ابھرا جس کے ساتھ پاکستان میں ایک دعوت کی موقع پر مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے سیاحت کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو کہنے لگا، بادشاہو اگر لندن سے گزر ہو تو ضرور ملیے گا۔ اور مجھے اپنا فون نمبر لکھ دیا۔ میں نے جھٹ ڈائری جیب سے نکالی اور فٹ پاتھ پر لگے فون بوتھ سے چغتائی کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو! چغتائی بول رہا ہوں۔"

"السلام علیکم چغتائی صاحب" میں نے صاحب پر زور دیتے ہوئے کہا "میں مستنصر بول رہا ہوں۔"

"کون مستنصر؟" اُدھر سے آواز آئی۔ وہ یقیناً ہماری مختصر ملاقات بھول چکا تھا۔ "اجنبیوں پر بارِ خاطر بننے کی بجائے ہائیڈ پارک میں سو جانا" دل نے پھر ٹانگ اڑائی۔ میں نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا "دو سو قبل مال کے ایک ریستوران میں فلاں صاحب کی دعوت میں۔ میز کے سرے پر بیٹھا ہوا لڑکا۔ موٹی موٹی آنکھوں والا ...."

دوسری طرف زبردست قہقہہ بلند ہوا "ٹھیک ٹھیک۔ کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ریجنٹ سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر" میں نے گھبرا کر کہا اور اس سے قبل کہ میں عاجزی سے اپنا مدعا بیان کرتا چونگے میں سے "ابھی آیا" کا نعرہ بلند ہوا اور فون بند ہو گیا۔ میں وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں شام کا سرمئی اندھیرا ہر سُو پھیلا اور ریجنٹ سٹریٹ اس کے پہلو میں آکسفورڈ سٹریٹ سامنے شافٹسبری ایوینو اور ان سڑکوں کے درمیان مشہورِ زمانہ پکاڈلی سرکس کے گرد لاکھوں روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ پکاڈلی کے درمیان ایروز کے مجسمے کے گرد آج سے چند برس پیشتر پھول بیچنے والی موٹی عورتیں "FLOWERS MY LOVE" کی صدائیں لگاتی تھیں اب لاتعداد ہپیوں کی آماجگاہ تھی۔ سوہو کو نکلتی ہوئی سڑک کے کنارے گینس بیسٹر کے نیون سائن کے عین نیچے ہپیوں کی مشہور دکان "میں لارڈ کچنر کا ذاتی ملازم تھا" واقع ہے جہاں فلمی اداکاروں کی قدِ آدم تصاویر، تسبیاں منکے، گھنٹیاں اور ہندوستانی کُرتے فروخت ہوتے ہیں۔ "سوان اینڈ ایڈگر" اور "آسٹن ریڈ" کے مشہور سٹورز کے شوکیس اتنی نفاست سے سجے تھے کہ ہر راہ گیر کے پاؤں جکڑے جاتے۔ لنڈن کے کوچہ و بازار خلقت سے ٹھسے پڑے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے کے انتظار کے بعد پکاڈلی کے زیرِ زمین ریلوے سٹیشن سے چغتائی صاحب برآمد ہوئے۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ دراز قد، خوش شکل و خوش لباس چغتائی لوٹے ہجوم

میں ممتاز نظر آرہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور پھر مجھ پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر دوسری جانب نکل گیا۔ میں سامان چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگ نکلا اور آسٹن ریڈ کے پاس جا لیا خلافِ توقع بے حد گرمجوشی سے ملا۔ کہنے لگا "لاہور کے مستنصر اور لندن کے مستنصر میں بہت فرق ہے۔ تمہارے بڑھے ہوئے بالوں اور بے ترتیب کپڑوں نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔" اس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور ہم دونوں بس پر سوار ہو کر لنڈن سے تقریباً دس میل باہر سٹریتھم کے علاقے میں اُتر گئے جہاں اس کا فلیٹ تھا۔

چغتائی کے چھوٹے سے فلیٹ پر اچھے خاصے عجائب گھر کا گمان ہوتا تھا۔ پاکستانی دستکاریوں کے نمونے۔ مغل مصوری کے مختصر شاہکار، رنگوں کے ڈبے اور خالی بوتلیں۔ ایک کونے میں مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر سے مزین "مرقعِ چغتائی" کے چند نسخے تہ در تہ رکھے تھے۔ وحید اس مایہ ناز مصور کا بھتیجا ہے اور مرقعِ چغتائی میں شامل تمام تصاویر اُسی کی زیرِ نگرانی لنڈن میں طباعت ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ عرصہ اپنے چچا کے سٹوڈیو میں مصوری کی تعلیم بھی حاصل کی مگر چند مجبوریوں کی بنا پر اسے لنڈن آنا پڑ گیا جہاں برش اور پنسل جیسی لطیف اشیاء تھامنے والے ہاتھ اب ایک اُداس اور زنگ لوہے کی فیکٹری میں بھاری بھر کم ہتھوڑے کے وار کرتے ہیں۔

شام کے کھانے کے بعد چغتائی نے اپنے وکٹورین طرز کے آہنی پلنگ کے نیچے سے ایک فولڈنگ چارپائی نکالی اور کھول کر چند غیر مکمل تصاویر کے اوپر بچھا دی۔ آئندہ دو ہفتوں کے لیے یہ میرا بستر تھا۔

صبح آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے اور چغتائی اپنے کام پر جا چکا تھا۔ میز پر ایک رقعہ پڑا تھا "ناشتہ باورچی خانے میں، شام چھ بجے لیسٹر سکوئر میں ملاقات ہو گی۔" گیس کے چولہے کے پہلے حصے میں رکھے پراٹھے اور انڈے ابھی تک گرم تھے اور فلاسک میں سے تازہ کافی کی

اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی، ناشتے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور ایک سُرخ ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہو کر کینسنگٹن اُتر گیا۔ آج دھوپ چمک رہی تھی۔ بگ بین گھنٹہ گھر اور برطانوی پارلیمنٹ کی عمارات کے سامنے والے باغوں اور دریائے ٹیمز کے کنارے بے شمار لوگ بنچوں پر بیٹھے یا گھاس پر اوندھے لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ میں بگ بین سے بائیں ہاتھ مُڑ کر سیدھا ٹرافلگر سکوائر میں چلا آیا جس کی عمارتیں آج سے چند برس پیشتر لندن کے دھوئیں اور کہر کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو چکی تھی مگر اب انہیں کھرچ کر ایک بار پھر صاف ستھری اور خوبصورت بنایا جا رہا ہے۔

میں پورے آٹھ سال بعد لندن آیا تھا۔ اُن دنوں یہ شہر ایک نک چڑھی سجی سجائی بڑھیا کی مانند تھا جس کے بیش قیمت گہنے آئے دن اُس کے محکوم ملکوں کے حریت پسند نوچ کر لے جاتے۔ یہ گہنے اُن غلام قوموں کے خون پسینے کا ثمر تھے جو اس بوڑھی حرافہ نے تہذیب کے نام پر ہتھیا لیے تھے۔ ہر گہنے کے چھننے پر یہ بڑھیا بُری طرح جھنجلا اُٹھتی اور اس کی یہ جھنجلاہٹ اُسے ایک نخوت اکھڑ عفریت کا رُوپ دے دیتی۔ مگر اب اس بڑھیا نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ شاندار ماضی کی یاد اب صرف قدیم شراب خانوں میں اونگھتے ہوئے بڈھے کھوسٹ انگریزوں کے دل میں ہی باقی ہے ورنہ نئی نسل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُن کو تو جدید فیشن کے ٹھاٹ باٹ۔ مشرقی موسیقی اور منشیات سے لگاؤ ہے۔ کہاں وہ دن کہ انگریز یورپ بھر میں لباس کے معاملے میں سب سے کورذوق واقع ہوتے تھے۔ لڑکوں کے بدوضع اوڈی کوٹ اور لڑکیوں کے کسے ہوئے لباس دیکھ کر غیر ملکی ناک بھوں چڑھاتے "کیا یہی ہے انگریز کی روایتی خوش پوشاکی؟ ایک ڈھیلے ڈھالے شکن آلود سوٹ کے ساتھ ایک مہینوں استعمال شدہ گندی اور بدبودار قمیض پر ہر روز کاغذ کا بنا ہوا سفید کالر لگا لیا اور بس!" اور پھر کہاں یہ وقت کہ لندن کی جون ہی بدل چکی ہے۔ ڈبل ڈیکر بس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نظریں جھکا لینی پڑتی ہیں مبادا آپ کے آگے آگے چڑھتی ہوئی

محترمہ کی منی سکرٹ رتّی بھر اور نہ پھسل جائے۔ لنڈن میں فیشن کے موجدوں نے کپڑے کے رنگ اور وضع کو بالائے طاق رکھ کر صرف خوبصورت اور دل کو لبھانے والے ملبوسات تیار کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا ہے۔ یورپ میں کہیں چلے جایئے لڑکے لڑکیاں آہ بھر کر کہتے ہیں کہ آج کل تو لنڈن جھول رہا ہے۔ (London is Swinging) اور کارن بی سٹریٹ کے نام پر تو اکثر لوگ مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ میرا رُخ اسی کارن بی سٹریٹ کی طرف تھا جو اب روم اور پیرس کی بجائے دُنیا بھر کے نئے فیشنوں کا مرکز ہے۔

کارن بی سٹریٹ ایک سیدھی سادھی تنگ سی گلی ہے جس کے دونوں طرف جدید ترین فیشن کے ملبوسات کی گنی چُنی دکانیں ہیں۔ ہر دکان کا مالک وہاں بکنے والے ملبوسات خود ڈیزائن کر کے اپنے درزیوں سے سلواتا ہے اسی لیے ہر دُکان پر بکنے والا لباس اس دُکان کی خصوصی کاٹ اور طرز کا حامل ہوتا ہے جو ہمیشہ منفرد ہوتی ہے۔ انگلستان کے لوگ جو اب تک خود کار مشینوں پر تھوک کے بھاؤ سلے ہوئے کپڑے پہن پہن کر لباس میں انفرادیت سے بے نیاز ہو چکے تھے اب کارن بی سٹریٹ کے طفیل بے حد خوش پوشاک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس دُکان کا نام "ہِز اینڈ ہَر (His & Her)" ہے وہ سامنے " لارڈ اینڈ لیڈی (Lord & Lady) " نظر آ رہی ہے جہاں پچھلے دنوں جیکی اوناسس چوری چھپے کپڑے خریدنے آئی تھی اور اس طرف " ہی اینڈ شی (He & She)" واقع ہے کارن بی سٹریٹ اب فیشن کا ایک ایسا مرکز بن گیا ہے جس کی قینچی کی ہر کاٹ پر روم۔ پیرس اور برلن کی نظریں لگی ہیں۔ آج منی ہے تو کل مِڈی اور پھر میکسی کا دَور دورہ ہے۔ اُدھر کوٹ کا کالر ایک انچ چوڑا ہو چکا ہے اِدھر پتلون کا پائنچہ ۱۵ سے ۱۶ ہونے والا ہے۔ غرض کہ یہ ننھی سی کارن بی سٹریٹ فیشن کی جنگ کا وار آفس (War Office) ہے جہاں سے پوری دنیا کو ہر نئی چال اور داؤ پیچ سے باخبر رکھا جاتا ہے۔

دوپہر کا کھانا میں نے سوہو کے وِنڈمِل تھیٹر کے پہلو میں واقع ایک پاکستانی ہوٹل میں کھایا۔

لنڈن میں چینی اور فرانسیسی خوراک کے ساتھ ساتھ پاکستانی غذا بھی بیحد پسند کی جاتی ہے اور یہاں سینکڑوں ایسے ریستوران موجود ہیں جہاں پان اور پاپڑ سے لے کر تندور کی گرم روٹی تک دستیاب ہے چغتائی شام کے پورے چھ بجے لیسٹر سکوئر کے اوڈین سینما کے باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق پورے شہر کو سُرخ رنگ میں رنگنے کے موڈ میں تھا لیکن میں تمام دن کی آوارہ گردی سے تھک چکا تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ صرف فلم دیکھنے پر ہی اکتفا کیا جائے۔ انگمار برگمین کی تازہ ترین فلم (Shame) دیکھ کر جب ہم باہر نکلے تو لنڈن اپنے پورے جوبن پر تھا۔ لیسٹر سکوئر کے فٹ پاتھ پر اک ہجوم بے کراں تھا جس کے لیے چوک کے چاروں طرف بنے ہوئے لاتعداد قہوہ خانے اور شراب خانے ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ ہم وہاں سے ٹرافلگر سکوئر کی طرف نکل گئے۔ نیشنل گیلری کے فٹ پاتھ پر جہاں صرف ایک روز قبل ہری رام ہری کرشنا کا ورد ہو رہا تھا ایک باریش انگریز مصوّر زمین پر چند تصویریں رکھے کسی قدر دان کی راہ تک رہا تھا۔ میں اور چغتائی وہاں کھڑے ہو کر قدیم لیمپ پوسٹ کی ناکافی روشنی میں تصویریں دیکھنے لگے۔

"اِس تصویر میں ہلکے رنگ کی بجائے گہرا سبز زیادہ تاثر چھوڑتا" چغتائی نے بے دھیانی میں ایک تصویر اُٹھائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"فیکٹریوں میں کام کرنے والے جاہل پاکستانیوں کو مصوّری کے بارے میں کیا علم ہو سکتا ہے۔" انگریز مصوّر نے چغتائی کے ہاتھ سے تصویر چھین لی اور بڑی حقارت سے کہا۔

"سوری" چغتائی روہانسا ہو گیا۔

اُدھر میرا پارہ ایکدم چڑھ گیا "چرس کے نشے میں ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر تم اپنے آپ کو مصوّر سمجھنے لگتے ہو۔ جسے تم نے جاہل پاکستانی کہا ہے وہ خود ایک مصوّر ہے اور اس کے چچا۔۔۔۔"

"میں اب بھی کہتا ہوں کہ تم جاہل ہو اور فیکٹریوں میں کام کر کے ہماری دولت لوٹتے ہو۔"

وہ ہر لفظ آہستہ آہستہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا جیسے اسے بیحد لُطف آ رہا ہو۔

" دولت ہم لوٹتے ہیں " میں پھٹ پڑا " تمہاری ملکہ کے تاج میں جڑے ہیروں سے لے کر سامنے نیشنل گیلری کے ستونوں میں لگے پتھروں تک میں ہمارے خون اور پسینے کی مہک ہے "

" بادشاہو جانے دو " چغتائی نے مجھے ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا " یہاں تو روز ایسے جھگڑے ہوتے ہیں "

" اس قسم کے مچر بحث سے نہیں چابک سے سیدھے ہوتے ہیں " میں نے پیچھے مُڑ کر زور سے کہا۔ " جاہل پاکستانی ۔ کالے پاکستانی " وہ انگریز مصوّر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

سٹریتھم کو واپسی پر بس میں بیٹھے ہوئے چغتائی نے بتایا کہ وہ اس قسم کے جھگڑوں سے ہمیشہ پہلو بچاتا ہے وہ تو شکر ہے کوئی پولیس والا اُدھر نہیں آنکلا ورنہ ہم دونوں نقصِ امن میں دھر لیے جاتے " ویسے غلطی میری بھی تھی جو اس کی تصویر پر تنقید کی " اس نے کندھے جھٹک کر کہا۔

" لیکن دوست میں نے تمہاری تصویریں دیکھی ہیں ۔ تم اس بن مانس کے بچے سے یقیناً بہتر مصوّر ہو " میرا پارہ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔

" تم غلطی پر ہو ۔ وہ مجھ سے کہیں بہتر مصوّر ہے کیونکہ یہ اس کا اپنا ملک ہے ۔ میں اجنبی ہوں ۔ لوگ اس کی تصویریں خریدتے ہیں ۔ یہاں آکر پہلے پہل میں نے بھی اپنے فن کو ذریعۂ معاش بنانے کی کوشش کی مگر لوگ میرا مشرقی چہرہ دیکھ کر ہی فیصلہ صادر کر دیتے " عورت کی آنکھیں اتنی لامبی کیوں ہیں اور گردن . . . " جب فاقوں پر نوبت آئی تو فیکٹری میں مزدوری کر لی ۔ اب کبھی کبھار مصوّری کا جنون سر پر سوار ہوتا ہے تو پہروں برش ہاتھ میں لیے کینوس کے سامنے بیٹھا رہتا ہوں ۔ دماغ میں فیکٹری کے ذہین کی بھٹیوں اور مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں آتا " اس کے لہجے میں شکست کے ریزے تھے۔

" بادشاہو جانے بھی دو " میں نے اُس کا پسندیدہ تکیہ کلام دُہرایا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر مُسکراہٹ پھیلنے لگی۔

آج صبح لنڈن میں آوارہ گردی کے دوران میں مجھے اوول کے قریب رہائش کے لیے ایک صاف ستھرا کمرہ مل گیا تھا۔ میں نے فلیٹ پر پہنچ کر چغتائی سے ذکر کیا۔

"میں صبح وہاں شفٹ کر جاؤں گا۔ مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ"

"بادشاہو جانے دو" اس نے کمبلوں کی تہ میں گھستے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"لیکن میں تو پیشگی کرایہ بھی ادا کر چکا ہوں"

"کہہ جو دیا جانے دو" اس نے ہنس کر کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

"ساؤتھ اینڈ آن سی" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سمندر کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو لنڈن سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب پہلی مرتبہ انگلستان آیا تو زیادہ عرصہ اسی ساحلی قصبے میں گزرا۔ آج میرا ارادہ اسی قصبے کو جانے کا تھا۔ ماضی میں گزرے ہوئے ایک حسین دور کی نشانیوں کی تلاش اور حال سے تقابل۔ ساؤتھ اینڈ کے لیے بجلی کی تیز گاڑی لنڈن کے لورپول سٹیشن سے چلی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے قصبے آتے۔ میں کھڑکی سے سر نکال کر سٹیشن کا نام پڑھتا تو ذہن میں یادیں زنجیر ہلا دیتیں۔ اس قصبے سے پرے ایک قدیم قلعہ کے کھنڈروں میں ہم پکنک منانے آیا کرتے تھے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی ندی تھی جہاں ہم مچھلیاں پکڑنے آتے تھے ایک سٹیشن پر گاڑی دیر تک رکی رہی۔ تمام مسافر اتر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد گارڈ آگیا "کیا یہیں بیٹھے رہیئے گا۔ ساؤتھ اینڈ آخری سٹیشن ہے۔"

"ساؤتھ اینڈ؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر باہر دیکھا۔ سٹیشن سے پرے درجنوں جدید اور بلند عمارتیں کھڑی تھیں۔ مجھے آج سے آٹھ برس پیشتر کا یہی سٹیشن یاد آگیا، گاڑی رکتی تو ہرے بھرے درختوں کی باس اور سمندر کی سیلی خوشبو کے تھپیڑے آتے، میں سٹیشن سے باہر آیا تو ہر چیز بدل چکی تھی۔ ہائی سٹریٹ میں ٹریفک بند کر کے پوری سڑک کو پارک میں بدل دیا گیا تھا۔

"سورنٹو" کا رومانی قہوہ خانہ اب ایک گندا اور پُرہجوم ہوٹل تھا جہاں اُبلے ہوئے آلو اور مچھلی بک رہی تھی۔ میں ماضی کو کُریدتا ایک کونے میں جا بیٹھا اور کافی کا آرڈر دیا۔ اسی دروازے سے میں اور سکھدیپ قہوہ خانے میں داخل ہوتے تو وہاں بیٹھے لوگ دم سادھ لیتے۔ سکھدیپ کی پگڑی پر ٹکا ہوا نگدار شیشے کا ٹکڑا ہیرے کی طرح چمک رہا ہوتا۔ جینس کے سنہرے بال اُس تاریک کونے میں چمک رہے ہوتے۔ جب کبھی جیب خالی ہوتی تو ہم قہوہ خانے کی اُدھیڑ عمر مگر حسن لکھ ویٹرس کی تعریفیں کرنا شروع کر دیتے۔ "جُون! آج تو تم پچاس سے ایک سال بھی اوپر کی نہیں لگ رہیں۔" اور وہ ہمیں کافی کے ساتھ چپکے سے درجنوں سینڈوچ بھی دے جاتی جن کا اندراج بل میں معجزانہ طور پر غائب ہوتا۔ میں سمندر کے کنارے گھومتا رہا لیکن کوئی آشنا صورت نظر نہ آئی۔ اس ساحل پر میرے لیے چلنا دُشوار ہوتا تھا۔ ہر قدم پر کسی واقف کار سے میل ہو جاتا۔ کتابوں کے سٹال سے بوڑھا فرینک ہمیشہ نعرہ لگاتا "مُستنصر پیارے تین ہفتوں سے اخبار کے پیسے نہیں آئے۔" "دنیا اُمید پر قائم ہے۔" میں مُسکرا کر کہتا اور آگے بڑھ جاتا۔ چھوٹی پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے باغوں کے تمام مالی میرے واقف تھے۔ وہ مجھے آتش برگ اور بلیک پرنس گلاب کی نوخیز کلیاں دکھاتے، اور آج میں اپنے ہی وطن میں اجنبی تھا۔ کالج کے ایک اُستاد کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ مدت ہوئی وہ مر چکا ہے اس کی ننھی مُنّی لڑکی پینی جسے میں سورنٹو میں آئس کریم کھلایا کرتا تھا اب دو بچوں کی ماں ہے اور سوئٹزرلینڈ میں رہتی ہے۔ اُس کی بیوی ایک اُداس اور تاریک گھر میں زندگی کے آخری لمحے گزار رہی ہے۔ اُس گھر میں جہاں کرسمس کی شام کو سارا کالج مدعو ہوتا اور یوں لگتا جیسے یہ ہنگامہ رہتی دنیا تک جاری رہے گا، اپنی پرانی لینڈ لیڈی کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا وہاں اب ایک جدید مکانی سکریپر کھڑا ہے۔

"کیا صرف آٹھ سال کے عرصے میں اتنے انقلاب رُونما ہو سکتے ہیں۔" میں نے اُداس ہو کر سوچا۔ مجھے احساس ہوا کہ ماضی کی مسرتیں تلاش کرنا کتنی بڑی بیوقوفی ہے۔ میں دوپہر سے

پہلے واپس لنڈن لوٹ آیا۔

بورپول سٹریٹ سے زیرزمین گاڑی میں سوار ہو کر میں ایک مرتبہ پھر لنڈن کے مرکز پکاڈلی سرکس میں چلا آیا جہاں ایروز کے مجسّمے کے گرد سیڑھیوں پر بے شمار ہپی براجمان تھے۔ یہ جگہ سستانے کے لیے بہترین تھی چنانچہ میں بھی ان کے درمیان بیٹھ گیا اور اپنے چاروں طرف گھومتی ہوئی لنڈن کی ٹریفک کے شور کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنی پر سر رکھ کر وہیں سو گیا۔ جانے میں کتنی دیر سوتا رہا کہ یکایک کسی نے میرا نام پکارا اور کندھا پکڑ کر زور زور سے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"السلامُ علیکم" میرے سامنے میرا دوست صدیق کھڑا تھا جسے میں چند ماہ پیشتر لاہور میں صحیح سالم چھوڑ آیا تھا۔

"صدیق چوہدری؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر ایسے پوچھا جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔

"یار سلام کا جواب تو دو" اس نے کندھے سے پکڑ کر ایک مرتبہ پھر جھنجوڑا۔

"وعلیکم السلام۔ لیکن تم یہاں کیسے؟" صدیق اور لنڈن کے پکاڈلی سرکس میں! مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں تو کہتے رہتے تھے کہ ساری عمر لوہے کی کرسیاں بنانے کو پڑی ہے۔ دنیا دیکھو چنانچہ میں نے تمہاری روانگی سے چند دن بعد ناصر کو غیرت دلائی کہ فرنیچر تو بنتا ہی رہے گا۔ مظہر کو لعن طعن کی کہ تمہارا ہوٹل بھی چلتا رہے گا۔ وہ مستنصر تو تنہا سفر کے لیے پیدل ہی نکل کھڑا ہوا ہے اور ظالمو، ہمارے پاس تو ایک پرانی فوکس واگن بھی ہے۔ دنیا دیکھو!

"ناصر اور مظہر بھی لنڈن میں ہیں!" میں نے ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ ہو کر منہ کھول دیا۔

"دراصل" صدیق میرے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ کر کہنے لگا "ہم تینوں اپنی بیگمات اور والدین کو صرف اتنا بتا کر آئے تھے کہ کابل تک جا رہے ہیں دو چار روز میں لوٹ آئیں گے۔

پھر انہیں یکدم ہمارے لندن سے پوسٹ کیے ہوئے کارڈ وصول ہوئے تو خطوں اور تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ مظہر کی بیگم نے چونکہ خطرناک قسم کی دھمکی دی تھی کہ۔۔۔۔"

"کہ میں بھی پٹپایے" میں نے اٹک کر کہا۔

"پٹپایے؟" صدیق نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں گھاس کھا گیا ہوں "خیر مظہر تو اُسی روز بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان لوٹ گیا۔ مجھے اور ناصر کو چونکہ صرف عامیانہ قسم کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا تھا اس لیے ہم یہیں ٹِک گئے۔ کل صبح واپسی ہے۔ ہمارے ساتھ ہی چلو۔

میں نے اُسے بتایا کہ ابھی مجھے انگلستان کا جھیلوں کا ضلع دیکھنا ہے اور اس کے بعد فرانس اور ہسپانیہ کے سفر کے بعد ہی واپسی ہو گی اس لیے مجبوری ہے۔

"تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ مجھے تمہاری پکاڈلی سرکس میں موجودگی کے بارے میں کیسے علم ہو گیا؟"

"ہاں یہ بات بھی ہے" میں نے سوکھا کر کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم آج کل لنڈن میں ہو گے لیکن مشکل یہ تھی کہ تمہیں تلاش کہاں کیا جائے" اس نے میری طرف دیکھ کر شرارت سے کہا" ناصر سے ذکر کیا تو کہنے لگا۔ مستنصر؟ بس کہیں ہپیوں میں بیٹھا دُھوپ سینک رہا ہو گا چنانچہ میں سیدھا یہاں آگیا اور تم واقعی دُھوپ سینک رہے تھے"

"اب دُھوپ کہاں! شام ہو رہی ہے" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی "آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں"

ہم وہاں سے اُٹھ کر لیسٹر سکوئر کے ایک قہوہ خانے میں چلے گئے۔ ایک تاریک کونے میں ایک گرانڈیل حبشی ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے سر پر فلیٹ ہیٹ جمائے بڑی ترنگ میں گا رہا تھا۔ اس کے پہلو میں حبشیوں کی ایک پوری پلٹن ڈھول تاشے بجانے میں مصروف تھی۔ ہم نے کاؤنٹر سے کافی اور سینڈوچ خریدے اور ایک کونے میں جا بیٹھے۔ "آخری گاڑی آگئی لیکن" حبشی گلا پھاڑ کر چیختا اور پھر "میرا محبوب نہ آیا۔ نہ آیا۔ نہ آیا" کہ گردان شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی

دھمادھم ڈھول پٹنا شروع ہوجاتا۔

"گڈّی اگی ٹیش تے" کے ماہیئے سے متاثر ہوکر لکھا ہے" میں نے صدیق کے کان میں چیخ کر کہا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ موسیقی کے شور کی وجہ سے بات اس کے پلّے نہیں پڑی۔ دو تین گانوں کے بعد جب ہمارے کانوں کے پردے بغیر تھاپ کے دھپ دھپ کرنے لگے تو ہم اُٹھ کر باہر آگئے۔ سٹریتھم جانے والی آخری بس چونکہ پورے گیارہ بجے چلتی تھی اس لیے میں نے صدیق سے دو چار ماہ کے لیے اجازت چاہی اور اُسے خدا حافظ کہہ کر تیز تیز چلتا ہوا ٹرفالگر سکوائر کے بس شاپ پر آگیا۔ چند منٹ بعد ایک بس رُکی اور میں اُس میں سوار ہوگیا۔ بس چلی تو کنڈکٹر نے بتایا کہ یہ بس سٹریتھم نہیں جائے گی البتہ وہ مجھے اوول کے شاپ پر اُتار دے گا، جہاں سے مجھے سٹریتھم کے لیے ایک اور بس مل جائے گی۔ چنانچہ میں نے اوول تک کا ٹکٹ کٹا لیا اور سگریٹ سُلگا کر نشست پر دراز ہوگیا۔ میرے آگے دو نشستیں چھوڑ کر ایک سیاہ بالوں والی لڑکی کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے اور خوبصورت بال پچھلی نشست تک آرہے تھے۔ کنڈکٹر اُس کے پاس گیا تو اُس نے اپنے ننھے مُنّے بٹوے سے ایک شلنگ کا سکّہ نکالا اور پھر ایک ہاتھ سے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے ٹکٹ خرید لیا۔ بقیہ رقم اور ٹکٹ بٹوے میں ڈال کر اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کھِلتے ہوئے گندمی رنگ کے کینوس پر دو کالی بھورا آنکھیں تتلیوں کی مانند پھڑک رہی تھیں اس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے مجھ پر ٹھہریں اور پھر وہ حسبِ معمول کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ بس کسی لیمپ پوسٹ کے پاس سے گزرتی تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑتی۔ کچھ دیر تو میں اُس کی قومیت کے بارے میں غور کرتا رہا اور پھر اس کی طرح کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر باہر دیکھنے لگا۔ اوول کا شاپ آیا تو میں اُتر گیا اور کنڈکٹر کی بتائی ہوئی سمت میں چلنا شروع کر دیا جہاں سے مجھے سٹریتھم کے لیے بس ملنے کی اُمید تھی۔ ایک ویران چوراہے پر میں صحیح راستے کا تعین نہ کر سکا اور وہیں کھڑا ہوگیا تاکہ کسی راہ گیر سے بس شاپ کے بارے میں

دریافت کرسکوں۔

"اگر تم سٹریتھم جانے والی بس کے سٹاپ پر جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلے آؤ" میرے عقب میں سے ایک آواز اُبھری اور ساتھ ہی وہ کالے بالوں والی لڑکی میرے قریب سے گزر کر سڑک کے پار چلی گئی۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا تو میں وہیں کھڑا تھا۔ "آخری بس چلنے میں صرف ایک منٹ باقی ہے" اس نے قدرے دُرشتگی سے کہا۔ اور فٹ پاتھ پر چل دی۔ "آہم" میں نے گلا صاف کیا اور تیزی سے سڑک پار کرکے اُسے ایک موڑ پر جا لیا۔

"راہنمائی کا شکریہ" میں اپنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔

"کوئی بات نہیں" اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ذرا تیز چلو" میں نے کن انکھیوں سے اُس کا جائزہ لیا۔ وہ پستہ قد ہونے کے باوجود بیحد پُرکشش تھی۔ کھلے ہوئے لامبے بال جو کمر سے نیچے تک آئے ہوئے تھے تیز چلنے کے باعث اُس کے متناسب کولہوں پر پھسلتے اور پھر دُھنی ہوئی روئی کی مانند ہوا میں اُڑنے لگتے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بس اِسی خوف کی جھلکیاں تھیں کہ کہیں آخری بس نہ نکل جائے۔ وہ یورپی طرز کا لباس پہنے ہوئی تھی۔ بڑے کالروں والا پھولدار بلاؤز اور شوخ سُرخ رنگ کا منی سکرٹ۔

ہم ابھی سٹاپ سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ موڑ پر سے ایک سُرخ ڈبل ڈیکر نمودار ہوئی اور ہم دونوں بھاگتے ہوئے اُس میں سوار ہو گئے۔ نشست پر بیٹھتے ہی اُس نے اطمینان کا سانس لیا "شکر ہے آخری بس مل گئی ورنہ اِس راستے پر تو روزانہ کوئی نہ کوئی ہندوستانی یا پاکستانی پٹ جاتا ہے۔ میرے پاس تو ٹیکسی کے لیے بھی پیسے نہ تھے" اس نے اپنے بٹوے سے ایک مختصر سا رومال نکالا اور ماتھے پر تھپک کر کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر باہر دیکھنے لگی۔ اُس کے بالوں سے چنبیلی کی خوشبو آرہی تھی۔ گرم مشرق کی بھینی بھینی خوشبو۔ میں نے جیب سے سگرٹ نکال کر سُلگا لیا اور اس عجیب و غریب ایشیائی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا جو

لباس اور گفتار کے معاملے میں پوری طرح انگریز تہذیب میں رنگی جانے کے باوجود اس بات سے خوفزدہ تھی کہ کہیں گھر کے راستے میں انگریز غنڈے اس کی پٹائی نہ کر دیں۔ سرخ منی سکرٹ پھولدار بلاؤز اور انگریزی زبان پر مکمل عبور اُس کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ وہ صرف ایک رنگدار ایشیائی لڑکی ہوگی۔ کالی لڑکی۔

"آپ کس مُلک سے تعلق رکھتی ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میں ہندوستانی نژاد مشرقی افریقن ہوں" اُس نے کھڑکی سے نظر ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"اور آپ کا نام؟" میں نے شجرہ نسب مکمل کرنے کی کوشش کی۔

"رُملا" اس کی نگاہیں کھڑکی سے ہٹ کر مجھ پر جم گئیں۔ میں پہلی مرتبہ اس کا چہرہ اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا گندمی رنگ کا گول چہرہ فضا میں معدوم ہو رہا ہے اور اس خلا میں صرف بڑی بڑی کالی بھوری آنکھیں تیر رہی ہیں۔ میں بوکھلا گیا۔

"خوبصورت نام ہے" میں نے خوشدلی سے کہا "پرسوں میں ٹرافلگر سکوئر میں آپ کے ہم مذہب انگریز مہاشوں اور شری مَتیوں سے مُلاقات ہوئی تھی۔ ہری ادم، ہری کرشنا وغیرہ"

"کیا کہتے ہو؟" اُس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔

"ٹھیک کہتا ہوں" میں نے ترنگ میں آکر کہا "بس اب تو لنڈن میں ہی پوجا کر لیا کیجئے گا۔ اِدھر بگ بین کا گھڑیال بجا اُدھر آپ کے ہندو مندر میں ٹن ٹن شروع ہوگئی۔ آپ ہندو ہیں نا؟"

"میرا پورا نام رُملا ابراہیم ہے" اس نے تنک کر کہا "اور میں مسلمان ہوں" یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔

"لیکن آپ کا نام..." میں نے سر کھجاتے ہوئے بڑی پشیمانگی سے کہا۔

"ہمارے ہاں ایسے ہی نام ہوتے ہیں" اُس کے لہجے میں تلخی تھی۔

سٹریتھم کا بس شاپ آیا تو ہم اتر گئے۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے جانے لگا تو کہنے لگی میرے گھر کے راستے میں ایک شراب خانہ آتا ہے جہاں کئی شرابی لونڈے اِس تاک میں رہتے ہیں کہ

کوئی رنگدار نسل کا آدمی قابو آجائے تو اُسے تنگ کریں۔ اگر تم تھوڑی دُور تک میرے ساتھ چلو تو
میں بےحد شکرگزار ہوں گی۔"

راستے میں اُس نے بتایا کہ وہ لنڈن میں ملبُوسات کی تراش کا کورس کرنے آئی ہے اور
چند سہیلیوں کے ہمراہ ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔ آج شام اُسے ایک فیشن شو سے واپسی پر دیر ہو
گئی تھی ورنہ وہ رات کے اِس پہر اکیلی واپس آنے کا خطرہ مُول نہیں لیتی۔ بس سٹاپ سے اُس
کا گھر زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ اُس نے گھر کے سامنے چھوٹے باغیچے کا آہنی دروازہ کھولا اور پھر بڑی
آہستگی سے پیچھے مُڑ کر کہنے لگی "تم نے اپنا تعارف مجھے کروایا ہی نہیں" میں نے اپنے بارے میں بتایا
تو شرارت آمیز لہجے میں بولی "نام تو مسلمانوں ایسا ہے لیکن شکل سے بالکل ہندو لگتے ہو" گویا بدلا
چکایا جا رہا تھا۔

نرملا کے خوبصورت مشرقی چہرے نے میرے دل میں اُداسی بھر دی تھی۔ وہ میرے سامنے
کھڑی تھی اور لیمپ پوسٹ کی ہلکی روشنی میں اُس کی سیاہ آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ تتلیاں! میں
اُن کے پیچھے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مجھے ایکدم وطن کی یاد ستانے لگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وطن سے
قربت کا یہ احساس ابھی اور اسی وقت ختم ہو جائے "اگر کل شام تمہیں فرصت ہو تو ۔ ۔ ۔"

"بالکل فرصت ہے۔ میں سوان اینڈ ایڈگر سٹور کے کونے پر تمہارا انتظار کروں گی"

اِس سے قبل کہ میں کچھ اور کہتا وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر جا چکی تھی فضا میں ابھی تک
چنبیلی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسری صبح میری آنکھ کھلی تو سامنے چغتائی بیٹھا ایک اُسترا تیز کر رہا تھا اور اُس کے پاس
میز پر قینچیوں، کنگھیوں اور بال کاٹنے والی مشینوں کی قطاریں سجی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کمبل کو اچھی طرح سر کے گرد لپیٹتے ہوئے پوچھا۔ آج مطلع ابر آلود
تھا اور قدرے ٹھنڈک تھی۔

"حجامت بنے گی" اس نے اُسترے کی دھار پرکھتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کس کی بھائی!" میں نے اُباسی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری اور کس کی" اس نے ہنس کر کہا "بادشاہو یہ ہپیوں ایسے لمبے بال ہم پاکستانیوں پر نہیں سجتے"۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرے بالوں کی لمبائی میں ضیش سے زیادہ کنجوسی کو دخل تھا۔ آج ہفتہ تھا اور چغتائی چھٹی سے فیکٹری سے چھٹی چنانچہ بسم اللہ میری حجامت سے ہوئی۔ چغتائی اپنے بالوں کے معاملے میں بیحد محتاط ہے۔ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ مختلف قسم کے شیمپو، تیل اور کنگھے خریدنے میں صرف کرتا ہے۔ صرف ہیئر ڈریسر سے ہفتہ وار حجامت پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اُسترے قینچیاں گھر پر موجود ہیں اور روزانہ کام پر جانے سے پہلے ایک مختصر سی حجامت خود بنا لیتا ہے۔ بہرحال اس کارِ خیر سے فارغ ہو کر ہم نے کپڑے بدلے اور پھر بس کے ذریعے ٹرافلگر سکوئر میں آ گئے۔ آج ہمارا ارادہ نیشنل گیلری آف آرٹس دیکھنے کا تھا۔ گیلری میں داخلے سے قبل چغتائی کا چھاتا اور میری برساتی کاؤنٹر پر رکھوا لی گئی۔ ماضی میں ایسا بھی ہوا کہ فن کے قدردان اپنے اندر چھپے ہوئے رشک اور حسد کے جذبے کے تحت کسی شاہکار تصویر کو چھاتے کی آہنی نوک سے پھاڑ ڈالتے یا پھر تصویر اتار کر اپنی برساتی میں چھپائی اور رفوچکر ہو گئے۔ اس فن پرستی کی روک تھام کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ چغتائی جیسے منجھے ہوئے مصوّر کی رفاقت میں نیشنل گیلری میں آویزاں مشہور مصوّروں کی تصاویر کے کئی نئے پہلو سامنے آئے۔ اُسے کانسٹیبل اور ٹرنر بیحد پسند تھے جن کی قدرتی مناظر کی تصاویر کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا یہاں تک کہ مجھے اُس کی توجہ گیلری میں لگی ہوئی دُوسری شاہکار تصویروں کی طرف مبذول کرانی پڑتی جن کے خالق ریمبرانٹ، ڈیگاس، رُوبن اور مائیکل انجلو ایسے شہرہ آفاق مصوّر تھے۔ گیلری کے درجنوں ہال کمروں کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد جب ہم باہر آئے تو ابھی صرف دو بجے تھے۔ چغتائی نے تجویز پیش کی کہ اُردو فلم دیکھی جائے چنانچہ ہم "ساؤتھ ہال" جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔

ساؤتھ ہال پر لنڈن کے کسی علاقے کی بجائے ایک سکھ ریاست کا گمان ہوتا ہے، ہر طرف خالصوں کا راج ہے۔ تقریباً تمام مکان، سینما، سٹور اور شراب خانے سکھوں کی ملکیت ہیں۔ ساٹھ برس لگ بھگ کی بات ہے کہ ایک انگریز افسر ہندوستان سے واپسی پر اپنے سکھ اُردلی کو بھی ساتھ لے آیا اور اسے ساؤتھ ہال میں واقع ایک ربڑ فیکٹری میں ملازمت دِلوا دی۔ اس سکھ اُردلی نے پہلے اپنا خاندان اور پھر تمام گاؤں والوں کو یہاں بُلوا لیا۔ آج اس ربڑ فیکٹری کا نام نشان نہیں ملتا البتہ واہگرو کا خالصہ ٹھاٹ باٹ میں ملتا ہے۔ حالات یہ ہیں کہ اگر اس علاقے میں کوئی انگریز نظر آ جائے تو شام کے کھانے پر بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھالے انگریز کہتے ہیں۔ ہم ایک شراب خانے کے پاس سے گزرے تو باہر کھڑی لمبی تڑنگی سکھ عورت نے ہمیں خالص پنجابی لہجے میں پکار کر کہا "وے منڈیو! تھوڑی جیہی شراب تے پیا دیو" اُس نے بھڑکیلے رنگ کی ایک ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کی چال ڈھال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔

سینما گھر کے اندر بے پناہ رش تھا۔ سکھوں کے علاوہ پاکستانی حضرات بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے ہمیں ایک ساتھ دو نشستیں نہ مل سکیں چنانچہ چغتائی اگلی رو میں جا کر بیٹھ گیا اور میں گیلری میں سکھوں کے ایک جلوس کے درمیان براجمان ہو گیا۔ ماحول سراسر دیسی تھا۔ سگرٹوں کے علاوہ پان بھی بک رہے تھے۔ پاکستانی کوکا کولا کی بوتلیں تھامے تھے اور سکھ بیئر کے ٹین غٹا غٹ پی رہے تھے۔ فلم کے دوران میں جب بھی کوئی ہیجان خیز رقص آتا تو پبلک خوب شور مچاتی۔ ایک مرتبہ جب ہیرو نے ہیروئن کے ساتھ حرمستی کرنے کی کوشش کی تو چند سکھ اُٹھ کر نشستوں کے درمیان والے راستے میں ناچنے لگے۔ انہیں بڑی مشکل سے بٹھایا گیا۔ انٹرول کے بعد آپریٹر کی غلطی سے فلم کی ریلیں آگے پیچھے ہو گئیں اور تمام منظر اُلٹے چلنے شروع ہو گئے۔

چغتائی نے اگلی رو سے پیچھے مُڑ کر مجھے پکارا "مستنصر بادشاہ!"

"ہاں بھئی چغتائی بادشاہ!" میں نے سگرٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کسی بگڑے نے ریلیں اُلٹی چلا دی ہیں میں آ گیا؟"

"آہو" میں نے خوش ہو کر زور زور سے سر ہلایا اور پھر فوراً ہی اپنی نشست میں دبک گیا۔ میرے چاروں طرف بیٹھے سکھ مجھے بُری طرح گھور رہے تھے اور پھر یہ سینما بھی کسی سردارجی کی ملکیت تھا۔

فلم کے خاتمے پر باہر نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو سات بجنے کو تھے میرا خیال تھا کہ اب چغتائی سے اجازت لے کر فوراً پکاڈلی سرکس کی طرف چلا جاؤں جہاں سوان اینڈ ایڈگر سٹور کے کونے پر رُملا میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا چغتائی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ "بادشاہو! بہت سیر ہو چکی۔ اب فلیٹ پر چل کر وطن کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنی موسیقی سنتے ہیں۔" میں ٹھٹھک گیا۔ انکار کرنا چاہا مگر نہ کر سکا۔ آخر رُملا کون ہوتی ہے؟ لنڈن کی سیاہ رات میں دو پھڑکتی ہوئی تتلیوں کی شبیہہ۔ ادھر چغتائی نے ایک اجنبی ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ بھائیوں ایسا سلوک کیا ہے۔ میں اس کی یہ خواہش رُد کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا جب کہ اس کی بے پناہ شفقت اور خلوص میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تتلیاں بھی فضا میں معدوم ہو گئیں۔

اس شب ہم دیر تک اپنے پیارے دیس کی باتیں کرتے رہے۔ غم دوراں کے قصے چھڑے تو نصف شب ہو گئی محبت کی محرومیوں کے تذکرے ہوئے تو صبح ہونے کو آئی۔ تمام شب پاکستانی موسیقی کے ہلکے پھلکے سُروں نے ہمارا ساتھ دیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو لنڈن کے عظیم شہر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اُستاد برکت علی خاں کی لوچ دار آواز گونج رہی تھی۔

؎ کبھی ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تمام شب میرے دل کے عمیق کونوں میں جو اُداسی کروٹیں بدل رہی تھی مومن کی خوبصورت غزل نے اُسے اور بھی گہرا کر دیا۔ دل میں ایک دریچہ کھلا اور اک مَن موہنی صورت نے جھانکا۔ پھر اُس سے پرے دریچے کھلتے گئے اور ہر ایک میں رُملا تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گمبھیر اُداسی تھی اور وہ مجھ سے مخاطب تھی "مجھے معلوم ہے تمہیں یہ پی لباس

پسند نہیں اسی لیے میں نے آج صرف تمہارے لیے مشرقی لباس پہنا تھا۔ میرے کانوں میں چاندی کے جھمکے تھے جن پر پکاڈلی سرکس کی رنگ برنگی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں میرے بالوں میں چمبیلی کی خوشبو تھی۔ میری آنکھوں میں تمہارے انتظار کی شمعیں روشن تھیں۔ آج مجھے اکیلی گھر واپس آتے ہوئے بہت ہی ڈر لگا تھا۔ میں بالکل تنہا تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاندی کے جھمکے اُتار کر پھینک دیئے ہیں۔

جھیل اور جزیرہ

لنڈن میں قیام کے اگلے چند روز معمولی خرید و فروخت اور اُندلس کے سفر کی تیاری میں گزرے۔ پیسوں کی کمی کے باوجود اپنی پیاری بہنوں کے لئے خوب صورت سویٹر خریدے۔ لنڈن سے اُن کے لئے کوئی تحفہ نہ لے جاکر میں ساری زندگی جلے ہوئے ٹوسٹ اور کدو، بینگن جیسی سبزیاں کھانے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ دُنیا کے سب سے قدیم سفری ادارے تھامس کُک کی وساطت سے لنڈن سے سان سباستیان (ہسپانیہ) براستہ پیرس کا ٹکٹ خریدا جس پر پندرہ پاؤنڈ اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے برمنگھم جاؤں جہاں عرصۂ دراز سے میرے رشتے کے چچا مقیم ہیں اور پھر وہاں سے انگلستان کے لیک ڈسٹرکٹ (Lake District) یعنی جھیلوں کے ضلع کی طرف نکل جاؤں۔ لیک ڈسٹرکٹ سے واپس لنڈن اور سیدھا پیرس۔ چغتائی نے مشورہ دیا کہ مجھے یہ سفر بذریعہ بس طے کرنا چاہیئے۔ اِس طرح انگلستان کے دیہی مناظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ وہ مجھے بس سٹیشن تک چھوڑنے آیا میں نے اُسکی بے مثال مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو بڑے پیار

سے کہنے لگا۔ "بادشا ہو! جانے دو۔"

برمنگھم کے راستے میں انگلستان کا مشہور قصبہ کوونٹری پڑتا ہے جسے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے ہوائی بم باری سے مکمّل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ کوونٹری کا مشہور کلیسا بھی اس تباہی کا شکار ہوا۔ اس کی جلی ہوئی صلیب اَور منبر آج بھی اُسی حالت میں پڑے ہیں۔ اِنہی کھنڈروں کے پہلو میں جرمن نوجوانوں کی مدد سے پہلے سے کہیں زیادہ عالی شان کلیسا تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ جرمن نوجوان اپنے بزرگوں کی کرتوتوں پر پشیمان تھے۔ چنانچہ تلافی کے طَور پر اِس کلیسا کی از سرِ نَو تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔

برمنگھم پہنچا تو چچا بشیر بے حد خوش اخلاقی اَور شفقت سے پیش آئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر جب فوج میں کٹوتی ہوئی تو وہ بھی اِس کی زد میں آگئے اَور سیدھے برمنگھم سدھارے جہاں وہ آج کل ملکۂ معظمہ کا ڈاک کا محکمہ نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ اُن کے گھر کا ماحول خالصتاً پاکستانی ہے۔ اُنھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی خالدہ کو گھر پر ہی زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ میں نے اپنے قیام کے دَوران اُس نیک بی بی کو باورچی خانے سے باہر قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ برمنگھم کی مسجد میں اُن کے دونوں لڑکے مُدثّر اَور مُبشّر اتنی خوش الحانی سے قرآت کرتے ہیں کہ انگریز بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ شام کی چائے کے بعد چچا پوچھیں گے کہ برخوردار آج کتنے بجے واپس جا رہے ہو! مگر معلوم ہوا کہ انگلستان میں طویل قیام نے اُن کی پاکستانی شفقت اور مہمان نوازی پر ڈاکے نہیں ڈالے۔ چنانچہ زبردستی تین روز تک ٹھہرائے رکھّا۔ خوب خاطر مدارت کی بلکہ چلتے وقت ایک اُونی سوٹ کا کپڑا بھی تحفے میں دیا۔

میں صُبح آٹھ بجے سے مانچسٹر شہر کے نواح میں راشڈیل روڈ پر لفٹ کے انتظار میں پاؤں پسارے لیٹا تھا۔ برمنگھم سے بذریعہ ٹرین مانچسٹر آیا اَور سٹیشن سے بس پر سوار ہو کر راشڈیل روڈ پر آگیا جو لنکاسٹر کو جاتی تھی۔ لنکاسٹر سے پرے ایک ڈسٹرکٹ تھا جس کے بارے میں انگریزوں کو

زعم ہے کہ وہ سوئٹزرلینڈ اور اطالیہ کی ہمسری کرتا ہے۔ میں نے آج ایک مرتبہ پھر ہائکنگ کو ذریعۂ سفر بنانے کی حماقت کی تھی۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ ہزاروں کاریں گزریں لیکن کوئی کار ایسی نہ آئی جس پر ہمارے نام کی مُہر ہوتی۔ چنانچہ جب متواتر چار گھنٹے اسٹیشن کھڑے رہنے کے باوجود قسمت نے یاوری نہ کی تو میں سامان کندھے سے اُتار کر سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ کر سستانے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کالے رنگ کی ایک دقیانوسی کار دھچکے کھاتی ہوئی میرے پاس آ رُکی۔ بوڑھے انگریز ڈرائیور نے پائپ مُنہ سے نکالا اور بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی کیونکہ اِس ہچکولے کھاتی ڈھینچوں ڈھینچوں کرتی کار میں اگر لفٹ کی پیش کش ہو جاتی تو ہڈیاں تڑوانے کے علاوہ شاید میں اگلی سردیوں تک لیک ڈسٹرکٹ میں پہنچ پاتا۔

"بیٹے اگر یہاں سونے کے ارادے سے لیٹے ہو پھر تو ٹھیک ہے ورنہ لفٹ چاہیئے تو میں لنکاسٹر تک جا رہا ہوں۔" بوڑھے نے اپنا بوسیدہ مفلر کانوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"یہاں لیٹے رہنے سے فائدہ؟" میں نے سوچا۔ "کم از کم یہ کھٹارا حرکت میں تو ہے۔" چنانچہ میں نے چہرے پر ایک مصنوعی مُسکراہٹ سجا کر بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور سامان اُٹھا کر کار میں بیٹھ گیا۔ اب شائد یہ میرے تن و توش کا قصور تھا یا کار کا ارادہ پہلے سے ہی مراقبے میں جانے کا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی پھٹ پھٹا آ پھٹ کی آواز آئی اور کار بند ہو گئی۔ "ایک سیکنڈ لگے گا۔" بوڑھے نے مُنہ سے پائپ نکال کر چٹکی بجائی اور کار سے باہر نکل کر پچھلی نشست پر رکھی ہوئی چابی اُٹھا کر فوراً کار کے نتھنوں میں گھسیڑ دی۔ چابی کے استعمال نے تسوار کا کام دیا اور کار کا انجن دو چار پھُس پھُس چھینکیں مارنے کے بعد ایک مرتبہ پھر پھٹ پھٹ پھٹ کی آوازیں نکالنے لگا۔ "اب یہ ایک پرندے کی مانند اُڑے گی۔" بوڑھے نے کار میں بیٹھتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ سفر جاری ہوا اور دس منٹ بعد یہ پرندہ پھر پَر سمیٹ کر زمین بوس ہو گیا۔ "ایک سیکنڈ ..." بوڑھے نے پھر چٹکی بجائی اور کار سے باہر نکل گیا۔ بہر حال پورے سفر کے دوران میں بوڑھا چٹکیاں بجاتا

رہا اور پرندہ پھُدکتا رہا یہاں تک کہ لنکاسٹر کا شہر آگیا۔ اُس نے مجھے شہر سے چند میل باہر اُتار دیا اور خود دائیں ہاتھ مُڑ کر "آئرش سمندر" کے کسی ساحلی قصبے کی طرف چلا گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب مزید ہائیکنگ کی بجائے شب بسری کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے خیمہ نصب کر لیا جائے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دُور دُور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ تاحدِ نگاہ ہرے بھرے کھیت اُور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں سڑک سے نیچے اُتر کر پہلو میں جاتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر ہو لیا جو تھوڑی دُور جا کر لکڑی کے ایک پھاٹک کے پاس ختم ہو گئی۔ پھاٹک کے دوسری جانب ایک وسیع میدان نظر آ رہا تھا جس کے درمیان میں ایک گدلا جوہڑ تھا۔ جوہڑ کے کنارے بطخوں کا ایک غول کیچڑ میں سے کیڑے مکوڑے چگنے میں مصروف تھا۔ میں نے اپنا سامان پھاٹک کے اُوپر سے پھینکا اُور سال خوردہ لکڑی کے ایک تختے پر پیر جما کر دوسری طرف پھلانگ گیا۔ جوہڑ کے کنارے ایک ہموار جگہ پر میں نے اپنا سامان رکھا۔ خیمے کا کپڑا زمین پر پھیلایا اُور کونوں میں میخیں ٹھونکنے لگا۔ خیمہ گاڑنے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو کر میں ابھی خیمے کے درمیان میں نصب کئے جانے والے ڈنڈے جوڑ رہا تھا کہ میرے کانوں میں ہنہنانے اُور بھونکنے کی مِلی جُلی آوازیں آئیں۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو جوہڑ سے پرے کچی پگڈنڈی پر ایک گھڑسوار آ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر سکاٹ نسل کا ٹیرئر کُتا دُم ہلاتا اُور بھونکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہلکی شفق کے پس منظر میں گھڑسوار اُور اُس کا کُتا مصوّر کانسٹیبل کی دیہی مناظر کی کسی شاہکار تصویر کا ایک متحرک جُز ہوں۔ جوہڑ کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر سوار نے گھوڑا روک لیا۔ وہ ایک نوجوان اُور نہایت صحت مند لڑکی تھی جس کے چہرے کی شگفتگی اِس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ شہر کے ہنگاموں سے دُور کُھلی فضا میں زندگی بسر کرنے کی عادی ہے۔ اُس کا چہرہ میک اپ کی غیر موجودگی میں بھی دلکش نظر آ رہا تھا۔ گھڑسواری کا چُست لباس اُسے بےحد سج رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں گھوڑے پر بیٹھی رہی جیسے وہ اِس بات کا تعین نہ کر پائی ہو کہ اُس گدلے جوہڑ کے کنارے اِس شام میری موجودگی

کا کیا مقصد ہو سکتا ہے اور پھر اُس نے یکلخت گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جوہڑ کا چکر کاٹ کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اُس کا پستہ قد ٹیرئر کُتا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رُک کر قدرے بیدلی سے پخ پخ کرنے لگا۔

"وہسکی۔" لڑکی نے زور سے پکارا اور کُتا خاموش ہو کر دُم ہلاتا اپنی مالکن کے پاس چلا گیا۔ لڑکی نے میرے سامان اور خیمے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی۔ "یہ جوہڑ اور اِس کے گردو نواح کا تمام علاقہ ہماری ذاتی ملکیت ہے اور تم بغیر اجازت اندر داخل ہو کر قانون شکنی کے مرتکب ہوئے ہو۔ شاید تم وہ پھاٹک پھلانگ کر اندر داخل ہوئے ہو جو ناپسندیدہ اشخاص کو باہر رکھنے کے لئے لگایا گیا ہے۔" اور ساتھ ہی اُس نے چابک سے سفید پھاٹک کی طرف اشارہ کیا۔ لکڑی کی ایک باڑھ دُور دُور تک کھیت کے گرد ایک خاص علاقے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ لڑکی کا اعتراض دُرست تھا۔ میں نے چُپ چاپ اپنا سامان سمیٹ کر تھیلے میں رکھنا شروع کر دیا۔ "ٹھیک ہے انگریز کا گھر اس کا ذاتی قلعہ ہوتا ہوگا۔" میں نے بے حد تلخ ہو کر کہا۔ "لیکن اگر ایک رات کے لئے میں اس ویران کھیت میں خیمہ نصب کر لیتا تو اُن کی ذاتی زندگی کس حد تک متاثر ہو سکتی تھی؟"

لڑکی خاموشی سے مجھے خیمہ لپیٹتے اور سامان باندھتے دیکھتی رہی۔ جب میں نے اس کام سے فارغ ہو کر تھیلا کاندھے پر رکھا تو وہ گھوڑے سے اُتر کر میرے پاس آگئی اور بڑی نرمی سے کہنے لگی۔ "اگر تم پسند کرو تو یہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ہماری دیہی اقامت گاہ میں شب بسر کر سکتے ہو۔" میں نے سر اُٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے قدرے تامل کے بعد دعوت قبول کر لی۔ اِس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

لڑکی نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور بڑی پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہو کر اُس کا رُخ واپس

کچی پگڈنڈی کی طرف موڑ دیا۔ "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

"میں بھی بیٹھ جاؤں؟" میں نے راستے کی طوالت کے پیشِ نظر تجویز پیش کی۔

"کہاں؟" اُس نے گردن کو بل دے کر پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"گھوڑے پر۔"

"گھوڑے پر؟" اُس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ "یہ عام سواری کا گھوڑا نہیں بلکہ اعلیٰ نسل کا دوڑ میں حصہ لینے والا جانور ہے۔ بہرحال میں تمہارا سامان آگے رکھ لیتی ہوں۔"

اپنے وزنی سامان سے نجات حاصل کر کے میں تیزی سے گھڑ سوار لڑکی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ٹیری رُکتا وہی گھوڑے کی سست رفتاری سے فائدہ اُٹھا کر آگے آگے بھاگا جا رہا تھا۔ ہمارے گرد میلوں تک کسی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شب کے سُرمئی اندھیرے میں سبز کھیت اور درخت سیاہی مائل ہو چکے تھے اور ان کے درمیان کچی پگڈنڈی ایک مانگ کی مانند اس سیاہی کو چیرتی دُور تک چلی گئی تھی۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد درختوں کا ایک گھنا جُھنڈ آیا جس کے آخر میں ایک قدیم دیہی اقامت گاہ کی پُرشکوہ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ اقامت گاہ کے گرد ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا جس کے چاروں طرف ایک بُلند حفاظتی دیوار تھی۔ درمیان میں لوہے کا ایک بُلند پھاٹک تھا۔ لڑکی گھوڑے سے اُتری جیب میں سے چابیوں کا ایک گُچھا نکال کر ایک وزنی چابی پھاٹک کے قُفل میں گھمائی اور اُسے کھول کر گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں تھامے میرے آگے آگے چلنے لگی۔ گھوڑے سے اُترتے وقت سامان کا تھیلا اُس نے مجھے تھما دیا تھا۔ ٹیری رُکتا اب اس کوشش میں تھا کہ میرے ساتھ دوستانہ تعلقات کا آغاز کر دے اور وہ بار بار اپنی نم آلود تھوتھنی میرے پاؤں میں رگڑتا اور دُم ہلاتا جا رہا تھا۔ اقامت گاہ کی چھت کے اُوپر ایک چمنی سے سفید دھوئیں کی ہلکی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی جس کے نیچے شاید باورچی خانہ تھا۔ صدر دروازے پر پہنچ کر لڑکی نے گھوڑے کو ایک تھپکی دی اور اُسے وہیں چھوڑ کر دیوار میں نصب گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ ایک بوڑھے انگریز نے کھولا۔ وہ آئرش ٹویڈ کے اونی کوٹ اور سلیٹی رنگ کی پتلون میں

نہایت وجیہہ اور مُدبر لگ رہا تھا۔

"آئرین ڈارلنگ تم پورے پینتیس منٹ دیر سے واپس لوٹی ہو کہیں گھوڑا تو نہیں بدک گیا تھا"

"نہیں ڈیڈی۔ گھوڑا تو سُوپر تھا۔" لڑکی نے بوڑھے کے سُرخ گالوں پر ایک مختصر سا بوسہ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔ اِس دوران میں بوڑھے کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اُس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"ڈیڈی یہ سیاح ہیں اور آپ کی پیاری بطخوں والے جوہڑ کے کنارے خیمہ نصب کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں شب بسری کے لیے اپنے ہاں مدعو کر لیا ہے۔ بالائی منزل کے تمام کمرے تو خالی ہی پڑے ہیں نا؟"

"تم نے بڑا اچھا کیا آئرین۔ جوانی میں مجھے بھی سیاحت کا خبط تھا۔" بوڑھے نے شفقت سے لڑکی کا کندھا تھپکا اور پھر مجھ سے سامان لے کر ہال کے ایک کونے میں رکھ دیا جہاں کیچڑ سے بھرے ہوئے بُوٹ اور اوور کوٹ رکھے تھے۔ باپ بیٹی نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ گائے کے گوشت اور یارک شائر پڈنگ کے لذیذ ڈنر کے بعد کافی کی چُسکیاں لیتے ہوئے بوڑھے نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ ساتھ ساتھ پائپ کے کش بھی لگا رہا تھا۔ یہ عالیشان گھر کئی پشتوں سے اُس کی خاندانی ملکیت چلا آ رہا تھا۔ نوکری کے زمانے میں تو اس کے کمرے گرد سے اَٹے رہے اور دروازوں پر بھاری قفل پڑے رہے مگر شاہی بحریہ میں ایک اعلیٰ عُہدے سے ریٹائر ہو کر اُس نے اپنی بیٹی آئرین کے ہمراہ باقی ماندہ زندگی یہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتنی بڑی عمارت میں اُن دونوں کے علاوہ صرف ایک مالی اور اصطبل کا رکھوالا رہتا تھا۔ اس کا مشغلہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالنا اور اُس گدلے جوہڑ میں خود بخود پلنے والی بطخوں کی رکھوالی کرنا تھا۔ اُس نے اپنے پائپ کا تمباکو ایک چمٹی سے جماتے ہوئے بتایا کہ ہر اتوار وہاں سے چند کوس کے فاصلے پر ایک دیہی گھُڑ دوڑ کے میدان میں اُس کے گھوڑے بھی مقابلہ میں حصّہ لیتے ہیں اور ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل کرتے ہیں۔ ہال میں جابجا اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی تصاویر آویزاں تھیں

جو بوڑھے کے اس شوق کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ اُس کی بیٹی آئرین ڈنر سے قبل گھڑ سواری کا مردانہ لباس تبدیل کر کے سیاہ رنگ کا ایک اُونی لباس پہن آئی تھی اور یقیناً پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

بوڑھا خاصی دیر باتیں کرتا رہا اور بالآخر وہیں صوفے پر بیٹھا اونگھنے لگا۔ آئرین نے آہستہ سے اُس کا بجھا ہوا پائپ انگلیوں سے نکال کر راکھدان میں رکھ دیا۔

" اس سے پہلے کہ تم بھی اُونگھنے لگو چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آتی ہوں۔" اُس نے ہنس کر کہا۔

ہم ہال کے درمیان میں سے جاتی ہوئی سیڑھیوں کو طے کر کے دوسری منزل پر آگئے۔ آئرین نے ہینڈ بیگ سے چابیوں کا وہی گچھا نکالا اور پہلے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ "شب بخیر" اُس نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر کہا " اور سہانے خواب " اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

وکٹورین طرز کے قدیم فرنیچر سے آراستہ کمرہ بے حد آرام دہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پلنگ پر بیٹھ کر ایک سگریٹ پیا اور پھر اپنا سامان کھول کر کپڑے بدلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر آئرین کھڑی تھی۔

" تم دو چار روز ہمارے ہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ اتوار کو گھڑ دوڑ بھی ہے۔ میں تو اِس ویران گھر، سنسان کھیتوں اور ڈیڈی کی بلغموں سے تنگ آگئی ہوں۔" اُس کی دعوت میں خلوص کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی پنہاں تھا۔

" بہت بہت شکریہ۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ " دراصل میں نے لیک ڈسٹرکٹ دیکھنے کے بعد فرانس اور ہسپانیہ بھی جانا ہے اور میں ترکی میں برف باری سے قبل ہی وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو ــــــ"

" خیر کوئی بات نہیں ــــ" اُس نے جلدی سے کہا۔ " مجھے افسوس ہے کہ تمہارے آرام میں مخل ہوئی۔" اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا آئرین کے

بارے میں سوچتا رہا اور پھر دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

رات کے پچھلے پہر یکدم میرے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو چار بج رہے تھے۔ میں آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر گھنی سُرخ داڑھی اور لمبے بالوں والا ایک نوجوان کھڑا تھا۔

"میں اصطبل کا رکھوالا ادنیل ہوں۔ پچھلی شب مِس آئرن نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آج صبح جب میں معمول کے مطابق گھر کا سودا سلف لانے لنکاسٹر جاؤں تو آپ کو لیک ڈسٹرکٹ جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آؤں۔" اُس نے بھاری آئرش لہجے میں کہا۔

میں نے جلدی سے اپنا سامان اکٹھا کیا اور کاغذ کے ایک پُرزے پر آئرین کے نام شکریے کے دو حرف لکھ کر نیچے آ کر ٹریکٹر کے پیچھے لگی ہوئی ٹرالی پر بیٹھ گیا۔ ادنیل نے ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ صُبح کی سردی کے اثرات زائل کرنے کے لئے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑے اور ٹریکٹر کا انجن سٹارٹ کر دیا۔ حالانکہ ابھی موسمِ گرما تھا۔ مگر صبح کی ہوا میں کاٹ کھانے والی سردی کی لہر تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے سامان کھولا اور اپنی ہراتی پوستین پہن لی جو کافی عرصہ سے بیکار پڑی تھی۔ اِرد گرد کے کھیتوں اور درختوں پر دُھند کی تہیں جمی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہم بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے جہاں ادنیل نے مجھے عین اُسی جگہ اُتار دیا جہاں سے میں کل شام گدھے جو بڑ والے کھیت میں اُترا تھا۔ سڑک بالکل تاریک تھی اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ پچھلی شب کی بے خوابی کی وجہ سے مجھ پر ابھی تک نیند کا غلبہ تھا چنانچہ میں نے سامان سڑک کے کنارے رکھا اور پوستین کو اپنے گرد لپیٹ کر وہیں سو گیا۔

صُبح ——

صبح کا اُجالا ہوا تو میں نے قسمت آزمائی شروع کر دی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک موٹر سائیکل سوار نے مجھ پر کرم کیا اور لفٹ کی پیشکش کی۔ میں ابھی اپنے آپ کو پچھلی نشست پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ موٹر سائیکل ایک دھچکے کے ساتھ سڑک پر نہایت تیز رفتاری سے دوڑنے لگی

میری پُشت پر سامان کا وزن مجھے پیچھے کھینچ رہا تھا اور میں دونوں ہاتھوں سے سوار کی کمر مضبوطی سے تھامے اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ خواہ مخواہ یہ مصیبت مول لے لی۔ بہر حال کم از کم تیز رفتاری کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم جلد ہی اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے لیک ڈسٹرکٹ کی پہلی جھیل ونڈرمیر کا آغاز ہوتا ہے۔

جھیل ونڈرمیر کی پہلی جھلک بے حد مایوس کُن تھی۔ کوتاہ قد اور کچی سر سبز پہاڑیوں کے درمیان میلوں پھیلا ہوا گدلے پانی کا ایک قطعہ جو پچھلی شب والے جوہڑ سے کسی طور کم نہ تھا۔ بلکہ اُسی قسم کی بطخیں بھی یہاں موجود تھیں۔ کنارے پر آئس کریم اور مناظر کے کارڈ فروخت کرنے والوں کے بھتّے کھوکھوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ یہاں چونکہ ٹریفک بے حد کم تھی۔ اس لیے میں ہائیکنگ کا خیال ترک کر کے ایک مقامی بس پر سوار ہو کر ایمل سائیڈ کے خوبصورت قصبے تک چلا گیا۔ لنڈن سے چلتے وقت چغتائی نے مشورہ دیا تھا کہ ایمل سائیڈ سے جھیل کے آخری سرے پر واقع قصبے گراس میر تک نہایت پُر فضا راستہ جاتا ہے۔ اس لیے یہ ٹکڑا پیدل طے کرنا۔ چغتائی نے شاید سُنی سُنائی بات کہہ دی تھی۔ یہ علاقہ یقیناً بے حد حسین ہوگا۔ لوگ جو کہتے ہیں بلکہ میں نے پڑھ رکھا ہے کہ ایک پاکستانی سیاح خاتون کا یہاں سانس بند ہونے کو آیا۔ علاوہ ازیں تیس سیر وزنی تھیلا کندھے پر اٹھا کر پیدل کرنے سے شاید میری خوب صورتی کی حس بھی دب کر رہ گئی تھی۔ مجھے وادیٔ نیلم کی جڑواں جھیلیں، وادیٔ کاغان کی سیف الملوک، اطالیہ کی لاگا مگوری اور سوئٹزرلینڈ کی لاک لامن یاد آگئیں۔ میں نے لاک لامن کے کنارے جنیوا سے مانترے شہر تک پیدل سفر کیا ہے۔ اُس وقت بھی میرے کندھوں پر اتنا ہی بوجھ تھا لیکن اُس سفر کی یاد کا ہر لمحہ نیلگوں پانیوں، انگور کی بیلوں، خودرو پھولوں اور نباتاتی انباروں کی مہک سے وابستہ ہے۔ اور پھر کالج کے زمانے میں وادیٔ نیلم کی کوہ پیمائی کے دوران میں اُن جڑواں جھیلوں کی سحر انگیز خوب صورتی، درمیان میں تیرتے ہوئے برفانی تودے۔ ہلکے نیلے پہاڑوں میں سے جھیل میں گرتے ہوئے نقرئی آبشار، کناروں پر میلوں تک پھیلے ہوئے سُرخ گُلِ لالہ

کے قالین ـــ ان خوب صورتیوں کا تصوّر زندگی کے تاریک ترین لمحوں میں بھی شفق کا رنگ بھر دیتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں غلطاں چلا جا رہا ہے کہ کسی نے مجھے "ہے ہے۔" کہہ کر پکارا۔ سڑک کے بائیں ہاتھ پر ایک کاٹج کے باغیچے میں بیٹھی ہوئی اُدھیڑ عمر بی اماں مجھے ہاتھ کے اشارے سے بُلا رہی تھیں۔ میں اُن کے پاس گیا تو کہنے لگیں۔ "تمہارے پاس جوان لڑکیوں کی ریشمی جرابیں ہی ہیں یا ہم درمیانی عُمر کی عورتوں کے لیئے اُونی موزے بھی بیچتے ہو؟"

"ریشمی جرابیں ؟ " میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"تم پھیری لگا کر جرابیں یا بنیانیں بیچنے والے پاکستانی نہیں ہو؟"

" بڑھیا نے اپنا پوپلا مُنہ ہلایا۔

" مائی میں تو ایک سیاح ہوں۔ بھولے سے اِدھر آنکلا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔" میں نے جل کر کہا۔

"غلطی مجھ سے ہوگئی ہے۔" بی اماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔" دراصل اس علاقے میں بے شمار پاکستانی اس قسم کا کاروبار گھوم پھر کرتے ہیں۔ میں سمجھی تم کاندھے پر جرابیں اور بنیانیں اُٹھائے بیچ رہے ہو۔" میں بڑی اماں کو کرسی پر سر ہلاتے چھوڑ کر واپس سڑک پر آگیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔

پچھلے پہر جب میں چلتے چلتے تھک کر چُور ہو گیا تھا ایک موڑ کے دوسری طرف جھیل کے پرے پر سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھرا ہوا گراس میر کا قصبہ دکھائی دیا۔ دیدہ زیب گھر اور قدیم کلیسا کی پتھریلی عمارت کا عکس پہلو میں لیٹی ہوئی جھیل کے خاموش پانی میں جھلک رہا تھا میں نے دائیں جانب نگاہ ڈالی تو جھیل کے وسط میں بُلند و بالا درختوں اور بیلوں سے اٹا ہوا ایک ننھا سا جزیرہ تیر رہا تھا۔ جزیرے سے پرے دوسرے کنارے پر چند خیمے دکھائی دے رہے تھے جو گراس میر کی "کیمپنگ" تھی۔ چونکہ جہاں میں کھڑا تھا وہاں اُس کیمپنگ تک پہنچنے کے لیئے کسی کشتی وغیرہ کا انتظام نہ تھا۔ اس لیئے پہلے مجھے جھیل کی نکڑ پر گراس میر تک جانا پڑا اور پھر وہاں سے ساحلی سڑک پر چلتا ہوا

کیمپنگ تک پہنچ گیا کیمپنگ کے مالک سے روزانہ ضروریات کی سہولتوں کے بارے میں استفسار کیا تو کہنے لگا۔ "ہم نے اس کیمپنگ کو قدرتی حسن کے پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے اور یہاں زندگی بھی قدرتی اصولوں کے تابع ہونی چاہیئے۔ خوراک صرف قصبے کے سٹور سے ملے گی۔ نہانے کے لئے جھیل ونڈرمیر کا نیلا پانی جو ہے اور باقی ضروریات سڑک کے پار گھنے درختوں میں پوری کی جاسکتی ہیں" مجھ میں اب اتنا دم خم نہیں تھا کہ صرف کھانے کی خاطر گراس میر کے قصبے کا قصد کرتا۔ اس لئے جھیل کنارے خیمہ نصب کیا۔ چند بسکٹ کھا کر جھیل کا پانی پیا اور صبر شکر کر کے سو رہا۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ جب اپنے خیمے سے باہر نکلا تو موسم بجد خوش گوار تھا۔ تیز دھوپ میں جھیل کی سطح اس قدر چمک رہی تھی کہ نظر بھر کر دیکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے "قدرتی اصولوں" کی پیروی کرتے ہوئے گھنے درختوں کی سیر کی اور پھر جھیل کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر گراس میر کے قصبے کی طرف چل دیا جو وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔

لیک ڈسٹرکٹ میں گراس میر رومانوی تحریک کے روح رواں شاعر ورڈز ورتھ کی نسبت پہچانا جاتا ہے۔ قصبے کے آغاز میں DOVE COTTAGE کی دیدہ زیب عمارت قدیم برطانوی طرز تعمیر کا ایک دل کش نمونہ ہے۔ اسی گھر میں ورڈز ورتھ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ ڈوکاٹیج سے چل کر قصبے میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ پر ایک بھدے اور قدیم کلیسا کے ویران قبرستان میں اپنے خاندان اور دوسرے افراد کے پہلو بہ پہلو ورڈز ورتھ ابدی نیند سو رہا ہے۔ اُس کی قبر پر سنگ مرمر کا سادہ کتبہ اس کی شاعری کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ بچپن میں ورڈز ورتھ کی نظم "ڈیفوڈل" پڑھی تو اس کے خوب صورت شعروں نے میرے ذہن پر فطرت کے حسن اور اس کی رعنائیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میرے سامنے گراس میر اور قصبے کے گرد و نواح کی رنگین شبیہیں اُبھریں اور جھیل کے کنارے تاحد نظر ڈیفوڈل کے پھول ناچنے لگتے۔ ایک مقامی گائیڈ نے اُس مقام تک میری راہبری کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ورڈز ورتھ نے وہاں فطرت کی نیرنگیوں میں ڈوب کر ڈیفوڈل کی لازوال نظم تخلیق کی۔ میرے سامنے ایک بے حد سپاٹ قسم کا منظر تھا۔ گدلے پانی کے ساتھ لہلہاتے پھولوں

کی بجائے بدنما گھاس اَور سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔

گراس میر ایک ایسا قصبہ ہے جس کے گھر، کلیسا، شراب خانے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے قدرتی مناظر خوب صورتی اور عظمت کا ایک حسین خواب دیکھ کر اب تک بیدار نہیں ہوئے۔ کوچہ و بازار میں گھومئے تو تنہائی اَور اُداسی کا احساس ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم وقت و زماں کی قیود سے آزاد ہو کر صدیوں قبل اُن زمانوں میں چلے گئے ہیں جب مناظرِ فطرت کا شیدائی ورڈزورتھ اپنا پورا دن کسی حسین وادی میں یا جھیل کے کنارے کسی خاموش کُنج میں گزار کر گھر واپس جاتے ہوئے انہی گلیوں میں سے گزرتا تھا۔ وہ گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر سر جھکائے زیرِ لب اپنی تازہ نظم کے اشعار گنگنا رہا ہوتا تھا۔

گراس میر میں سارا دن گھومنے کے بعد جب میں شام کو واپس کیمپنگ کی طرف روانہ ہوا تو جھیل کے ساتھ جاتی ہوئی سڑک تاریک اَور سنسان تھی۔ اِس خاموشی میں صرف جھیل کے سرکنڈوں میں بسیرا کرنے والے مینڈکوں اور جھینگروں کے ٹرّانے کی آوازیں بکھر رہی تھیں۔ کبھی کبھار ساتھ والے جنگل میں سے کسی اُلو کی ہُو ہُو ماحول کو اَور بھی دہشت ناک بنا دیتی۔

صُبح ہوئی تو میں نے ایک مرتبہ پھر گراس میر جانے کی بجائے جھیل کے درمیان تیرتے پُراسرار جزیرے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے خیمے سے کچھ دُور گھاٹ پر چند کشتیاں کھڑی تھیں۔ جنہیں کیمپنگ کا مالک کرائے پر دیتا تھا۔ میں نے ایک مضبوط اَور نسبتاً چھوٹی کشتی آدھے دِن کے لئے کرائے پر حاصل کر لی۔ جھیل کی سطح پُرسکون تھی اس لئے کشتی کھینے میں چنداں دقت نہ ہوئی اَور میں جلد ہی جزیرے کے پاس پہنچ گیا۔ جزیرے کے گرد پورا چکر کاٹنے پر بھی کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں میں آسانی سے کشتی کھڑی کر کے ساحل تک پہنچ جاتا۔ چنانچہ میں کشتی سے پانی میں اُتر گیا اور اُسے ساتھ بندھے رسّے کی مدد سے کھینچتا ہوا ساحل تک لے گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں میری غیر موجودگی میں جھیل کی ہلکی لہریں کشتی کو بہا نہ لے جائیں۔ میں نے اسے خشک ریت پر گھسیٹ لیا اَور جزیرے کی سیر کو نکل گیا۔ جزیرہ بالکل بے آباد اور سُنسان تھا۔ بُلند اور تناور درختوں کے سائے میں کانٹے دار

جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کی بہتات تھی۔ ایک درخت کے تنے پر دو نام کھُدے ہوئے تھے۔
اُن دونوں کو بھی شاید میری طرح اس جزیرے کا سحر یہاں کھینچ لایا تھا۔ ایک جگہ گھنے درختوں
کی چھاؤں میں سرسبز گھاس اَور خود رَو جنگلی پھُول تھے۔ میں اپنی برساتی بچھا کر لیٹ گیا۔ درختوں
کے پتّوں میں سے ہوا تالیاں بجاتی ہوئی گزرتی اَور پھر ساتھ ہی جھیل کی لہروں کا ہلکا سا ارتعاش
سنائی دیتا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ اس علاقے کی خوب صورتی کے بارے میں میرا پہلا تاثر کس قدر
مہمل تھا۔ یہاں فطرت کی رعنائیاں آپ کو پلک جھپکتے مسخّر نہیں کر لیتیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ یہ سادگی اَور سکون دل میں اُترنے لگتا ہے۔ ایک خوب صورت نظم کی طرح جسے صرف بار بار
پڑھنے سے ہی اُس کی باریکیاں آپ پر عیاں ہوتی ہیں اَور پھر آدمی ہمیشہ کے لیے اُس کا گرویدہ ہو
جاتا ہے۔ کل دوپہر میں وہ سپاٹ منظر دیکھ کر کتنا مایوس ہوا تھا جہاں بیٹھ کر "ڈیفوڈل" لکھی گئی
تھی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہاں صرف موسمِ بہار میں ہی پھُول کھلتے ہوں یا پھر وہاں ہمیشہ سے ہی بدنما
گھاس اَور سَرکنڈے تھے جنہیں ورڈز ورتھ کی رومانوی حس نے لاکھوں جھومتے ہوئے ڈیفوڈل
کے پھولوں کی شکل میں دیکھا۔ قصور جگہ کا نہیں نظر کا ہوتا ہے۔ بُلبُل جہاں جاتی ہے اُس کی نظریں
سرسبزی اور شادابی ڈھونڈتی ہیں اَور بُوم کو ہمیشہ ویرانوں کی تلاش ہوتی ہے۔

سورج اب میرے سَر پر چمک رہا تھا۔ میں نے برساتی سمیٹی اَور تیزی سے چلتا ہوا ساحل پر
آ گیا۔ میری کشتی غائب تھی۔ پہلے خیال آیا کہ شاید غلط مقام پر آ نکلا ہوں لیکن جزیرے کا پورا چکر لگانے
پر بھی کشتی کا کوئی سُراغ نہ ملا تو صورتِ حال کی نزاکت کا شِدّت سے احساس ہوا۔ میں اتنا اچھا تیراک
نہ تھا کہ قوّتِ بازو کے بَل پر ہی واپس کیمپنگ تک پہنچ جاتا اَور کسی دوسرے شخص کا اس جزیرے پر
آنے کا امکان بھی کم تھا۔ میں اِنہی خیالوں میں مگن واپس اُسی جگہ پر آیا تو یہ دیکھ کر میری جان میں
جان آئی کہ میری کشتی ساحل سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر خود رَو گھاس میں اٹکی ہوئی ہے۔
میں کمر تک گہرے پانی میں چلتا ہوا کشتی تک پہنچا اور بڑی مشکل سے اِس میں سوار ہو گیا۔ چپّو کی مدد
سے کشتی کو گھاس میں سے نکالا اَور پھر رُخ کیمپنگ کی جانب موڑ دیا۔ واپسی پر کیمپنگ کے مالک نے

بتایا کہ اگر میں تھوڑی دیر میں نہ لوٹتا تو وہ خود میری تلاش میں آنے والا تھا۔

اگرچہ لیک ڈسٹرکٹ میں ونڈرمیر کے علاوہ اُنز واٹر اور ڈرونٹ واٹر کی خوب صورت جھیلیں بھی تھیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس سے آگے بھی جاتا چنانچہ میں نے دوسری صبح واپس لنڈن جانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری صبح میں نے گھاٹ پر کشتیوں کے مالک سے درخواست کی کہ وہ مجھے میرے سامان سمیت جھیل کے دوسرے کنارے اُس مقام پر چھوڑ آئے جہاں سے مجھے چند روز پہلے کیمپنگ اور تیرتے ہوئے جزیرے کی پہلی جھلک دکھائی دی تھی۔ کشتی آہستہ آہستہ کیمپنگ سے دُور ہوتی گئی۔ بائیں ہاتھ پر وہی جزیرہ گزر گیا۔ دائیں ہاتھ پر جہاں جھیل ختم ہوئی تھی گراس میر نظر آ رہا تھا۔ شاعرِ فطرت ورڈز ورتھ کا مسکن اور مدفن۔ ہم دوسرے کنارے پر پہنچے تو گھڑیاں بجنا شروع ہو گیا جو ایک آہنی بھینسے کی مانند قصبے کے کلیسا کے مینار پر مُنہ کھولے جھوم رہا تھا۔ ٹن ٹن ٹن۔ اُس کی گھمبیر آواز جھیل کے پُرسکون پانی پر سفر کرتی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ آج اتوار تھی۔ مجھے آئرین کا خیال آ گیا جو ایک ویران گھر، سنسان کھیتوں اور ڈیڈی کی بطخوں سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ آج اپنے بوڑھے ڈیڈی کے ہمراہ لنکاسٹر کے قریب گھڑ دوڑ دیکھنے گئی ہو گی۔

میں ایک مقامی بس کے ذریعے جھیل ونڈرمیر سے لنکاسٹر تک آیا اور پھر ایکسپریس گاڑی پر سوار ہو کر لنڈن پہنچ گیا جہاں نیم تاریک وِکٹوریہ سٹیشن پر پیرس جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

"یہ گاڑی ڈیڑھ بجے ڈوور کی بندرگاہ پر پہنچے گی۔ وہاں سے صبح دو بجے سٹیمر چلے گا اور رودبارِ انگلستان عبور کر کے چھ بجے کے قریب آپ لوگ فرانس کی بندرگاہ ڈنکرک پر پہنچ جائیں گے اور پھر فرانسیسی گاڑی آپ کو ڈائرکٹ پیرس لے جائے گی۔" گارڈ نے میرا ٹکٹ چیک کرتے ہوئے بتایا۔

اپاہج دلہن

ہمارا اسٹیمر رات کی تاریکی میں رودبارِ انگلستان کی سرد اور بپھری ہوئی موجوں کو چیرتا فرانس کی بندرگاہ ڈنکرک کی جانب رواں تھا۔ انگلستان کے ساحل پر ڈوور (DOVER) کی مشہورِ زمانہ سفید چٹانیں جو اب اندھیرے میں مٹیالی لگ رہی تھیں آہستہ آہستہ ہم سے دُور ہوتی جا رہی تھیں۔ چٹانوں کے پہلو میں شہر کا قدیم قلعہ برقی روشنیوں سے منوّر تھا۔ لہروں کے شور اور گھُپ اندھیرے میں قلعے کے سنگلاخ در و دیوار سے پھوٹتی ہوئی ہلکی روشنی میں ایک مہیب قسم کی خوبصورتی تھی۔ میں جو اکثر کسی بھی شہر یا ملک سے جدا ہوتے وقت ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو جایا کرتا ہوں انگلستان کے ساحل پر ڈوَور کے طلسمی قلعے اور سفید چٹانوں کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر قطعی طور پر غیر متاثر رہا۔ اِس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہسپانیہ اور میرے درمیان فاصلے کم ہو رہے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں پیرس میں شب بسری کر کے دوسرے روز سان سباستیان (ہسپانیہ) کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ ڈوَور کا قلعہ اور اس کی روشنیاں اب صرف ایک روشن گولے کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔

سفید چٹانیں مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکی تھیں۔ میں نے مخالف سمت میں فرانس کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف تاریکی تھی۔ ڈنکرک کا شہر کوسوں دُور تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی تو عرشہ ویران پڑا تھا۔ تمام مسافرات کی خنکی اور سمندر کی نم آلود تیز و تند ہواؤں سے بچاؤ کی خاطر سٹیمر کی نچلی منزل میں واقع قہوہ خانے میں جا چکے تھے۔ میں نے اپنا سفری تھیلا کاندھے پر رکھا اور سیڑھیاں اُتر کر قہوہ خانے میں آگیا جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں پر لہروں کے شور کی بجائے انسانی آوازوں کا شور تھا۔ چند لوگ کافی پی رہے تھے اور کچھ مے نوشی میں مشغول تھے۔ اکثریت کرسیوں اور میزوں پر ٹانگیں پھیلائے اونگھنے اور سونے کے درمیانی مراحل میں تھے۔ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے سیاہ سوٹ اور باؤلر ہیٹ میں ملبوس ایک بوڑھا انگریز ہاتھ میں چھاتا لیے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اُسے شاید فرش پر کوٹ بچھا کر لیٹے ہوئے ایک جوان انگریز جوڑے کی "حرکات" دیکھنے سے سکتہ ہو گیا تھا جو پیرس پہنچنے کا انتظار کیے بغیر رود بارِ انگلستان کے پانیوں پر رواں سٹیمر میں ہی فرانسیسی اخلاقی تہذیب کا پہلا سبق رٹنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ ایک جانب چند نوجوان انگریز موسیقار اپنے قدآور سازوں سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ وہ شاید جس شہرت کے متمنی تھے انہیں لندن میں نہ مل سکی تو اب پیرس کا رُخ کر رہے تھے۔ پیرس جہاں ہر فنکار کی قدر کی جاتی ہے چاہے وہ موسیقار ہو یا مصوّر۔ میں بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے میز کرسیوں اور انسانی جسموں میں سے راستہ بناتا قہوہ خانہ کے کاؤنٹر تک پہنچا اور ویٹر سے کافی کا ایک کپ طلب کیا۔

"کافی ؟" کاؤنٹر کے ساتھ اُونچی کرسی پر براجمان ایک پستہ قد سکاٹ نے اپنی مخمور اور تحیّر زدہ آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ "شراب پیو لڑکے۔ شراب۔ سٹیمر پر ٹیکس فری ہے اور آدھی قیمت پر بکتی ہے۔" اُس نے لرزتے ہاتھوں سے کاؤنٹر پر رکھا شراب

کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ویٹر نے جو شاید تمام شب یہی فرض انجام دیتا رہا تھا فوراً الماری سے بوتل نکالی اور گلاس پھر سے لبالب بھر دیا۔

"میں تو ہر ہفتے فرانس کا ایک چکر لگا آتا ہوں" سکاٹ نے گلاس کے کناروں سے بہتی ہوئی جھاگ اُنگلی سے اکٹھی کی اور انگلی منہ میں ڈال کر چٹخارے لیتے ہوئے کہنے لگا "رات کا سٹیمر صبح تک ڈنکرک پہنچا دیتا ہے۔ سارا دن شہر میں آوارہ گردی کرنے کے بعد آسی شام واپسی۔ سٹیمر کا دوطرفہ کرایہ سستی شراب پی کر ہی پورا کر لیتا ہوں۔"

"آپ نے یہ لڑکیوں کا لباس مِنی سکرٹ کیوں پہن رکھا ہے؟" میں نے اُس کے چار خانوں والے رنگدار اونی کپڑے کے سکرٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ سکرٹ پر جیب کی بجائے ایک چرمی بٹوہ لٹک رہا تھا۔

"لڑکیوں کا لباس؟" اُس نے حیران ہو کر کہا اور جلدی سے شراب کی چُسکی لے کر بولا "یہ تو سکاٹ لینڈ کے جری مردوں کا روایتی لباس کِلٹ (KILT) ہے۔ ہاں البتہ تیز ہوا میں اِس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔" اور پھر اپنا بدبودار منہ میرے قریب لا کر بڑے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا "بڑے فائدے کی چیز ہے۔ فرانس کی عورتیں تو فدا ہو جاتی ہیں بس!"

پستہ قد سکاٹ جس کی ذی ہوشی کی عمر اب ایک دو گلاس ہی باقی تھی اِس قابل نہ تھا کہ بقیہ سفر اُس کی رفاقت میں خوشگوار طریقے سے کٹ سکے۔ میں نے کافی کی قیمت ادا کی اور کپ اُٹھا کر پیچھے مڑا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں سکون سے کافی پی سکوں اور ہو سکے تو بقیہ سفر کے دوران میں اونگھتا بھی رہوں۔ مگر قہوہ خانے کی تمام میزیں پُر تھیں اور فرش پر لوگ بیٹھے تھے۔ کیوں نہ واپس عرشے

پر ہی چلا جاتے۔" مَیں نے سوچا اور برساتی کا کالر گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر قہوہ خانے سے باہر آ گیا۔ عرشہ اب بھی ویران پڑا تھا۔ سٹیمر کے جنگلے کے اُوپر بندھے ہوئے رسّے پر دو بلب جھُول رہے تھے جن کی مدھم روشنی عرشے کے بھیگے ہوئے تختوں پر چمک رہی تھی۔ کیبن کے ساتھ آرام کُرسیوں کی ایک قطار تھی۔ مَیں نے جیب سے رومال نکال کر ایک کُرسی پر بچھایا اور بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ میرے ساتھ والی کُرسی پر کوئی مسافر سُرخ اُونی کوٹ اوڑھے بڑے اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے سو رہا تھا۔ رودبارِ انگلستان کی موجیں سٹیمر سے ٹکراتیں اور ایک ہلکی پھوار میرے چہرے کو تر کر جاتی۔ مَیں نے آنکھیں پھاڑ کر رسّوں سے جھولتے ہوئے قمقموں سے پرے دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں صرف لہروں کا شور اور مکمل تاریکی تھی۔ ایک دم سٹیمر کا گھگھیا یا ہوا بھونپو زور سے بجا۔

"اوہ، کتنی سردی ہے۔" یہ سُریلی اور ٹھٹھرتی ہوئی آواز ساتھ والی کُرسی پر پڑے سُرخ کوٹ میں سے آ رہی تھی۔

"ہُو۔ ہُو" کوٹ اب باقاعدہ حرکت میں تھا۔

"جواب تو دینا چاہیے۔" مَیں نے کافی کا کپ فرش پر رکھتے ہوئے سوچا۔ "آپ کو کس بھلے مانس نے عرشے پر سونے کا مشورہ دیا تھا؟" مَیں نے منہ کوٹ کے اُس بٹن کے قریب لے جا کر کہا جس کے آس پاس سُریلی آواز کے کان ہونے چاہئیں تھے۔

"اوہ" کوٹ ایک دَم اُچھل پڑا۔ کالر کے سرے پر دو خوفزدہ آنکھیں جھانک رہی تھیں "تم کون ہو؟"

یہ سوال ایسے ہی پوچھا گیا تھا جیسے ہمارے ہاں عامل و معمول کے مکالموں میں "تم کون ہو؟" پوچھا جاتا ہے۔

"مسافر" میں نے معمول کی بحر میں جواب دیا۔ مدھم روشنی میں مَیں صرف اتنا دیکھ سکا کہ عامل لڑکی ہے۔ بال لڑکوں کی طرز پر چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے ہیں۔ خوبصورت بھی ہے۔

"فرانس جا رہے ہو؟" اُس نے اُباسی لیتے ہوئے پوچھا۔ چہرے پر بلا کا بھولپن تھا۔

"ظاہر ہے" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "اِس سٹیمر پر سوار تمام مسافر فرانس ہی تو جا رہے ہیں۔"

اُس نے میری طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا اور ایک لمبی "اونہہ" کر کے پھر سُرخ کوٹ سر پر اوڑھ کر خاموشی سے لیٹ گئی۔ مَیں نے فرش پر پڑا ہوا کپ اٹھایا اور کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ بالکل یخ ہو چکی تھی۔ مَیں نے منہ بنا لیا۔ سُرخ کوٹ اب بالکل بے حِس و حرکت پڑا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اِس کوٹ کے ساتھ میرا رویہ انتہائی غیر معقول اور غیر شریفانہ تھا۔ بھلا مزے سے سوتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کے کان میں اِس طرح تان لگا دینا کہاں کی شرافت ہے۔ "معذرت کرنی چاہیئے" مَیں نے فیصلہ کیا۔

"ہیلو" مَیں نے آہستہ سے کوٹ کے کالر سے مخاطب ہو کر کہا۔ کوٹ ساکن پڑا رہا۔ "مَیں نے کہا۔ ہیلو" اب کی بار میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ کوٹ ایک دَم ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا "اوہ کیا مصیبت ہے۔ سونے بھی دو گے یا نہیں؟" وہ نہایت برہم نظر آ رہی تھی۔

"میں دراصل کہنا چاہتا تھا" مَیں نے سرگوشی کی "کہ مجھے افسوس ہے مَیں نے آپ کو خواہ مخواہ ڈرا دیا۔"

"ایک بار نہیں بلکہ دو مرتبہ" اُس نے دونوں مُٹھیاں بھینچ کر ننھے بچّوں کی مانند اپنی خواب آلود آنکھیں ملیں۔

"آپ فرانس جا رہی ہیں؟" میرے منہ سے بے اختیار وہی فقرہ نکل گیا جس پر پہلے ہنگامہ ہو چکا تھا۔

"ظاہر ہے ۔ ۔ ۔ اِس سٹیمر پر سوار تمام مسافر ۔ ۔ ۔" اُس نے انگلیاں نچا کر فقرہ

ادھورا چھوڑ دیا اور مسکرانے لگی۔ اب میرے پاس کوئی سُرخ کوٹ نہ تھا ورنہ میں بھی ایک ملبی "اونہہ" کر کے اسے اوڑھ کر وہیں کرسی پر لیٹ جاتا۔

"میں صرف معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اب آپ سو سکتی ہیں میں مخل نہیں ہوں گا۔"

میں نے خفت مٹانے کی ناکام کوشش کی اور جیب سے سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔

"ایک گھنٹے تک ہمیں فرانس کا ساحل دکھائی دینے لگے گا" اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنی چوکور چاندی ڈائل والی گھڑی پر ڈالی "اب سو کر کیا کروں گی؟"

میں خاموشی سے سگرٹ پیتا رہا۔

"کیا تم پہلی مرتبہ فرانس جا رہے ہو؟" اس نے گردن کو خفیف سا بل دے کر میری جانب دیکھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بڑی معصومیت سے کہنے لگی "میں تو ہر سال جاتی ہوں۔ دراصل میرا باپ انگریز ہے اور ماں فرانسیسی تھی۔"

"تھی؟" میں پوچھ بیٹھا۔

"ہاں مر چکی ہے۔" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تاسف کا شائبہ تک نہ تھا "تب میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے تو اس کی شکل بھی یاد نہیں۔ ڈیڈی ڈیئر ہر سال مجھے گرمیوں میں خالہ کے ہاں پیرس بھیج دیتے ہیں جہاں میں کرسمس تک رہتی ہوں۔ پیرس میں لندن کی نسبت سردی کا موسم قدرے گوارا ہوتا ہے نا؟ مجھے سردی بالکل پسند نہیں۔"

"کہتے ہیں ہر تہذیب یافتہ انسان کے دو ملک ہوتے ہیں۔ ایک اس کا اپنا اور دوسرا فرانس۔ آپ پر یہ روایت سو فیصد صادق آتی ہے۔" میں اب اس کی معصوم باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

"فرانس کی بجائے پیرس کہنا چاہیے۔ پیرس بے حد حسین ہے خاص طور پر دریائے سین کے رومانوی کنارے جہاں میں ہمیشہ شام ڈھلے سیر کو نکل جاتی ہوں

اور رات گئے تک اکیلی گھومتی رہتی ہوں۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ پیرس جیسے شہر میں اتنی حسین لڑکی کو لوگ اکیلے کیسے گھومنے دیتے ہیں۔

صبح کاذب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور جنگلے کے اوپر رسے سے لٹکتے ہوئے قمقموں کی روشنی اب ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ہمارے گرد پھیلا ہوا سمندر جو رات ایک مہیب عفریت کی مانند چنگھاڑ رہا تھا اب ایک وسیع سُرمئی صحرا کی طرح خاموش اور پرسکون لیٹا ہوا تھا۔ دُور اُفق پر ایک ہلکی سی لکیر اُبھری۔

"فرانس" اُس نے لکیر کی جانب اشارہ کیا اور پھر دوسری طرف منہ پھیر کر کہنے لگی "ویسے مجھے پاسکل کہتے ہیں۔"

مَیں نے اپنا تعارف کروایا۔

"تم کتنے خوش قسمت ہو جو آزادی سے گھوم سکتے ہو۔ کاش میں بھی تمہاری طرح پاسپورٹ جیب میں ڈال سامان کاندھے پر رکھ مزے سے دنیا کی سیاحت پر جا سکوں۔" اُس نے آزردہ ہو کر کہا "میرے لیے تو یہ دیوانے کا خواب ہے" وہ بے حد اُداس نظر آ رہی تھی۔

مَیں نے پہلی مرتبہ اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں اور ناک قدرے اوپر کو اُٹھی ہوئی۔ سُرخ و سفید گول چہرے پر چھوٹے کٹے ہوئے بال بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ مَیں نے سوچا اگر اسے مردانہ کپڑے پہنا دیئے جائیں تو وہ ایک نہایت حسین و جمیل ہپّی لڑکا لگے گی۔ ہم وہاں بیٹھے خاصی دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے پیرس کے بارے میں بتاتی رہی اور میں اسے افغانستان کی کاروان سراؤں میں کہی جانے والی قدیم لوک حکایتیں سُناتا رہا یہاں تک کہ ڈنکرک کا شہر دکھائی دینے لگا۔ اکثر مسافر قہوہ خانے سے نکل کر اوپر عرشے پر آ چکے تھے اور

ہمارے ساتھ والی تمام کُرسیاں پُر ہو چکی تھیں۔ بندرگاہ میں داخلے پر سٹیمر کا بھونپو زور زور سے بجنے لگا اور مسافر اپنا سامان سنبھال کر اُترنے کی تیاری کرنے لگے۔ مَیں نے جیب سے کنگھی نکال کر اپنے بال سنوارے اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تمام شب کی بیٹھک نے پورے جسم کو اکڑا کے رکھ دیا تھا۔ پاسکل ابھی تک کرسی پر بیٹھی تھی اور سُرخ کوٹ اُس کی گود میں پڑا تھا۔

"کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟" مَیں نے اپنا سفری تھیلا کاندھے پر رکھا اور ایک ہاتھ میں پاسکل کا سُوٹ کیس اُٹھا لیا۔

"تم گاڑی میں جاکر بیٹھو میں آجاؤں گی۔" اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

"محترمہ پہلے آپ" مَیں نے شولری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جُھک کر کہا۔

پاسکل نے سُرخ کوٹ اُٹھایا اور بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مَیں اُسی طرح جُھکا ہوا اُس کے راستے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے جھجکی اور پھر بندرگاہ کو اُترتی ہوئی سیڑھی کی طرف رُخ کر کے چلنا شروع کر دیا۔ مَیں سیدھا کھڑا ہو کر اُس کے پیچھے چلنے کو تھا مگر چل نہ سکا۔ مجھے یوُں محسوس ہوا جیسے میرا سانس رُک گیا ہو۔ میرے قدم عرشے کی گیلی لکڑی پر میخوں سے ٹھونک دیتے گئے ہوں۔ مَیں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ قدرت کا ایک بھونڈا مزاق تھا۔ خالق اپنے تخلیقی عمل میں کہیں چُوک گیا تھا۔ وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ چلنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ لڑکھڑاتی ٹھوکریں کھاتی ہوئی پاسکل۔ وہ لنگڑی تھی سب سے لمبی اور غُصّے کے جذبات سے میرا دماغ دہکنے لگا۔ مَیں نے اپنے سینے میں اِس بے بس لڑکی کے لیے بے پناہ ہمدردی اور رحم کی ایک لہر دَوڑتی ہوئی محسوس کی۔ مَیں وہیں بے حِس و حرکت کھڑا اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ اپنی ران پر سختی سے جمائے بڑے تکلیف دِہ انداز میں لنگڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ سیڑھی کے قریب پہنچ کر

اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"کیا یہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے؟" اُس کے نازک لبوں پر حزن آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔ مَیں نے بے یقینی کے عالم میں ایک مرتبہ سر کو جھٹکا اور پھر تیزی سے چلتا ہوا اُس کے پاس آ گیا

"مجھے معلوم ہے" اُس نے کہنا شروع کیا "تمہارے دل میں اِس وقت میرے لیے رحم اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہوں گے"۔

"نہیں ایسا تو نہیں" مَیں نے جلدی سے کہا۔

"مجھے جھوٹ پسند نہیں۔ سب لوگ مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ میں ہمیشہ سے رحم کے جذبات کی بھکاری بن جاتی ہوں ۔تم دوسروں سے مختلف نہیں ہو"۔

مَیں خاموش کھڑا اُس کے اُداس چہرے کو دیکھتا رہا۔

"ڈیڈی نے میری سولہویں سالگرہ پر مجھے ایک سپورٹس کار تحفے میں دی تھی اور سترھویں سالگرہ منانے سے پہلے اُسی کار کے ایک حادثے نے میری یہ حالت کر دی"۔

"مجھے بے حد افسوس ہے" مَیں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ انگریزی زبان میں افسوس کے جذبات کا اظہار کِس قدر مشکل ہوتا ہے مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔

"کوئی بات نہیں" اُس نے تلخی سے کہا "مَیں اب عادی ہو چکی ہوں"۔

"کیا تم دونوں کا واپس انگلستان جانے کا ارادہ ہے"۔ بندرگاہ پر کھڑے سٹیمر کے سٹوئرڈ نے بے صبری سے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر پکارا "باقی تمام مسافر اُتر چکے ہیں"۔

مَیں نے سُرخ کوٹ اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہم آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ کسٹم ہاؤس کے پہلو میں پیرس جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہو گئے۔

سفر کے دَوران میں وہ خاموشی سے کھڑکی باہر تکتی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر سال

اِنہی راہوں سے گزرنے والی پاسکل کو ڈبّے سے باہر گزرتے ہوئے فرانس کے دیہی مناظر سے کوئی دِلچسپی نہ تھی۔ وہ سرسبز کھیتوں اور چراگاہوں کے دامن میں پھیلی ہوئی دُھند کو اِس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ اُس کی نیلی آنکھیں جنہیں دیکھ کر مجھے ایران کا نیلگوں آسمان یاد آگیا تھا، کسی اور جہان میں تھیں۔ اُس کے حسن میں میں حُزن و ملال کے روگ کو میں جان گیا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ وہ اتنی قبول صورت ہوتے ہوئے بھی پیرس کی پُرفسوں شامیں دریائے سین کے کنارے اکیلے کیوں گزارتی ہے۔ جہاں گردی اُس کے لیے دیوانے کا خواب کیوں ہے۔ وہ اپاہج تھی۔ پچھلے پانچ ماہ کی سیاحت کے دَوران میں مجھے کہیں بھی کسی ایسی لڑکی سے سابقہ نہ پڑا تھا جسے ایک مرتبہ پھر ملنے کی ہُوک میرے دل سے اِس شدت سے اُٹھی ہو۔ مَیں چاہتا تھا کہ پاسکل کی اُداس نیلی آنکھیں پھر سے مُسکرانے لگیں۔

"پاسکل" مَیں نے کھڑکی کا شیشہ بجا کر اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"ہوں" اُس کی آنکھیں نیلگوں قمقموں کی مانند بے جان تھیں۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھیانک خواب سے بیدار ہو رہی ہو۔

"تم اگر پسند کرو تو پیرس پہنچنے پر میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں؟" مَیں نے مُسکراتے ہوئے پیش کش کی۔

"اِس کی ضرورت نہیں" وہ بدستور باہر دیکھتی رہی "میری خالہ مجھے سٹیشن پر لینے آ رہی ہیں۔"

"پاسکل" مَیں نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ "کیا تم اِس سفر کے خاتمے پر آج شام مجھے مِل سکتی ہو؟"

"وہ کِس لیے؟" اُس نے پلٹ کر میری طرف اِس طرح دیکھا جیسے مَیں نے کوئی اَن ہونی بات کہہ دی ہو۔

"مَیں چاہتا ہوں کہ تم ہر شام دریائے سین کے کنارے اکیلی نہ گھومو۔ مَیں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دَم ہنسنے لگی مگر اُس کی ہنسی مجھے بے حد ڈراؤنی لگ رہی تھی "میں جانتی ہوں میرا چہرہ بے حد دِل کش ہے مگر اِس کا کیا کیا جائے کہ اِس چہرے کا حُسن کسی نیم تاریک قہوہ خانے کے کونے میں پڑی ہوئی کُرسی پر صرف بیٹھے رہنے کی حد تک ہی محدُود ہے۔ اُٹھ کر چلنے کی تکلیف وہ کوشش اِسی دِل کش چہرے کو انتہائی بدصورت بنا دیتی ہے اور انسان ساری زندگی ایک کونے میں بیٹھے تو گزار نہیں سکتا۔"

"اِن باتوں کا زندگی کے حقائق سے دُور کا بھی تعلق نہیں" مَیں نے جذباتی ہو کر کہا۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ میری دِلی خواہش ہے کہ ہم دونوں پیرس میں ضرور ملیں۔"

"سوچ لو" اُس نے میز پر کہنیاں رکھ کر اپنا گول چہرہ ہتھیلیوں پر جما دیا "مَیں جب تمہارے ساتھ چلوں گی تو بوڑھی عورتیں آپس میں کھسر پھسر کریں گی۔ لڑکیاں کہیں گی ایسے قبول صورت مشرقی نوجوان کو پُورے پیرس میں ایک اپاہج لڑکی ہی پسند آئی اور فرانسیسی مرد جن کے لیے عورت کی خوبصورتی کے پیمانے کُولہوں سے اُوپر نہیں جاتے تمہاری عقل پر ماتم کریں گے۔ تضحیک ہو گی تمہاری۔"

"تم مجھے اِن سطحی دلائل سے قائل نہیں کر سکتیں" مَیں نے نرمی سے کہا "ہاں اگر تم ویسے ذاتی طور پر مجھے ملنا پسند نہ کرو تو اور بات ہے۔"

"بالکل نہیں" اُس کے لہجے کی بے اختیاری میرے لیے حیران کُن تھی "میرا مطلب ہے میں تمہیں ملنا چاہتی ہوں۔ ضرور۔۔۔" اُس نے چھوٹے بچوں کی طرح بار بار اِس طرح سَر کو جُنبش دی جیسے وہ اپنے جذبات کو پُوری طرح بیان کرنے سے قاصر ہو۔

"ہماری گاڑی دو بجے پیرس پہنچے گی" مَیں نے گھڑی پر نظر ڈال کر مُسکراتے ہوئے کہا "اور مَیں آج شب پُورے سات بجے دریائے سین کے کنارے آئفل ٹاور کے تلے

تمہارا انتظار کروں گا۔"

وہ بدستور سر ہلا رہی تھی اور اُس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔

ہماری گاڑی وقتِ مقررہ سے دس منٹ قبل ہی پیرس کے "سینٹ لازار سٹیشن" پر پہنچ گئی۔ ہم دونوں پلیٹ فارم پر اُترے تو سامنے پاسکل کی قدرے فربہ مگر بے حد خوش شکل خالہ کھڑی تھیں جو اُسے دیکھتے ہی "پاسکل مُوا شیری" کہہ کر لپٹ گئیں۔ مَیں نے اپنا سامان کاندھے پر اُٹھایا اور سٹیشن سے باہر معلومات کے دفتر سے "کیمپنگ" کا پتہ دریافت کر کے "نیولی" جانے والی ٹرام پر سوار ہو گیا۔ کنڈکٹر نے مجھے نیولی پُل کے پاس اُتار دیا۔ مَیں نے دفترِ معلومات کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دریائے سین کے اُونچے کنارے کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ "بوئے ڈی بولون" تھا جس کا شمار شہر کے خوبصورت ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ پیرس کی یہ نواحی بستی دریائے سین کے خاموش پانیوں کے ساتھ ساتھ میلوں تک چلی جاتی ہے۔ نیچے دریا کی جانب جھانکیے تو کنارے پر چھوٹے چھوٹے رہائشی مکان نظر آتے ہیں جن کے مالک ہفتہ وار تعطیل کے دَوران میں پیرس کے ہنگاموں سے دُور سکون کی تلاش میں یہاں آ بستے ہیں۔ چند جگہوں پر خوش نظر باغیچوں کے بالمقابل پانی میں ہاؤس بوٹ تیر رہے تھے۔ مَیں نے سفید رنگ کے ایک آہنی پھاٹک سے نیچے جھانکا تو ہاؤس بوٹ کے دروازے پر کھڑا ایک خونخوار قسم کا کُتا غرّا کر میری طرف لپکا۔ مَیں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ چونکہ اِن ہاؤس بوٹوں کے مالک یہاں عارضی طور پر رہائش پذیر ہوتے ہیں اِس لیے اُن کی غیر موجودگی میں رکھوالی کے لیے کُتّے باغ میں کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مکانوں اور ہاؤس بوٹوں کا سلسلہ ختم ہوا تو دریا کے کنارے ایک وسیع اور سر سبز سیرگاہ دکھائی دی۔ شاہ بلوط اور بید کے درختوں کی چھاؤں میں چند بوڑھے مچھلی کے شکار میں مشغول تھے۔ مَیں نے سوچا کہ پیرس میں قیام کے دَوران میں کچھ وقت نکال کر میں بھی اِس پُرسکون فضا میں چند لمحے گزاروں گا۔

یہ تمام علاقہ میرے دائیں ہاتھ پر تھا۔ بائیں بازو میں پیرس کے متموّل لوگوں کے سفید
بُراق مکانوں کی قطاریں تھیں جو فرانسیسی طرزِ تعمیر کے نازک اور خوبصورت نمونے تھے۔
کیمپنگ تک پہنچا تو تھکن سے نڈھال ہو چکا تھا۔ کیمپنگ کیا تھی دریا کے کنارے پُورا
شہر آباد تھا۔ سُپر مارکیٹ، ریستوران اور درجنوں کُشادہ سڑکیں۔ لیکن بدقسمتی سے اِس شہر
میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ دفتر سے معلوم ہوا کہ اِس سال سیّاحوں کی بہتات کی وجہ
سے رہائش کا مسئلہ بے حد پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اکثر سیّاح ہوٹلوں میں جگہ نہ ملنے پر
کیمپنگ کا رُخ کرتے ہیں اور فی الحال میرے چھوٹے سے خیمے کے لیے بھی جگہ نایاب تھی۔
عام حالات میں شاید یہ خبر اتنی حوصلہ شکن ثابت نہ ہوتی اور مَیں کسی پارک میں شب بسر کر
لیتا مگر مجھے تو آج شام پاسکل کو مِلنا تھا اور پانچ بجنے والے تھے۔ مَیں نے سامان اُٹھایا
اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس نیولی کے پُل تک آ گیا اور ٹرام میں سوار ہو کر
شہر کے مرکز میں ایک ایسی جگہ اُتر گیا جہاں کیمپنگ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق
درجنوں ہوٹل والے میری راہ تک رہے تھے۔ تنگ گلیوں اور بازاروں کے کئی "پانسیان"
یعنی پرائیویٹ خاندانی ہوٹلوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر ہر جگہ "کمپلیٹ" یعنی کوئی جگہ
نہیں کا ٹکا سا جواب مِلا۔ سیاہ لباس میں ملبوس ایک ضعیف عورت جس نے مجھے کئی
ہوٹلوں کے اندر جاتے اور اُسی لمحہ باہر نکلتے دیکھا تھا میرے پاس آئی اور اپنا سفید
بگلا سر ہلا کر بولی "ہوٹل موسیو"؟ موسیو نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ بڑھیا کے ہاتھوں
میں ایک آہنی پنجرہ لٹک رہا تھا جس میں ایک گنجا سا بدصورت طوطا مجھے دیکھتے ہی
ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ اُس نے پنجرے کا دروازہ کھول کر طوطے کو ایک چپٹ رسید کی
اور پھر مجھے سر کے اشارے سے پیچھے آنے کا کہہ کر میرے آگے آگے چلنے لگی۔ خاصی دُور
چلنے کے بعد ایک گلی کے موڑ پر ایک پُرانی وضع کے مکان کے اندر داخل ہوئی جس کے
باہر "ہوٹل رچمنڈ" کا بورڈ آویزاں تھا۔ اُس نے ڈیسک پر کھڑی مالکن سے فرانسیسی میں کچھ

کہا اور پھر طوطے کا پنجرہ ایک کونے میں رکھ کر وہیں سے ایک لمبا برش اٹھا کر فرش صاف کرنے لگی۔ وہ اس ہوٹل میں خادمہ تھی۔ مالکن نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے کرائے کی تفصیل بتائی۔ کمرے کا کرایہ بیس فرانک اور غسل کے لیے پانچ فرانک زائد۔ ہوٹل باہر سے اگرچہ بے حد شکستہ اور گندا لگ رہا تھا مگر اندر ماحول ایک صاف ستھرے درمیانے درجے کے گھر کا تھا۔ میں نے رجسٹر پر نام درج کیا۔ پاسپورٹ جمع کروایا اور چابی لے کر دوسری منزل پر واقع کمرے میں آ گیا۔ وقت دیکھا تو سات بجنے کو تھے۔ غسل کا تردد کیے بغیر میں نے کمرے میں لگے پانی کے نل سے منہ پر چند چھینٹے مارے اور جلدی سے کپڑے بدل کر باہر چوک میں آ گیا جہاں زیرِ زمین ریلوے کا سٹیشن تھا۔ لاتعداد سیڑھیاں اُترنے کے بعد ایک طویل زمینی راستہ آیا جسے طے کر کے جب میں پلیٹ فارم کے پھاٹک پر پہنچا تو ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ طلب کیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹکٹوں کی کھڑکی وہیں کہیں پلیٹ فارم پر ہوگی مگر چیکر نے بتایا کہ سٹیشن میں داخل ہوتے وقت سیڑھیوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ چنانچہ جب میں وہاں سے ٹکٹ حاصل کر کے دوبارہ واپس آیا تو اس بھاگم بھاگ میں بیس منٹ اور ضائع ہو چکے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ غلط گاڑی پر سوار ہو گیا اور جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ بہر حال ایک فرانسیسی طالبہ کام آئی اور اُس نے مجھے آئفل ٹاور کے سٹیشن پر پہنچایا۔ میں سٹیشن سے باہر نکلا تو میری گھڑی پر آٹھ بج چکے تھے۔ سامنے دریائے سین کے کنارے زنگ آلود آئفل ٹاور ایک جناتی پرند کی مانند زمین میں پنجے گاڑے آسمان کی وسعتوں میں سر دیئے ہوئے تھا۔ ٹاور کے نیچے سیاحوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ فوٹوگرافر۔ آئس کریم اور تصویری کارڈ بیچنے والے۔ قہوے خانے غرض کہ خوب رونق تھی۔ میں نے اس ہجوم میں ایک ایک چہرے کو یاس و اُمید کی نظروں سے دیکھا مگر پاسکل وہاں نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پورے سات بجے وہاں آئی ہوگی اور مجھے وہاں نہ پا کر مایوس لوٹ گئی ہوگی۔ شاید وہ سمجھتی ہو کہ میری دلچسپی وقتی طور پر تھی

اور بعد میں صورتِ حال کا احساس کرتے ہوئے میں نے اُسے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ اس خیال نے مجھے بے حد غمگین کر دیا۔ مجھے اب پیرس میں اپنی پہلی شام سے بالکل دلچسپی نہ رہی تھی۔ میں واپس ہوٹل آگیا اور بستر کے نرم گدّوں میں منہ چھپا کے چپکے چپکے سے سو رہا۔

پیرس کا شمار یورپ کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ ازمنۂ قدیم میں جب یہ علاقہ صرف دلدلوں اور چند جزیروں پر مشتمل تھا۔ سیلٹ نسل کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ تاریخی کُتب میں پیرس کا اوّلین حوالہ جولیس سیزر کے زمانے سے ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں پارلیسی نامی قبیلہ آباد ہے۔ پیرس پارلیسی قبیلے کا شہر۔ وحشی ہُنوں کا سردار ۳۰۷ ء میں اِس شہر پر حملہ آور ہوا لیکن اہلِ شہر کے عقیدے کے مطابق (Saint Geneveive) سَنت جینیے دِیو کی کرامتیں اور ٹوٹکے اُس کی راہ میں آئے اور وہ ناکام واپس لوٹ گیا۔ اِس خدمت کے صِلے میں اب بھی جینیے دِیو کو پیرس کا (Patron Saint) یعنی محافظ سَنت مانا جاتا ہے۔ پھر شارلیمان کا دَور آیا جو خلیفہ ہارون الرشید کا ہم عصر تھا اور جو ہسپانیہ فتح کرنے کے شوق میں برف پوش پیرانیز کے پار جا کر مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی فوج کی گت بنوا بیٹھا اور ٹھنڈا ٹھنڈا واپس فرانس آگیا۔ اُس کے بعد کی تاریخ میرے ذہن میں گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ لُوئی نام کے درجنوں حضرات جن کے سیریل نمبر ہمیشہ ذہن سے اُتر جاتے ہیں اور پھر آخر میں نپولین کا دور دَورہ۔ اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ تیار ہو کر نیچے ڈیسک پر آیا تو وہاں ہوٹل کی درمیانی عمر کی خوش شکل مالکہ رجسٹر پر جُھکی خانہ پُری میں مصروف تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی چابی اُس کے حوالے کی اور باہر آگیا۔ میرے ذہن میں آج کے لیے کوئی واضح پروگرام موجود نہ تھا۔ پارلیسی اور میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ تھے مگر ہمارے درمیان دوستی کی

بنیادیں کبھی بھی گہری نہ ہو سکیں۔ میں کبھی اُن لاتعداد تاریخ دانوں، ادیبوں اور فنونِ لطیفہ کے شیدائیوں سے اتفاق نہیں کر سکا جن کی رائے میں دُنیا میں اگر کوئی شہر ہے تو ہمیں است۔ مجھے ہمیشہ یہاں آکر گھٹن اور تنہائی کا احساس ہوا۔ سیاحوں کی بھرمار، مقامی باشندوں کی سرد مہری اور حد درجہ مہنگائی ایسے عناصر ہیں جو مجھ جیسے آزادی پسند سیاح کی رُوح کا گلا گھونٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ گرمیوں میں پیرس کے باشندوں کی اکثریت ساحلی مقامات کی طرف کوچ کر جاتی ہے اور شہر میں صرف نکمے آوارہ گرد، قلاش مصور، غیر ملکی سیاح اور پاگل کُتّے رہ جاتے ہیں جو حضرات ساحلی مقامات پر جانے کی توفیق نہیں رکھتے اُن کا سلوک سیاحوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ اُن کی آمد سے مُخل ہوتے ہوں اور یہی بڑی بات ہے کہ وہ سیاحوں کو اپنا خوبصورت شہر دیکھنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

پہلی مرتبہ پیرس آیا تو موسم سرد، نم آلود اور افسردہ تھا۔ میں کئی روز اِس کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا لیکن کسی فرانسیسی نے مجھ سے بات تک کرنی گوارا نہ کی۔ اوّل تو انگریزی سمجھتے ہی نہیں اور بفرضِ محال دو لفظ آتے بھی ہوں تو منہ پر نہیں لاتے۔ بہرحال میں نے مشہور عمارتیں اور عجائب گھر دیکھ کر سوئٹزرلینڈ کی راہ لی۔ دوسری مرتبہ مصوری کا جنون سیدھا مومارت کے علاقے میں لے گیا جہاں چند روز ایک گندے فلیٹ میں اُلٹے سیدھے نقوش کھینچے۔ قہوہ خانوں میں بھٹکتے ہوئے فاقہ کش مصوروں کو ڈبل روٹیاں خرید کر دیں اور پھر اپنے جرمن دوست فالکر کے کہنے پر بوریا بستر سمیٹ کر واپس لندن چلا گیا۔ تیسری مرتبہ جنوبی فرانس کی سیاحت پر نکلا تو ایک شب پیرس میں بھی بسر کرنی پڑی اور اب کے بھی یہ شہر خواہ مخواہ ہسپانیہ کی راہ میں آگیا تھا۔ میں نے سوچا آج میں یہاں بالکل آوارہ اور بغیر کسی مقصد کے گھوموں گا شاید اسی طریق میں اِس شہر کی رُوح کو پالوں۔ آخر اِس شہر میں جس کی تعریف و توصیف میں جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کسی شہر کے بارے میں نہیں لکھی گئیں کچھ تو ہو گا۔

یئں ہوٹل کی گلی سے نکل کر بائیں ہاتھ پر پیرس کی اور غالباً دنیا کی خوبصورت ترین سڑک (اس میں لاہور کی مال روڈ شامل نہیں) شانزے لیزے پر آ گیا۔ شہر کے مرکز میں نپولین کی فتوحات کی یاد میں تعمیر کردہ "فتح کی محراب" کھڑی ہے جس کے عین نیچے ایک غیر معروف سپاہی کی قبر پر ابدی شعلہ روشن ہے۔ یہ سپاہی اُن تمام فرانسیسیوں کی نمائندگی کرتا ہے جنہوں نے ملک وملت کے لیے جانیں نثار کیں۔ اس محراب سے بارہ خوبصورت اور کشادہ سڑکیں نکل کر پیرس کے سینے پر بچھ جاتی ہیں۔ ان سڑکوں میں سے ایک کا نام شانزے لیزے ہے۔ یہ سڑک ایک میل سے زیادہ لمبی ہے اور کانکورد کے مشہور چوک پر ختم ہوتی ہے جہاں انقلابِ فرانس کے دوران میں گلوٹین گاڑھ کر تین ہزار لوگوں کے سر قلم کر دیئے گئے۔ ان میں لوئی (سیریل نمبر سولہ)، ماری انتونیتا۔ دانتن اور کورڈے بھی شامل تھے۔ آج اِس خونیں چوک کے بیچ شاہکار مجسموں سے مزین اَن گنت فوارے اُبل رہے ہیں۔ "شانزے" جیسا کہ اِس سڑک کو اہلِ پیرس پیار سے پکارتے ہیں ۱۶۱۶ء میں ماری ڈی میڈیکا کے نقشے کے مطابق تعمیر ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لیے ایک وسیع فٹ پاتھ ہے جس کے ساتھ درجنوں قہوہ خانے۔ زنانہ ملبوسات کی فیشن ایبل دکانیں۔ دفاتر اور بینک وغیرہ واقع ہیں۔ جہاں لندن کے بڑے سٹوروں میں شوکیس کو دنیا جہان کی الابلا سے ٹھونس کر تیز روشنیوں سے چمکا دیا جاتا ہے وہاں پیرس کی ایک معمولی دکان کا شوکیس چاہے اُس میں صرف ایک ٹائی سجی ہو اور روشنی کے لیے ایک موم بتی جل رہی ہو نفاست پسندی اور خوبصورتی کا شاہکار ہوتا ہے۔ "شانزے" پر خاصی دیر گھومنے کے بعد میں مونمارت کے علاقے میں چلا گیا اور جانی پہچانی گلیوں میں گھومتا رہا۔ پچھلے پہر کلیسائے سَیکرے کر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مصور بڑے ادب سے میرے پاس آیا اور ایک تصویر پیش کر دی۔ مجھے خبر نہ تھی کہ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ ایک طرف بیٹھ کر میری ہی تصویر بنا رہا تھا۔

میں نے بہت بہت شکریہ ادا کر کے تصویر قبول کر لی مگر معلوم ہوا صرف یہی کافی نہ تھا بلکہ بیس فرانک بھی ساتھ ہونے چاہئیں۔ بہرحال سودا دس میں طے ہو گیا۔ تصویر بغل میں داب کر مَیں نے سوچا کہ مصوّروں کی کثرت کی وجہ سے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں اِس لیے کیوں نہ ایک دو گھنٹے لوور کے مشہور عجائب گھر میں گزارے جائیں۔ میلو جزیرے سے دریافت شدہ وینس اور وِنگڈ وِکٹری کے مجسمے ہر بار فن کا ایک نیا پہلو لے کر آپ کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

زیرِ زمین ریلوے جب لوور کے سٹیشن پر رُکی تو میں دنگ رہ گیا۔ فرانسیسیوں کی ساری حسن پرستی اِس سٹیشن پر صَرف ہو گئی تھی۔ پہلے تو خیال آیا کہ ڈرائیور نے گاڑی صرف میری سہولت کی خاطر سٹیشن کی بجائے سیدھی لوور کے عجائب گھر کے کسی عالی شان ہال میں جا ٹھہرائی ہے۔ پلیٹ فارم ہلکی اور نرم روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیواروں کو تراش کر اُن میں جابجا اطالوی اور یونانی مجسمے سجے تھے۔ چھت سے بیش قیمت فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ سٹیشن ماسکو کے زیرِ زمین ریلوے سٹیشنوں کے ہم پلّہ تھا۔ میں ایک یونانی مجسمے کے خدوخال کا جائزہ لے رہا تھا کہ میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک مسافر نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مَیں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی پاکستانی حضرت جن کی صورت سے میں ناآشنا تھا کھڑے مسکرا رہے تھے۔ "آپ کا نام مستنصر ہی ہے نا؟"

مَیں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یادداشت پر زور دیا کہ یہ حضرت کون ہیں۔

"آپ کسی زمانے میں نیشنل کالج آف آرٹس بڑی باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ مَیں وہاں اپنے ایک دوست تنویر کے پاس اپنے گھر کا نقشہ بنوانے کی غرض سے جایا کرتا تھا۔ تنویر کو اُنہی دنوں لاہور چڑیا گھر کی نئی عمارت بنانے کا کام بھی مِلا ہوا تھا۔ چنانچہ میرے گھر کا جو نقشہ مکمل ہوا اُس میں باورچی خانے کی بجائے ریچھوں کے کمرے کا نقشہ بن گیا اور ہمارا باورچی خانہ چڑیا گھر کے نقشے میں منتقل ہو گیا۔ بہرحال نیشنل کالج

اور اِن حضرت کے درمیان رشتے کی گتھی نہ سلجھ سکی ۔" مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔" مَیں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"میرا نام کُماری ہے" ۔ اُن صاحب نے انکساری سے جواب دیا "ایک روز تنویر کے کمرے میں جدید مصوّری پر آپ سے بڑی گرماگرم بحث ہوئی تھی ۔"

" آہا کُماری صاحب!" مَیں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ویسے اُن کی زبان پر ہی اعتبار کیا، پہچان مَیں اب بھی نہیں پایا تھا۔ اپنے بارے میں اُنہوں نے بتایا کہ پچھلے ایک برس سے پاکستان کے ایک صنعتی ادارے کے وظیفے پر پیرس میں مقیم ہیں اور یہاں پر پاکستانی مصوّروں کی تصاویر کی نمائشیں ترتیب دیتے ہیں۔ میرے بارے میں پوچھنے لگے تو مَیں نے بتایا کہ فی الحال تو لوور کا عجائب گھر دیکھنے کی نیّت سے چلا تھا۔ کہنے لگے لوور جانے کے لیے صبح کا وقت موزوں ہوتا ہے اِس وقت تو سیاحوں کی بھرمار سے صرف تصویروں کے فریم اور مجسّموں کی ٹانگیں ہی نظر آئیں گی۔ خیر وہ بڑی چاہت سے مجھے بُلیے وارڈ بپ لِس میں واقع اپنے دفتر میں لے گئے جس کے باہر (Curosites De L ' Artisanat Du Pakistan) کا بورڈ لگا تھا یعنی پاکستانی فنکاروں کے بنائے ہوئے فن پارے کُماری صاحب نے مجھے اپنی بنائی ہوئی تصاویر اور مٹّی کی مُنقّش اینٹیں دکھائیں جنہیں اہلِ پیرس نے بے حد سراہا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد وہ مجھے واپس ہوٹل چھوڑ گئے اور مَیں لوور دیکھے بغیر ہی سو گیا۔

دوسرے روز میں کُماری صاحب کے مشورے کے مطابق لوور عجائب گھر دیکھنے کے لیے صبح سویرے تیار ہو کر نیچے ڈیسک پر آ گیا۔ ہوٹل کی مالکہ کو کمرے کی چابی تھمائی تو اُس نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

"تم اِس ہوٹل کے سب سے عجیب مکین ہو" اُس نے جوانی کے زمانے کی ایک

بھولی بسری ادا کو تازہ کرنے کی کوشش میں لب بگیڑ کر کہا۔

"پاکستانی ہونے کی وجہ سے؟" مَیں نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں موسیو مُستنصر" وہ کھِکھلا کر ہنس دی "تم دو روز سے یہاں مقیم ہو۔ کل صبح شہر کی سیر کو نکل گئے اور سرِ شام آکر سو رہے۔ آج بھی اتنی سویرے تیار ہو کر باہر جا رہے ہو۔"

"اِس میں کون سی عجیب بات ہے؟"

"تم پیرس میں ہو نوجوان" اُس نے دونوں آنکھیں میچ کر چنچل بننے کی ناکام کوشش کی۔ "تمہیں چاہیے کہ صرف سرِ شام باہر نکلو۔ تمام شب کسی شوخ جگہ بسر کرو اور صبح سویرے ایک چھوٹی سی موٹی سی عورت بغل میں دابے واپس ہوٹل لَوٹو۔"

چھوٹی سی موٹی سی عورت کی اصطلاح غالباً فرانسیسی سے مُستعار لی گئی تھی۔ "میں ایسی رومانی مہم جوئی کے لیے موزوں نہیں ہوں" مَیں نے جان چھڑانے کی غرض سے ہنس کر کہا اور ہوٹل سے باہر آگیا۔ آج آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ سارا دِن لوُور کے عجائب گھر میں رکھے ہزاروں نادر مجسّموں اور شاہکار تصویروں کے درمیان گزاردوں لیکن جب تولیئرز کے باغات کے پہلو میں واقع لوُور کی عظیم الشان عمارت کے دروازے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ منگل کے روز عجائب گھر بند ہوتا ہے۔

"واقعی انگریز فرانسیسیوں کے بارے میں درست کہتے ہیں" مَیں نے مایوس ہو کر سوچا "اِن مینڈکوں کی ہر بات اُلٹی ہوتی ہے۔ اِن کی ڈبل روٹی واہیات حد تک لمبی ہوتی ہے۔ ملاقات ہونے پر آپ کو نہایت بے شرمی سے گالوں پر چومتے ہیں (جنگ کے دَوران میں جب فرانسیسی صدر نے چرچل کے گالوں پر چٹاخ چٹاخ بوسے رسید کیے تو انگریزوں کے چہرے کئی روز تک سُرخ رہے) "جنس" کا ذکر کرتے وقت ذرّہ بھر نہیں شرماتے اور پھر کم بخت گھوڑے بھی کھاتے ہیں اور اب میرے تجربے کے مطابق اپنے

عجائب گھر اتوار کی بجائے منگل کے روز بند کرتے ہیں"۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟" میں نے یونانی ستونوں کے ملبے بر آمدے میں کھڑے ہو کر سوچا۔ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور تولیرز کے باغات ہلکی پھوار میں بھیگ رہے تھے "دریائے سین کے کسی خوبصورت پل کے نیچے بیٹھ کر بارش کا نظارہ کیا جائے"۔ میں وہاں سے نکل کر کانکورد کے چوک میں آ گیا جہاں برہنہ عورتوں کے مجسموں کے سروں پہ آویزاں پانی کے تھالوں میں سے فوارے اُبل رہے تھے۔ چوک کے دوسری جانب سکندر سوئم کا مشہور پل تھا۔ میں سڑک سے دریا کے کنارے تک جاتی ہوئی سیڑھیوں پر اُتر گیا۔ معلوم ہوا کہ پل کے نیچے بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہونے کا لاجواب خیال مجھ سے پہلے اور لوگوں کے ذہن میں بھی آچکا تھا جو اب یہاں براجمان تھے۔ مچھلی کے شکار پر آئے ہوئے بوڑھے۔ نکمے آوارہ گرد۔ چند غیر ملکی سیاح اور پیرس کا ٹریڈ مارک یعنی ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر نوجوان جوڑے۔ میں اِس ہجوم پر ایک نظر ڈال کر پھر واپس سڑک پر آ گیا۔ دریا کے پار نپولین کا مزار انولید دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک مرتبہ پھر زیارت کر لی جائے کم از کم اُن بوسیدہ جھنڈوں کی تعداد ہی گن لی جائے جو مزار سے متصل ہال کی دیواروں سے لٹک رہے ہیں۔ یہ جھنڈے اُن یورپی ملکوں کے ہیں جنہیں نپولین نے مختلف جنگوں میں مات دی تھی۔ کہتے ہیں نپولین کو اِس قسم کے جھنڈے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ یہی شوق اُسے کشاں کشاں ماسکو بھی لے گیا۔ واپسی پر وہ ایک دو رُوسی جھنڈے تو لے آیا مگر ہال میں آویزاں جھنڈوں سے دُگنے روسیوں کے ہاتھوں گنوا بیٹھا۔

میں سکندر سوئم کے پل پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر کلیسائے سیکرے کر کے سفید مشرقی گنبد نظر آ رہے تھے۔ میں پیرس کے آسمان پر بکھرے ہوئے کالے بادلوں میں سے چھنتی ہوئی پھوار میں بھیگتا۔ پیرس اور پیرس والوں کو صلواتیں سُناتا چلا جا رہا تھا کہ کانکورد چوک میں سے ایک تیز رفتار نیلی کار نکلی۔ فواروں سے ٹکراتے ٹکراتے

بچی اور پھر میرے پاس آن رُکی۔ ڈرائیور نے کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور ہکلاتے ہوئے پوچھا "پارے ... دُو ... ۔ فرانسے مُوسیو؟" غالباً وہ مجھے اُن بے شمار الجزائریوں میں سے سمجھ رہا تھا جو اِس شہر میں آباد ہیں اور فرانسیسی میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا مَیں فرانسیسی سے نابلد ہوں" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

"اوہ بوائے" ڈرائیور کا لہجہ امریکی تھا "خدا کا شکر ہے تم انگریزی بول سکتے ہو۔ مَیں پچھلے ایک گھنٹے سے کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا۔ کیا تم مجھے لوور عجائب گھر کا راستہ بتا سکتے ہو؟ وہ مونا لیزا والا!" اُس نے باچھیں کھلا کر مونا لیزا کی مشہورِ زمانہ مسکراہٹ کی نقل اُتارتے ہوئے پوچھا۔

"لوور میں آج ہفتہ وار تعطیل ہے مَیں اُدھر سے ہی آ رہا ہوں" مَیں نے برساتی کا کالر اُوپر کرتے ہوئے جواب دیا۔ پھوار اب قدرے تیز ہو چلی تھی۔

"اوہ ڈیم" اُس نے مایوسی کے عالم میں اپنی ران پر ایک گھونسا رسید کیا اور زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ مَیں وہاں کھڑے کھڑے بھیگنا نہیں چاہتا تھا اِس لیے آگے چل دیا۔

"ہے" امریکی نے پیچھے سے پکارا "اگر تمہیں فرصت ہے تو میرے ساتھ کار میں بیٹھ جاؤ اور نپولین کے مقبرے تک میری راہنمائی کرو۔ مَیں شکر گزار ہوں گا۔"

مجھے فرصت ہی فرصت تھی چنانچہ مَیں نے فوراً اس کی دعوت قبول کر لی۔ کم از کم بارش سے تو بچاؤ ہو گا۔ امریکی کا نام نارمن تھا اور مغربی جرمنی میں متعین امریکی فوج میں لفٹیننٹ کی حیثیت سے دو سال ڈیوٹی پوری کر کے وطن واپس جانے سے قبل یورپ کی سیر پر کمربستہ تھا۔ اکثر امریکیوں کی طرح وہ بھی سات روز میں سات یورپی دارالحکومت دیکھنے کی نیت سے نکلا تھا۔

"دائیں ہاتھ پر نپولین کے مقبرے کو سڑک جاتی ہے" مَیں نے انولید کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے کار فوراً روک لی۔ مقبرے کی طرف غور سے دیکھا اور پھر جیب میں

سے ایک ڈائری نکالی جس کے ایک صفحے پر کچھ اِس قسم کی عبارت تھی۔

"سیرِ پیرس

۱۔ آئفل ٹاور۔ ۲ نپولین کا مقبرہ۔ ۳۔ نیویارک کے مجسمۂ آزادی کا اصلی ماڈل
۴۔ امریکن ایکسپریس سے ڈاک کی وصولی۔ ۵۔ دریائے سین۔ ۶۔ کلیسائے نوٹرڈیم
۷۔ مالن رُوج کا نائٹ کلب۔ ۸۔ شانزے لیزے کے قہوہ خانے میں کافی پینا
اور فرانسیسیوں کو دیکھنا۔

نوٹ: اگر ہوسکے تو کسی فرانسیسی میڈموزیل کے ساتھ اٹکھیلیاں۔

اِسی قسم کی فہرستیں ڈائری کے دوسرے صفحات پر تھیں جن میں لنڈن۔ روم۔ برلن وغیرہ شامل تھے۔

"بس دیکھ لیا" اُس نے نپولین کے مقبرے کے آگے بھی ایک لکیر کھینچ دی اور کار سٹارٹ کرلی۔

"دریائے سین بائیں ہاتھ پر بہہ رہا ہے اِس کے درشن بھی کر لیجیے" مَیں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اُس نے دریا کے گدلے پانی پر ایک نظر ڈالی "آہ رومانوی دریائے سین" اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کے فوراً آئٹم نمبر پانچ پر بھی لکیر کھینچ دی۔ بس اب نمبر ایک اور آٹھ باقی ہیں اور پیرس مکمل ہوجائے گا۔

ہم اُسی سڑک کے آخر میں جب آئفل ٹاور کے پاس پہنچے تو نارمن نے اُس کی تاریخ فرفر سُنا دی۔ انجنیئر آئفل کا کمال۔ اٹھتّر لاکھ طلائی فرانک کی لاگت سے تعمیر کردہ۔ نُو سو چوراسی فٹ اُونچا وغیرہ وغیرہ۔ مَیں نے سر اٹھا کر اُوپر دیکھا تو دُھند اور بادلوں نے ٹاور کا مکمل گھیراؤ کر رکھا تھا اور پہلی منزل سے اُوپر کا حصّہ روپوش تھا۔ "مَیں لفٹ کے ذریعے ٹاور کی آخری منزل پر جاکر پیرس کا نظارہ کروں گا۔" نارمن نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

"لیکن بارش اور دُھند کی وجہ سے تمہیں وہاں کچھ بھی تو دکھائی نہ دے گا" مَیں نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے آواز دی۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں امریکہ واپس جاکر دوستوں کے سامنے اِس بات پر شرمندہ ہوں کہ پیرس جاکر آئفل ٹاور کی آخری منزل سے شہر کا نظارہ بھی نہیں کیا"۔ اُس نے ٹکٹ کی کھڑکی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

مَیں کار کے شیشے اُوپر چڑھا کر وہیں بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آگیا اور جیب سے ڈائری نکال کر آئفل ٹاور کے آگے لکیر کھینچ دی۔" اب رہ گیا شانزے لیزے میں کافی پینا اور . . . . " اُس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا "کِسی فرانسیسی لڑکی کے ساتھ ہُولالا"۔

چنانچہ ہم وہاں سے فوراً شانزے لیزے پر پہنچے جہاں قہوہ خانوں کے باہر تنی ہوئی قناطوں کے تلے بے شمار لوگ بیٹھے بارش کے رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم بھی ایک جگہ بیٹھ گئے اور کافی طلب کی۔ نارمن نے پُورے پانچ منٹ میں کافی ختم کی چند فرانسیسیوں کو گھُورا اور پھر اپنی فہرست کی آخری مَد پوُری کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے مجھے کہنے لگا "کیا مَیں تمہیں شوُٹ کر سکتا ہوں؟"

"وہ کِس خوشی میں؟" مَیں نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کیا میں تمہاری تصویر کھینچ سکتا ہوں؟" اُس نے کار سے کیمرہ نکالا میری تصویر کھینچی اور ڈائری نکال کر شریرِ پیرس کے عنوان تلے "پاکستانی پیرس میں تصویر کھینچی" لکھ کر کار سٹارٹ کی اور پیگال کی طرف چلا گیا جہاں امریکن ڈالر اٹکھیلیوں میں بڑی آسانی سے تبدیل کروائے جا سکتے ہیں۔ مجھے چونکہ اب اور کوئی کام نہ تھا اس لیے وہیں قہوہ خانے میں بیٹھا کافی پیتا رہا۔

قہوہ خانوں اور دکانوں کے شوکیسوں میں سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی کرنیں شانزے کے

گیلے فٹ پاتھ پر منعکس ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چپکے ہوئے شاہ بلوط کے سرخ پتے کسی جدید مصوّر کے شاہکار کی صورت میں اُبھر رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے درخت اور بھی نکھر گئے تھے۔ مَیں بے دھیانی میں گرم کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے فٹ پاتھ کی گیلی سطح پر نظریں جمائے پاسکل کے بارے میں سوچنے لگا۔ کاش میں اُس روز اس کے گھر کا پتہ پوچھ لیتا۔ کم از کم میں اُسے تلاش کر کے اُس روز نہ آنے کی معذرت تو کر سکتا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟ شاید اِس وقت وہ بھی میری طرح اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی باہر برستی بارش کو تک رہی ہو گی! میری نگاہیں فٹ پاتھ سے علیحدہ ہو کر سامنے فضا میں ایک نکتے پر مرکوز ہو گئیں۔ مختلف چہرے اِس نکتے کی زد میں آتے اور ایک متحرک سائے کی طرح آگے بڑھ جاتے۔ بوڑھے فرانسیسی بیری ٹوپیاں پہنے ہوئے۔ فیشن ایبل فرانسیسی لڑکیاں جن کے رنگ برنگے چھاتے اُن کے ساتھی لڑکوں نے تھام رکھے تھے اور خود بارش میں بھیگتے جا رہے تھے۔ لمبے بالوں والے ہپی موسم کی سختیوں سے بے پروا اپنی دُھن میں مگن جھومتے ہوتے۔ غیر ملکی سیاح جو بارش سے پناہ لینے کی خاطر قہوہ خانوں میں جھانکتے اور پھر کوئی خالی جگہ نہ پا کر آگے بڑھ جاتے۔ قالین بیچنے والے الجزائری۔ تکونی داڑھیوں والے مصوّر۔ چہرے گزرتے گئے اور میں نظریں اُسی نکتے پر جمائے بے دھیانی میں گھورتا رہا۔ پھر ایک اور چہرہ گزرا۔ خوبصورت اور بھولا سا چہرہ۔ تراشے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال اور پھر میری نظروں میں ایران کے سارے آسمان کی نیلاہٹ منجمد ہو گئی "پاسکل" میرے دھڑکتے ہوئے دل نے دہائی دی۔ مَیں ہڑبڑا کر اُٹھا اور لوگوں سے ٹکراتا کرسیاں اور میزیں پھلانگتا چوڑے فٹ پاتھ پر بھاگنے لگا۔ وہ اپنی خالہ کا بازو تھامے سر جھکائے بے حد آہستہ آہستہ شانزے لیزے کے گیلے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ "پاسکل" مَیں نے چیخ کر کہا۔ اُس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم فٹ پاتھ پر جامد ہو گئے۔ مَیں قریب پہنچا تو میری سانس پھولی ہوئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ مَیں اُس روز وقت پر نہ پہنچ سکا اور تمہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"آنٹی اِن سے ملو یہ مستنصر ہیں۔" اُس نے میری معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے خالہ سے تعارف کروایا۔

"ہُوں" اُس کی خالہ محترمہ نے ہنکار کر کہا اور پھر مجھے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے گویا ہوئیں "یہی ہے نا جو لنڈن سے تمہارے ساتھ آیا تھا اور پھر غائب۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں آنٹی" پاسکل نے بے صبری سے خالہ کی بات کاٹتے ہوئے سر ہلایا اور پھر خاموشی سے شانز پر رواں ٹریفک کو گھورنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد خالہ صاحبہ پھر گویا ہوئیں "تم دونوں اگر یہاں کھڑے ہو کر خاموشی سے بارش میں بھیگنا چاہتے ہو تو بڑے شوق سے۔ مجھے بال بنوانے کے لیے ہیئر ڈریسر کے ہاں جانا ہے۔" اور پھر پاسکل کا ہاتھ پکڑ کر بڑی شفقت سے کہنے لگیں "موا شیری گھر جلدی آنے کی کوشش کرنا۔" خالہ نے ایک مرتبہ پھر میرا جائزہ لیا اور فتح کی محراب کی جانب مارچ کرتی ہوئی چلی گئیں۔

مَیں اُسے سہارا دے کر واپس قہوہ خانے میں لے آیا۔ پاسکل نے آج بھی وہی سُرخ کوٹ پہن رکھا تھا۔ مَیں نے ایک مرتبہ پھر بھرپور معذرت کی لیکن شاید وہ میری باتیں سُن ہی نہیں رہی تھی۔ "لوگ پہلے پہل میرے چہرے سے وقتی طور پر متاثر ہو کر مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھتے ہیں" وہ کہہ رہی تھی "اور بعد میں جب انہیں اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنا ارادہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ تم پہلے شخص نہیں جس نے یہ رویہ اختیار کیا ہو۔ سین کے کنارے اکیلے چلنے کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔ اُس روز بھی میں اکیلی ہی گھومتی رہی۔" اُس کی نظریں میز پر رکھے چمکدار مینو کارڈ پر گڑی تھیں اور مجھے خدشہ تھا کہ ابھی ابھی کارڈ پر ٹپ ٹپ اُس کے گرم آنسو گرنے لگیں گے۔

"مَیں نے ارادہ تبدیل نہیں کیا تھا" مَیں نے آہستگی سے کہا "پاسکل تمہارے اندر

خود اذیتی کی عادت نے گھر کر لیا ہے۔ تمہیں ہر وقت اپنی جسمانی خامی کا احساس ستاتا رہتا ہے مجھے یقین ہے کہ اِس سے قبل بھی تمہاری زندگی میں ایسے لمحے ضرور آئے ہوں گے جب تم نے سچے جذبات کو صرف ظاہرا ہمدردی سمجھا ہو۔ تم اب بھی ایک ایسے ہی لمحے میں سے گزر رہی ہو۔"

وہ بدستور مینو کارڈ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

"اور ہاں میرا خیال ہے کہ میرا چہرہ اِس کارڈ سے تو بہت بہتر ہے جسے تم پچھلے دس منٹ سے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہو۔"

اُس نے کارڈ سے نظریں ہٹا لیں اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں کی نیلاہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"تم اُس روز نہ آئے تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اُس کے بعد آج میں پہلی مرتبہ خالہ کے اصرار پر اُن کے ساتھ باہر نکلی ہوں۔ مَیں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ اپنی جسمانی خامی کے بارے میں قطعاً نہیں سوچوں گی۔"

مَیں نے ویٹر سے بل لانے کے لیے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھی اپنے کُرخ کوٹ کے کالر سے کھیلتی رہی۔

"کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے" مَیں نے ایک مرتبہ پھر شولری کا بھرپور مظاہرہ کیا اور جھک کر کہا "محترمہ پہلے آپ۔"

پیرس کی اُس بھیگی ہوئی شب کو بالکل زندگی میں پہلی بار سین کے خوبصورت کناروں پر اکیلی نہ تھی۔ مَیں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا اور وہ بڑی ہمت سے لنگڑائے بغیر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمارے دائیں اور بائیں شہر کے دونوں حصّوں کو درجنوں مرصّع و مرقّع پُل ایک دُوسرے سے ملا رہے تھے۔ یہ پُل نازک فرانسیسی طرزِ تعمیر کا شاہکار

ہیں۔ پُلوں پر روشنی کے قدیم طرز کے کھمبے نصب ہیں جن کی روشنیاں نیچے سین کے گدلے پانی میں منعکس ہو رہی تھیں۔ موسیقاروں نے جہاں اپنے نغموں میں پیرس کے ماہِ اپریل اور موسمِ خزاں کی تعریفوں کے پُل باندھے ہیں وہاں دریائے سین کے اِن پُلوں کی مدح میں "پیرس کے پُلوں کے نیچے" جیسی پسندیدہ دُھنیں بھی تخلیق کیں جنہیں سُن کر خوبصورتی اور رومان کا ایک ہمہ گیر احساس رُوح میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہم ان کے نیچے سے گزرتے تو اوپر پُل پر چلنے والے لوگ پاسکل کو لنگڑاتے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک جاتے اور جب اُنہیں یہ احساس ہوتا کہ وہ کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوئی بلکہ قدرتی طور پر اپاہج ہے تو اُن کے چہرے اُن تمام جذبات کا آئینہ بن جاتے جن کے اظہار کا خدشہ پاسکل نے پہلے روز کیا تھا۔ بوڑھیاں کُھسر پُسر کرنے لگتیں اور جوان لڑکیاں۔۔۔ میں ایک ہاتھ میں پاسکل کا نیلا چھاتا تھامے اور دُوسرے سے اُسے سہارا دیئے ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا جیسے ہمدردی اور پیار کے اِس امتزاج کے بغیر اب تک میری زندگی نامکمل رہی ہو۔

ہر چند منٹ کے وقفے کے بعد سیاحوں سے پُر کوئی روشن کشتی سین کے پانی کو چیرتی ہوئی گزر جاتی۔ اِن کی چھتیں ایمسٹرڈیم کی نہروں میں چلنے والی کشتیوں کی طرح شیشے کی بنی ہوئی تھیں اور باہر سے کشتی کا اندرونی حصّہ بخوبی نظر آ رہا تھا۔ ایک کشتی گزری جسے پانی میں رواں ریستوران کہا جائے تو بجا ہو گا۔ کشتی کے گرد رسّوں پر رنگ برنگے قمقمے لٹک رہے تھے۔ لوگ شیشے کی چھت تلے بارش سے محفوظ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ویٹر خوراک کی طشتریاں ہاتھ میں لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور چند جوڑے بارش کی پرواہ کیے بغیر عرشے پر رقص کر رہے تھے۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں بھی ایسے ہی کشتی نما ریستوران میں بیٹھ کر سین کی سیر کروں مگر۔۔۔" وہ رُک کر بولی "میں تو رقص بھی نہیں کر سکتی۔"

"نہیں کر سکتیں تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے ہنس کر کہا "رقص علامت ہے

مسرت اور خوشی کی اور یہ جذبہ بے ہنگم اُچھل کود کے بغیر بھی تو محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

"تمہارے پاس میرے ہر اعتراض کا جواب موجود ہے۔" وہ بھی ہنس دی۔

دریا کے کنارے چلتے ہوئے ہم کلیسائے نوٹرڈیم کے دامن میں پہنچ گئے۔ جسے بجلی کے تیز قمقموں سے روشن کیا گیا تھا۔ یہ قطعۂ زمین جو صدیوں سے خدا کی پرستش کے لیے وقف تھا ۱۷۹۳ء کے انقلاب کے دوران میں وقتی طور پر "مسلکِ فہم" کا معبد قرار پایا۔ مذہبی بزرگوں کے مجسمے ہٹا کر وہاں والٹیر اور رُوسو جیسے انقلابیوں کے مجسمے نصب کر دیئے گئے۔ اسی کلیسا میں نپولین کی رسمِ تاجپوشی ہوئی۔ مَیں نے پاسکل کی جانب دیکھا تو وہ کلیسا کے بلند و بالا میناروں، خوبصورت کنگروں، خوفناک مجسموں اور بڑے گھڑیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"تمہارے خوبصورت خیالوں کے لیے ایک پینی کا سکہ" مَیں نے لندن کے کاکنی مزدوروں کا ایک محاورہ استعمال کیا جس کا مطلب ہے کیا سوچ رہے ہو ہمیں بھی تو معلوم ہو۔

"مجھے اِس لمحے وہ کبڑا یاد آ رہا ہے جو وکٹر ہیوگو کے ناول "ہنچ بیک آف نوٹرڈیم" کا مرکزی کردار تھا۔ وہ اِسی کلیسا میں وہ سامنے والا گھڑیال بجانے پر معمور تھا۔ پھر اُسے ایک خانہ بدوش لڑکی سے محبت ہو گئی لیکن اُس اپاہج کو اپنی کریہہ النظری کا علم نہ تھا" پاسکل نے یہ کہہ کر اپنی نیلی آنکھیں اُن بلند و بالا میناروں پر جما دیں جن پر چڑھ کر وہ کبڑا اپنی محبوبہ کے لیے کسی کونے میں اُگے ہوئے جنگلی پھول توڑ کر لایا کرتا تھا۔

"وہ صرف ایک ناول کا کردار تھا" مَیں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"آخر بدصورت لوگوں کو بھی تو محبت ایسے جذبے کی چاہت ہوتی ہے۔ اُن کا دل تو یہ بات نہیں مانتا نا کہ وہ بدصورت ہونے کی بنا پر محبت سے محروم کر دیئے جائیں۔" پاسکل کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"چونکہ اِس وقت میرے سامنے نہایت ہی خوبصورت لوگ ہیں اِس لیے میں نوٹرڈیم کے

کبوتروں کے بارے میں باتیں کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں" میں نے پاسکل کا بازو تھام کر کہا" آؤ آگے چلتے ہیں۔"

"نہیں اب میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔" اُس نے بچوں کی طرح سر ہلایا "میں آج تمہارے ساتھ چلتے ہوئے بہت دُور تک آگئی ہوں اور زیادہ چلنے سے میرے ٹخنے میں شدت کا درد اُٹھتا ہے جو کئی دن تک رہتا ہے۔ میں کہیں بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کنارے کے ساتھ رکھے ہوئے بنچ پر اپنی برساتی پھیلا دی اور ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ اُس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

"مصیبت یہ ہے کہ میرا لنگڑاپن اتنا شدید بھی نہیں کہ چلنے کے لیے بیساکھیوں کا سہارا لے لوں۔"

"پھر وہی شکایتیں" میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"میں شکایت تو نہیں کر رہی۔" اُس نے اپنے لب بھینچ لیے اور پھر مجھ سے کہنے لگی۔ "میں تو تمہیں صرف اپنی زندگی کے بارے میں بتا رہی تھی۔"

بارش بالکل ختم ہو چکی تھی۔ ہم رات گئے تک بنچ پر بیٹھے سین کے گدلے پانیوں میں رواں روشن کشتیوں کو دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ایسی باتیں جن کا کوئی بھی مثبت پہلو نہیں ہوتا۔ روزمرہ کی عام سی باتیں۔ لیکن یہی باتیں ایک گہری مسرت اور حقیقی خوشی کا منبع ہوتی ہیں۔ اُس رات جب میں پاسکل کو گھر چھوڑ کر واپس ہوٹل جا رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ پیرس ایسا شہر ہے جہاں حقیقی جذبات سے عاری نقش دیرپا نہیں ہو پاتا۔ اِسی لیے میں آج تک اِس شہر کی رُوح سے ناآشنا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے آئینہ لٹکا ہے۔ کمر کے گرد صرف تولیہ باندھے میں شیو بنا رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ میں نے سر جھکا کر تولیے سے شیو کا صابن

پونچھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر ہوٹل کی مالکہ اپنے خزاں رسیدہ ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ سجائے مجھے ٹکٹکی باندھ کر تک رہی تھی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر میری کمر کے گرد بندھے تولیے کی جانب دیکھا اور پھر جلدی سے کہنے لگی۔ "ہُولالا۔ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے اور نیچے تمہاری چھوٹی سی موٹی سی عورت تمہارا راہ تک رہی ہے۔" مَیں نے سفید جالی دار پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ پاسکل فٹ پاتھ کے کنارے پر فرانسیسی کار ستران کے سب سے ننھے مُنّے ماڈل میں منہ پھُلائے بیٹھی تھی۔ "صبح بخیر" مَیں نے چیخ کر کہا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے سر اٹھایا اور اوپر میری جانب دیکھنے لگی۔

"کاہل الوجود لڑکے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ شرم!" اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ جان بوجھ کر اتنے زور سے نعرہ لگایا کہ فٹ پاتھ پر چلنے والے اکثر راہگیر منہ اُٹھا اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ایک ادھیڑ عمر مائی نے مسکرا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کیوں ننھی سی جان کو ہلکان کر رہے ہو نیچے دفع کیوں نہیں ہوتے۔ مَیں نے گھبرا کر کھڑکی بند کر دی اور کپڑے بدلنے کی نیت سے تولیہ اُتارنے لگا۔ ہوٹل کی مالکہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

"شکریہ میڈیم" مَیں نے جھک کر کہا۔

"شرارتی لڑکا" اُس نے اپنی اُنگلی میرے چوڑے سینے پر ٹھونکتے ہوئے کہا اور ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

مَیں کپڑے بدل کر نیچے گلی میں آیا تو پاسکل سٹیئرنگ چھوڑ کر ساتھ والی نشست پر کھسک گئی "کار تم چلاؤ۔"

"ہم لوگ یہ نیچ کام نہیں کیا کرتے۔ ہمارے ہاں شوفر ہوا کرتے ہیں" مَیں نے وہیں کھڑے کھڑے بڑے ٹھسّے سے کہا۔

"سچ؟" اُس نے فوراً میری بات کا یقین کر لیا۔

"تم ہی چلاؤ پاسکل۔ دراصل ہمارے پورے خاندان میں آج تک کسی کو کار خریدنے کی

توفیق ہی نہیں ہوئی اس لیے مابدولت کو کار ہرے سے چلانی ہی نہیں آتی " میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

پاسکل نے ہنس کر کار سٹارٹ کر دی اور متعدد گلیوں اور بازاروں سے نکل کر ہم شاہراہ پر آ گئے۔ وہ بڑی مشاقی سے کار چلا رہی تھی مگر بار بار اس کی نظریں سڑک سے ہٹ کر مجھ پر مرکوز ہو جاتیں اور وہ مسکرا دیتی۔ میں اس بے جا التفات سے کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"یونانیوں کا دیوتا اپالو یاد آ رہا ہے" اس نے شوخی سے کہا۔

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے" میں نے بری طرح جھینپتے ہوئے کہا۔ "اپالو درمیانے قد کا اور گندمی رنگ کا عام سا آدمی نہ تھا۔"

"وقت وقت کی بات ہے" اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"یہ کار تمہاری ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

"نہیں آنٹی کی ہے۔ میرے ٹخنے میں ابھی تک درد تھا اس لیے میں نے اُن سے مانگ لی۔ میں آج زیادہ چل نہیں سکتی صرف بیٹھ سکتی ہوں۔ میں نے کہا تھا نا میں صرف تب تک ہی حسین لگتی ہوں جب تک کسی قہوہ خانے کے کونے میں بیٹھی۔۔۔"

"تم نے اب اگر اس قسم کی کوئی فضول بات کی تو۔۔۔" میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا "میں کار سے اتر جاؤں گا۔ چلتی کار سے۔"

"دھمکیاں ہوں؟" اس نے سر ہلا کر کہا

میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

"نہیں کروں گی" اس کا دایاں ہاتھ ایسے اوپر اٹھا جیسے کسی نے اسے بندوق دکھا دی ہو "وعدہ" وہ بار بار سر ہلا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دروازہ

بند کر دیا۔

پاسکل نے آج ہلکے گلابی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور سر پر ریشم کا نیلا سکارف باندھ رکھا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے میک اَپ کی تہ سے اُس کی آنکھوں کی خوبصورتی اُجاگر ہو گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ پیرس میں آمد کے پہلے روز "بوئے ڈی بولون" کے علاقے سے گزرتے وقت مجھے وہاں کتنی خوبصورتی اور سکون کا احساس ہوا تھا اور میں نے وہاں ایک مرتبہ پھر واپس آنے کے بارے میں سوچا تھا۔

"کیوں نہ آج بوئے ڈی بولون میں دریائے سین کے پُرسکون اور ہرے بھرے کناروں پر پکنک منائی جائے" میں نے تجویز پیش کی "اور فرانسیسی بوڑھوں کی طرح مچھلیاں بھی پکڑی جائیں"۔ پاسکل نے فوراً تائید کی "لیکن مچھلیاں پکڑنے کے لیے بنسی اور کُنڈیاں کہاں سے آئیں گی؟" میں نے سر کھجا کر کہا۔

"کلیسائے نوٹرڈیم کے پہلو میں پھولوں کا بازار ہے وہاں مچھلیاں پکڑنے کا سامان بھی مل جائے گا" اُس نے کار کانکورد کے چوک سے دائیں ہاتھ پر موڑ دی۔ پھولوں کے بازار کے دونوں طرف لکڑی کے کھوکھوں میں پیرس کے گرد و نواح میں اُگائے ہوئے تازہ پھولوں کے انبار لگے تھے۔ میں نے پاسکل کے لیے زرد رنگ کے پھولوں کا ایک گلدستہ خریدنا چاہا تو معلوم ہوا بیس فرانک کا ہے چنانچہ فوراً ارادہ ترک کر دیا۔ پاسکل بھی اِس دوران میں مچھلیاں پکڑنے کے سامان کی تلاش میں تھی جو بالآخر بازار کے سرے پر ایک غلیظ کھوکھے میں اونگھتے ہوئے فرانسیسی بوڑھے سے دستیاب ہو گیا۔

"دریائے سین میں مچھلی کے شکار کے لیے کم از کم کتنا سامان درکار ہوگا؟" میں نے بوڑھے کے آرام میں مخل ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

بوڑھے نے ایک جمائی لی اور اپنی بیری ٹوپی کی نوک پلک درست کر کے کہنے لگا۔ "امریکی بنسی اور کُنڈی پچاس فرانک۔ مچھلیوں کو پانی سے باہر نکالنے کا جال دس فرانک

مچھلیاں پھانسنے کے لیے نقلی کیڑے مکوڑے بیس فرانک فی درجن۔ ایک ٹب مچھلیاں رکھنے کے لیے دس فرانک۔ کُل نوّے فرانک موسیو!"

"کُل نوّے فرانک موسیو" مَیں نے بوڑھے کی نقل اتارتے ہوئے کہا "ہم نے مچھلیاں پکڑنی ہیں مگر مچھ نہیں۔ یہ بہت زیادہ ہے" مَیں کھوکھے سے باہر جانے لگا تو بوڑھے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "آپ کا ارادہ واقعی مچھلیاں پکڑنے کا ہے یا مڈموزیل کے ساتھ ایک خوشگوار دوپہر گزارنے کا؟"

"بس یَین بیَن ہی سمجھو" مَیں نے فرانسیسیوں کی مانند کندھے سکیڑ کر جواب دیا۔

"تو پھر میرے پاس قدرے استعمال شدہ کُنڈیاں پانچ فرانک فی کے حساب سے بھی موجود ہیں۔ کیڑے مکوڑے مُفت" اُس نے کونے میں پڑا ایک صندوق کھولتے ہوئے مجھے مژدہ سنایا۔

"تری بیان۔ سُبحان اللہ" میں شُدھ فرانسیسی پر اُتر آیا۔

بنسی۔ کُنڈیاں اور چند نقلی مینڈک لے کر ہم ایک قریبی قہوہ خانے میں چلے گئے اور وہاں سے پکنک کے لیے سینڈوِچ۔ تازہ پھل اور سوکھا گوشت خرید لیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے قہوہ خانے کا دراز قد اور بھاری سیاہ مونچھوں والا مالک نہایت غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ قدرے تأمل کے بعد اُس نے فرانسیسی میں مجھ سے کچھ دریافت کیا۔ پاسکل نے مترجم کے فرائض انجام دیئے اور بتایا کہ پوچھ رہا ہے کون سے مُلک کے ہو؟ میرے منہ سے "پاکستان" کے الفاظ پوری طرح ادا بھی نہ ہوتے تھے کہ اُس نے بڑی گرمجوشی سے میرے دونوں کاندھے پکڑ لیے "الحمد اللہ" لہجہ خالصتاً عربی میں تھا اور پھر کمر کے گرد بندھا سفید ایپرن اُتار کر کاؤنٹر سے باہر نکل آیا اور مجھے گلے لگا کر تڑاخ تڑاخ میرے دونوں گالوں پر بوسے دیئے (مجھے اب معلوم ہوا کہ فرانسیسیوں نے یہ عادت کہاں سے مُستعار لی تھی) "الحمداللہ مسلمان" وہ کہہ رہا تھا "مَیں الجزائری۔ محمد بن بکر" بکر نے مہمان نوازی

کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا جیسے ہم پیرس کے کسی قہوہ خانے کی بجائے صحرا میں اُس کے خیمے میں مہمان بن کر آ گئے ہوں۔ کافی پلائی۔ زبردستی کریم کیک کھلایا اور جاتے وقت کھانے کی ٹوکری میں ایک اور کریم کیک تحفے کے طور پر رکھ دیا۔

"اِس الجزائری نے تو تمہارا استقبال ایسے کیا ہے جیسے تم آپس میں رشتہ دار ہو۔" پاسکل نے قہوہ خانے سے نکلتے ہی حیرت سے کہا۔

"ہم مسلمان ہونے کے ناطے سے ایک ہی ڈور میں بندھے ہوتے ہیں اور آپس میں رشتہ دار ہیں۔"

پاسکل بے حد متاثر نظر آ رہی تھی۔

واپس کار میں بیٹھ کر ہم شانزے کے راستے فتح کی محراب تک آ گئے جس کے بڑے گول چکر کے گرد ہزاروں کاریں چیونٹیوں کی مانند رینگ رہی تھیں۔ پونتے ڈی نیوئی جانے کے لیے ہمیں دوسری طرف ایونیو فاک پر جانا تھا۔ پاسکل نے کار گول چکر میں موڑ دی۔ خاصی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ایونیو فاک میں مُڑنے کی بجائے مزے سے محراب کے گول چکر کے گرد بے مقصد گھوم رہی ہے۔

"کیا کر رہی ہو پاسکل؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مَیں آج بے حد خوش ہوں مُستنصر" اُس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم پچھلے پانچ منٹ سے ایک ہی دائرے میں گھوم رہے ہیں۔"

"مَیں اگر رقص نہیں کر سکتی تو کیا ہوا؟ کار میں بیٹھ کر ایک دائرے میں تو گھوم سکتی ہوں۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین ۔۔۔"

مَیں نے اُسے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ تمام کاروں والے ہمیں بُری طرح گھور رہے ہیں بلکہ ابھی ابھی ٹریفک کے سپاہی نے سیٹی بھی بجائی تھی۔

"تم میں بالکل سپورٹس مین سپرٹ نہیں ہے" اُس نے ناک سکیڑ کر کہا اور کار ایونیو فاک

میں موڑ دی۔ تھوڑی دیر میں ہم نیولی کے پُل کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فٹ پاتھ کے کنارے کار کھڑی کر کے ہم نے اُسی راستے پر چلنا شروع کر دیا جہاں چند روز قبل میں کیمپنگ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ آج مَیں نے سامان کے وزنی تھیلے کی بجائے کاندھے پر بنسی اور کُنڈیاں اُٹھا رکھی تھیں اور خوراک کی ٹوکری میرے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ پاسکل کو ابھی میرے سہارے کی ضرورت نہیں تھی وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ معمولی طور پر لنگڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ چند فرلانگ چلنے کے بعد جب رہائشی مکانوں اور ہاؤس بوٹوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو ہم پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر دریا کے کنارے پر آ گئے۔ کنارے کے ساتھ دُور دُور تک شاہِ بلوط اور بید کے گھنے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ ہوا چلتی تو جنگلی بیلوں کے خوشنما پھول اور ہرے بھرے پتے دریا کی سطح پر جھک کر ڈبکی لگاتے اور پھر باہر آ جاتے جیسے کوئی راج ہنس اپنی پیاس بجھا رہا ہو۔ سورج کی تیز کرنوں میں حدت نمایاں ہو رہی تھی۔ مَیں نے ایک پُر سکون اور سایہ دار جگہ کا انتخاب کر کے اپنی برساتی گھاس پر بچھا دی اور پاسکل کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اُس نے ایک نازک اندام بیلے رینا کی مانند دونوں ہاتھوں سے اپنے گلابی لباس کے کونے پکڑے اور پھر میری سفید برساتی پر ایک خوبصورت راج ہنس کی مانند براجمان ہو گئی۔ مَیں نے بنسیاں اُٹھائیں اور کنارے پر چلا گیا۔ دریا کا پانی دُھلی دُھلائی سفید چادر کی طرح سلوٹوں سے پاک تھا جس پر دریا سے زیادہ ایک پُر سکون جھیل کا گمان ہو رہا تھا۔ میرے سامنے دوسرے کنارے پر بھی چند لوگ دھوپ میں بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی اکلوتا کشتی ران دریا کی سطح کو چیرتا نیولی کے پُل کی جانب سے نکلتا تو تلاطم برپا ہو جاتا۔ ہلکی لہریں کناروں تک پہنچتیں اور چھپاک چھپاک بیلوں کے پتوں اور پھولوں کو بوسے دیتیں۔ مَیں نے ایک نقلی مینڈک کُنڈی کے ساتھ اٹکایا اور اسے پانی میں ڈال کر واپس سائے میں آ گیا جہاں پاسکل برساتی پر لیٹے "پیرس ویکلی انفرمیشن" کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اُس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"اس میں دیکھ کر بتانا کہ کل لوور کا عجائب گھر کھلے گا یا نہیں! کبھی کوئی دوست مل جاتا ہے اور کبھی وہاں تعطیل ہو جاتی ہے۔ میں کل ہر صورت وہاں جانا چاہتا ہوں۔"

"کل بہت دور ہے۔ اس وقت میں صرف آج کے بارے میں سوچ سکتی ہوں" اس نے رسالہ پھیلا کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور گنگنانے لگی۔

"ہے پاسکل بی بی" میں نے رسالے پر اس جگہ انگلی بجائی جہاں اس کی ستواں ناک ابھری ہوئی تھی۔ "اگر مجھے صرف مچھلیوں کے شکار کا ہی شوق ہوتا تو اتنے تردد کی کیا ضرورت تھی۔ بازار سے درجن بھر خرید کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں ٹانگ لیتا اور خوش ہو لیتا۔"

"میرے عین اوپر درختوں کے پتے بے حد چھدرے ہیں۔ سورج کی کرنیں چھن چھن کر میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں اس لیے میں نے رسالے سے منہ ڈھانپ لیا ہے۔ تم باتیں کرتے رہو میں سن رہی ہوں" اس نے رسالے کا ایک کونا اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

میں نے ایک نظر گنڈیوں کی طرف دیکھا جو بالکل ساکن پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں اور وہیں نرم اور ٹھنڈی گھاس پر لیٹ گیا۔ واقعی پاسکل ٹھیک کہہ رہی تھی میرے اوپر بھی پتوں میں سے دھوپ کے دائرے چمکتے اور آنکھوں کو چندھیا کر غائب ہو جاتے۔ ہوا سنسناتی ہوئی درختوں میں سے گزرتی تو خوشگوار خنکی کا احساس ہوتا۔ آج کا دن کافی گرم تھا۔ دریا کی چمکیلی سطح پر سورج کی ترچھی کرنیں جذب ہو رہی تھیں اور بخارات کی ایک دھندلی تہ پانی کے اوپر معلق تھی۔ نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ دوسرے کنارے پر درختوں میں کوئی جنگلی پرندہ چہچہانے لگا۔ مجھے گرمیوں کی وہ تپتی دوپہریں یاد آگئیں جب میں اپنے گاؤں سے نکل کر راہٹ کی جانب جاتا ہوا راستے میں کیکر کے ایک پرخار درخت کی چھدری چھاؤں میں دم لینے کے لیے رکتا تھا۔ درخت پر بیٹھی ہوئی فاختہ "گوا و، گوا و" کی دہائی مچا دیتی۔ فاختہ کی آواز میرے لیے ایک گرم اور تپتی دوپہر کی علامت بن گئی۔

"سو گئے ہو؟" پاسکل نے رسالے کے کونے سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اُس کی آنکھیں نیند سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

مَیں نے آنکھیں کھول دیں اور کروٹ بدل کر اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ مَیں اپنے آپ کو بے حد سُست اور ہلکا محسُوس کر رہا تھا۔ مجھے یُوں لگتا تھا جیسے وقت کے پاؤں میں زنجیر پہنا دی گئی ہو۔ صرف پانی کی سطح پر تَیرتی ہوئی دو گنڈیاں ہیں اور پاسکل کا گلابی لباس ہے۔ بس!

"کیا تم پاکستان میں بھی مچھلیاں پکڑنے جایا کرتے تھے؟" پاسکل نے گنڈیوں کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک بے حس و حرکت تَیر رہی تھیں۔

مَیں نے اُسے بتایا کہ بچپن میں جب گرمیوں کی چھٹیوں میں نانی اماں کے ہاں گاؤں جاتا تو اُن کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میرا تمام دن مقامی جوہڑ کے کنارے بانس کے تنکے پر نظریں جمائے گزرتا۔ اُن دنوں لوہے کی ایک گنڈی ایک آنے میں مل جاتی تھی۔ بانس جوہڑ کے کنارے سے توڑ لیتا اور ڈوری نانی اماں بٹ دیتیں۔ چلیے مچھلی پکڑنے کا سامان مکمل ہو گیا۔ مچھلی پھانسنے کے لیے نقلی مینڈک اور جھینگر وغیرہ تو ملتے نہ تھے چنانچہ مَیں اصلی کینچوے حاصل کرنے کے لیے فاجو جاٹ کے آموں کے باغ کے پہلو میں بہتی ہوئی پانی کی نالی پر چلا جاتا۔ مَیں اپنے ننھے مُنّے ہاتھوں سے نالی کے کنارے کی نم اور سیلی مٹی کھودتا تو چھوٹے چھوٹے کینچوے اِدھر سے رینگ کر اُدھر گھس جاتے۔ مَیں اُنہیں دُم سے پکڑ کر کھینچتا تو اکثر ٹوٹ جاتے۔ اِس کے بعد اِنہیں گیلی مٹی میں ملا کر پوٹلی میں باندھ لیتا اور جوہڑ پر چلا جاتا۔ کینچوے کو گنڈی پر کھینچ کر تھوک لگا کر جوہڑ کے گدلے کائی زدہ پانی میں ڈال دیتا اور پھر میری آنکھوں سے جھپکنے کا عمل غائب ہو جاتا۔ میں دیدے پھاڑے پوری گرم دوپہر بانس کے تنکے پر نظر جمائے اکڑوں بیٹھا رہتا اور اُس کے ڈبکی لگانے کا انتظار کرتا رہتا۔ اِس سے پہلے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اُس میں پانی بھر لیتا تاکہ شکار کی ہوئی مچھلیاں اُس

میں زندہ رکھی جا سکیں۔ بہرحال وہ گڑھا اکثر خالی ہی رہتا کبھی کبھار کوئی کچھوا میری بیش قیمت گنڈی چیکے سے ہڑپ کر جاتا اور بالنس سمیت جوہڑ کی کیچڑ آلود تہ میں جا بیٹھتا۔ تم نے کبھی کچھوا دیکھا ہے پاسکل؟

پاسکل کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ سو چکی تھی۔

میں آہستہ سے اُٹھا اور دریا کے کنارے جا کر گنڈیوں کو پانی میں سے نکال کر اچھی طرح دیکھا۔ مچھلی نام کی کوئی چیز انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ میں نے بے دلی سے انہیں پھر پانی میں ڈال دیا اور واپس آ کر سائے میں لیٹ گیا۔ جانے کب نیند نے مجھے اپنی خنک اور آرام دہ آغوش میں لے لیا۔

میری آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں نے برساتی کی طرف دیکھا۔ پاسکل وہاں نہیں تھی۔ وہ دریا کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے گنڈیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بار بار پانی میں ڈال رہی تھی۔ مجھے اب سائے میں خنکی کا احساس ہوا اور میں کھانے کی ٹوکری اور برساتی اُٹھا کر پاسکل کے پاس چلا آیا۔

"اُس خرانٹ بوڑھے نے ہمیں مچھلیاں پھانسنے کے لیے جو نقلی مینڈک دیئے تھے وہ بھی استعمال شدہ ہیں۔" اُس نے مجھے لوہے کا مینڈک دکھاتے ہوئے سر ہلا کر کہا "ان کا رنگ اُتر چکا ہے اِس لیے مچھلیاں فوراً جان جاتی ہیں کہ مینڈک اصلی نہیں ہیں۔"

"اصلی مینڈک تو اہلِ فرانس ویسے ہی شام کے کھانے پر ہڑپ کر جاتے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اِس وقت مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ اگر اور کچھ کھانے کو نہ مِلا تو شاید میں یہ لوہے کے مینڈک ہی کھا جاؤں" اُس نے پیٹ پر ہتھیلی جما کر منہ بنا لیا۔

"اِس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹوکری سے خوراک نکال کر برساتی پر رکھ دی۔ محمد بن بکر الجزائری کے کیک نے بے حد مزا دیا۔ کھانے کے بعد میں

نے سگرٹ سلگا لیا اور پاسکل کو اپنے سفرِ اُندلس کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ چُپ سی ہو گئی۔ اب شام ہو رہی تھی اور شاہ بلوط اور بید کے سائے لمبے ہو کر دریا کے درمیان تک چلے گئے تھے۔ دوسرے کنارے پر مچھلیوں کا شکار کرنے والے بوڑھے بھی جا چکے تھے۔ بوئے ڈی بولون پر ایک ہلکی سُرمئی چادر بچھ رہی تھی۔

ہم واپس نیولی کے پُل تک پہنچے تو ایونیو فاک کی تمام روشنیاں منوّر ہو چکی تھیں اور ٹریفک کا بے پناہ شور تھا۔ پیرس تمام دِن سُورج کی گرم کرنوں تلے کُڑھنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ مَیں نے خوراک کی خالی ٹوکری اُٹھا رکھی تھی۔ بنسیاں اور گنڈیاں ہم وہیں دریا کے کنارے ہی چھوڑ آئے تھے۔ بے حد آہستہ چلنے کے باوجود پاسکل تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ کار میں بیٹھ کر وہ خاصی دیر خاموشی سے مجھے تکتی رہی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی "مُستنصر تمام خوبصورت چیزوں کا انجام کیوں خوبصورت نہیں ہوتا؟" اور کار سٹارٹ کر دی۔ مَیں بھی سوچ رہا تھا کہ وقت نہیں تھم سکا۔ سین کے پانی پر تیرتی بے حس و حرکت گنڈیاں اور پاسکل کا گلابی لباس۔ اب ایک خواب کی باتیں تھیں۔ سراب تھا اور بس!

ہوٹل پہنچ کر جب مَیں کار سے اُترنے لگا تو پاسکل نے میرا بازو تھام لیا "زندگی میں پہلی بار آج مجھے اُس بوجھ کا احساس تک نہیں ہوا جس کے تلے مَیں ہر لمحے پِستی رہی ہوں۔ آج میں بھی عام انسانوں کی طرح تھی۔ مجھے ایسے محسُوس ہوا جیسے میں کبھی بھی اپاہج نہ تھی۔ مَیں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں" اُس کی نیلی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"تم آخری روز رُخصت ہی شکریہ ادا کر دینا" مجھ سے اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"آخری روز؟" اُس کا چہرہ اُتر گیا اور اُس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

"تم بہت تھک چکی ہو پاسکل" مَیں نے اُس کے کندھے کو چھوتے ہوئے کہا "گھر جا کر آرام کرو۔ ہم کل پھر ملیں گے اور لووُر جائیں گے۔"

وہ خاموش رہی۔

"اور ہاں" مَیں ہوٹل کے دروازے پر جاکر پلٹ آیا" تم ہر روز مجھے ملنے آجاتی ہو کہیں تمہاری خالہ بُرا تو نہیں مناتیں؟"

"ہر روز اور پھر آخری روز۔۔" اُس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا اور پھر یک دم سر جھٹک کر بولی" اوہ خالہ؟ نہیں نہیں۔ انہوں نے تو سیکرے کُر کے کلیسا میں شکرانے کے طور پر درجنوں موم بتیاں جلائی ہوں گی کہ اُن کی اپاہج بھانجی نے بھی چلنا سیکھ لیا ہے۔"

"تو پھر کل" مَیں نے ہوٹل کا دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔

مَیں نے کمرے میں آکر کھڑکی سے نیچے جھانکا تو کار ابھی تک فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی تھی اور اُس میں بیٹھی ہوئی پاسکل کی نظریں میری کھڑکی پر جمی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی اور فوراً کار سٹارٹ کر کے گلی کی نکڑ پر مڑ گئی۔

"آج میں بھی عام انسانوں کی طرح تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کبھی بھی اپاہج نہ تھی" کہیں تاریکی میں پاسکل کی آواز گونجی اور ایک چھناکے سے میرے خوابیدہ ذہن کے پردوں سے ٹکرائی۔ پھر تاریکی چھٹنے لگی اور دُور پاسکل کا حسین چہرہ دکھائی دینے لگا جو میرے قریب تر ہوتا گیا اور پھر آہستگی سے میری بند آنکھوں میں اُتر گیا۔ اُس کے نازک لبوں پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اور اُس کی گہری نیلی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ اب وہ سفید لباس میں ملبوس دونوں بازوؤں کو کمان کی صورت میں اُوپر اٹھائے اور ایک ٹانگ کو ہلکا سا خم دیئے ہوئے ایک نازک اندام بیلے رینا کی مانند میرے سامنے ایک عظیم سٹیج پر بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ سنگِ مرمر کے کسی مجسمے کی طرح۔ اُس کے چاروں طرف سینکڑوں خوبصورت سفید پوش رقاصائیں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ وہ سب بھی بے حس و حرکت تھیں تھیٹر بالکل خالی تھا اور مَیں سب سے اُونچی گیلری میں ایک نشست کے سرے پر بیٹھا سٹیج پر نظریں

جاتے ہوئے تھا۔ پاسکل نے ایک جھرجھری سی لی جیسے خواب سے بیدار ہو رہی ہو اور رقص کرنا شروع کر دیا۔ اُس کا چہرہ اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا اور نیلی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ دُوسری رقاصائیں اُس کے گرد ایک دائرے کی صُورت میں بڑی نزاکت سے پنجوں کے بل گھُوم رہی تھیں۔ اُن کے سفید لبادے آہستگی سے ہوا میں اُڑتے تو اُن پر راج ہنسوں کی ایک جھیل کا گمان ہوتا۔

"مَیں آج اپاہج نہیں ہوں۔ نہیں ہوں" پاسکل کی آواز سٹیج کی عمیق گہرائیوں میں گونجی اور مجھ تک ایک فریاد کی صُورت میں لپکی۔ وہ بار بار یہی فقرہ دُہرا رہی تھی اور اُس کی آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ رقص تیز ہوتا گیا۔ اب پاسکل اتنی بے قراری سے رقص کر رہی تھی جیسے رُک جانا اُس کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ میرے ذہن میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ پاسکل تو ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں سکتی وہ اتنی تیزی سے ناچ کیوں رہی ہے۔ وہ گر پڑے گی۔ مجھے اُسے روکنا چاہیئے۔

"پاسکل اتنی تیزی سے مت ناچو" مَیں اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گیلری پر جُھک کر اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ "تمہارے ٹخنے کا درد عود کر آئے گا۔ تم مر جاؤ گی پاسکل۔"

"آج میں اپاہج نہیں۔ مَیں ضرور ناچوں گی" اُس کی مدھم سی آواز آئی۔

"پاسکل پاسکل" مَیں خطرناک حد تک آگے جُھکا پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ "خدا کے لیے ناچنا بند کر دو۔" لیکن وہ میری آواز تو سُن ہی نہیں رہی تھی۔ اب وہ تیزی سے پُورے سٹیج کا چکر لگاتے ہوئے اپنے پنجوں کے بل چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایک دَم اُس کے ہاتھ اور پاؤں شست پڑنے لگے۔ رقص کی شدت میں کمی آتی گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بالکل ساکن کھڑی ہوئی اور پھر ایک جُھرجُھری لے کر فرش پر نڈھال ہو کر گر پڑی۔ سفید لباس میں لپٹا ہوا اُس کا جسم بالکل بے جان تھا۔ دُوسری

رقاصاؤں نے اُسے گھیرے میں لے لیا اور جھک کر اپنے نرم و لطیف بازو اُس کے پورے جسم پر پھیلا دیئے۔ راج ہنس مر چکا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو مَیں پسینے میں شرابور اپنے بستر پر پڑا تھا۔ باہر پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں اندھی سیاہ رات اُتری ہوئی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ "مجھے پیرس سے فوراً چلے جانا چاہیے" مَیں نے بستر کی چادر سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاسکل میری رفاقت کی عادی ہوتی جائے گی اور پھر ایک روز جدائی کا تصور اُسے پھر اُنہی عمیق گھاٹیوں میں دھکیل دے گا جہاں سے وہ گھسٹتی ہوئی میرے لیے باہر نکل آئی تھی۔ مَیں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ کل پیرس میں میرا آخری دن ہوگا اور مَیں پاسکل سے آخری مرتبہ مِل کر رات کی گاڑی سے ہسپانیہ روانہ ہو جاؤں گا۔

شانزے لیزے کا کشادہ فٹ پاتھ جہاں پیرس کی زندگی کا دِل دھڑکتا ہے، ہمیشہ کی طرح پُر ہجوم تھا۔ مَیں نے پاسکل کو سہارا دے رکھا تھا اور ہم دونوں شاہ بلوط کے درختوں کی قطار تلے آہستہ آہستہ کانکورد چوک کی جانب جا رہے تھے۔ ہم اُس قہوہ خانے کے پاس سے گزرے جس کے باہر بیٹھے ہوئے اُس روز مجھے پاسکل نظر آئی تھی۔ کانکورد چوک کے درجنوں فوّاروں کی پھوار سے بچتے ہم تولیرز کے خوشنما باغات میں داخل ہوئے۔ سامنے لوور عجائب گھر کی پُرشکوہ عمارت کھڑی تھی جو اپنے وسیع دامن میں دنیا کی نادر ترین تصاویر، مجسّمے اور فن پارے سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر اس عمارت کے تمام حِصّوں کو سرسری نظر ہی دیکھنا ہو پھر بھی کم از کم دو روز صرف ہو جائیں۔ لوور میں رکھے سینکڑوں نادر مجسّموں اور ہزاروں شاہکار تصویروں کے لیے اہلِ فرانس کو نپولین کا شکرگزار ہونا چاہیے جس نے مفتوح مُلکوں میں جھاڑو پھیر کر تمام نوادرات جمع کیے اور پیرس پارسل کر دیئے۔ اپنے عجائب گھروں کو بھرنے کا یہ نادر نسخہ آج کل امریکی آزما رہے ہیں۔ البتہ طریقۂ استعمال قدرے مختلف ہے۔ اُن زمانوں میں لوگ بڑی شرافت

سے نوادرات لُوٹ کر اپنے ملک لے جاتے تھے اور اب پہلے دوسرے لوگوں کی دولت لُوٹی جاتی ہے اور پھر اس سے نوادرات خرید لیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ایک امریکی عجائب گھر نے ہسپانوی مصوّر ولاسکز کی ایک عامیانہ تصویر کے لیے پانچ کروڑ روپے ادا کیے ہیں۔

دروازے کے پاس پہنچ کر مَیں نے ٹکٹ خریدے اور ہم دونوں لوور کے اندر داخل ہو گئے سیاحوں کی اکثریت یہاں صرف دنیا کی مشہور ترین تصویر لیونارڈو ڈی ونچی کی بنائی ہوئی "مونالیزا" کا دیدار کرنے آتی ہے۔ ہم صرف مونالیزا کے گرد و نواح میں ہی پہنچ سکے کیوں کہ تصویر کے سامنے سیاحوں کے غول بصدِ احترام اپنے گائڈوں کے چہروں پر نظریں جمائے تصویر کی تاریخ اور فنّی خوبیوں پر لیکچر سننے میں ہمہ تن گوش تھے۔ گائڈ کی تیز طرار زبان لمحہ بھر کے لیے رُکتی تو سیاح ایک نظر تصویر پر بھی ڈال لیتے۔ جس طرح آج تک فن کے ہزاروں قدرداں اور نقّاد مونالیزا کی مشہورِ زمانہ مسکراہٹ کا بھید نہیں پا سکے اسی طرح مجھ پر بھی اِس نہایت معمولی اور گنوار عورت کی تصویر کی شہرت و عظمت کا راز نہیں کھُل سکا۔ ضروری تو نہیں کہ جو عورت بھی لبوں کو قدرے سُکیڑ دے اُس کی مسکراہٹ کے پیچھے سربستہ رازوں کے انبار لگے ہوں۔

مَیں نے پاسکل کی رائے دریافت کی تو وہ جواب میں صرف مُسکرا دی۔ مونالیزا کی مُسکراہٹ ماند پڑ گئی۔ ہجوم قدرے کم ہوا تو ہم نے تصویر پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔

عجائب گھر کے طویل و عریض ہال کے آخر میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھُلتا ہے جس کے باہر ایک سفید تختی پر "وینس ڈی میلو" کے الفاظ کندہ ہیں۔ یونان کے آئیونین سمندر میں بکھرے ہوئے سینکڑوں جزیروں میں سے "میلو" نام کا جزیرہ سب سے خوبصورت ہے۔ زمانۂ قدیم میں وہاں ایک ماہر مگر غریب سنگ تراش رہا کرتا تھا۔ کہتے ہیں ایک شب حُسن کی دیوی وینس آسمانوں سے اُتر کر اُس غریب سنگ تراش کے جھونپڑے میں جلوہ افروز ہوئی۔ "صدیوں سے اَن گنت سنگ تراش میرے آسمانی حُسن کو پتھر میں ڈھالنے کی کوشش

کرتے رہے ہیں۔" وینس مبہوت کھڑے سنگ تراش سے گویا تھی " وہ سب ناکام رہے کیوں کہ انہوں نے مجھے صرف ایک دیوی کی نظر سے دیکھا۔ اُن کے مجسمے پاکیزگی اور روحانیت کے مظہر بن گئے مگر میرا نسوانی حسن اُن کی نظروں سے اوجھل رہا۔ میں حسن کی دیوی بھی ہوں اور گوشت پوست کی ایک حسین عورت بھی۔ میرا مجسمہ تراشنے کی خاطر پاکیزگی کے پہلو بہ پہلو انسانی جذبات کی بھی ضرورت ہے اور اِس خواہش کی تکمیل کے لیے پورے یونان میں میری نگہہ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ تم ایک ایسا مجسمہ تراشو گے جس میں مَیں دیوی سے زیادہ ایک خوبصورت عورت کے رُوپ میں اُبھروں گی۔ مجھے جی بھر کے دیکھ لو۔" وینس نے وہ شب سنگتراش کے جھونپڑے میں گزاری اور سورج طلوع ہوتے ہی اپنے آسمانی مسکن کو پرواز کر گئی۔ سنگ تراش نے تیشہ ہاتھ میں لیا اور حسن کی دیوی اور اپنی محبوبہ کا مجسمہ تراشنے کی خاطر سنگِ مرمر کے ایک عظیم تودے میں کھو گیا۔ ماہ و سال گزرتے گئے۔ تیشے کی ہر کاٹ ایک نئے اور دلفریب نقش کو جنم دیتی گئی اور بالآخر مجسمہ مکمل ہو گیا۔ وینس غسل کے بعد سمندر سے باہر نکلتی ہوئی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سیب تھا اور دوسرے سے وہ اپنے لبادے کو تھامے ہوئے تھی جو سینے سے ڈھلک کر اُس کے متناسب کولہوں پر لٹکا ہوا تھا۔ میلو کے باشندوں نے جب مجسمہ دیکھا تو پکار اُٹھے " آج سے صرف وینس ہی میلو کے جزیرے کی دیوی ہوگی " ایک عظیم الشان معبد تعمیر کیا گیا اور مجسمے کو ایک بلند ستون پر ایستادہ کر کے وینس کی پرستش شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ مجسمے کی خوبصورتی کا شہرہ نیلے پانیوں کے پار شاہِ یونان تک بھی جا پہنچا۔ شاہ نے میلو کے باشندوں کو پیغام بھجوایا کہ یہ مجسمہ فوراً اُس کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ اہلِ میلو نے انکار کر دیا۔ ایک روز معبد کے اونچے مینار پر تعینات پہرہ دار نے شاہِ یونان کے لاتعداد جنگی جہاز میلو کی طرف بڑھتے دیکھے اور معبد کے پروہتوں کو اِس کی خبر کر دی۔ تمام پروہتوں نے اپنی دیوی کو یونانیوں سے بچانے کی خاطر ایک کٹھن فیصلہ کیا۔ مجسمے کو اِس حد تک بدصورت اور ناکمل بنا دیا جائے کہ یونانی اُسے ناکارہ سمجھ کر واپس لوٹ جائیں۔

چنانچہ ایک تیز تیشے سے وینس کے خوبصورت بازو کندھوں تک کاٹ کر انہیں گہرے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ مگر یہ ترکیب بھی کام نہ آئی۔ کٹے ہوئے بازوؤں کی وینس کی خوبصورتی اب بھی سحر انگیز تھی اور یونانی اُسے اُٹھا کر اپنے ملک میں لے گئے۔ آج سے چند برس پیشتر نیویارک میں رہنے والے ایک یونانی باشندے نے دو جہاز خریدے اور کئی ماہ تک میلو کے گرد پھیلے ہوئے سمندر میں وینس کے کٹے ہوئے بازو تلاش کرتا رہا تاکہ انہیں ایک مرتبہ پھر مجسمے سے جوڑ کر وینس کو ہزاروں سال پہلے کا ملکوتی حسن عطا کر دیا جائے مگر اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

مَیں اور پاسکل جب "وینس ڈی میلو" یعنی میلو جزیرے کی وینس کے کمرے میں داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم ہزاروں سال قبل کے اُس عالی شان معبد میں پہنچ گئے ہیں جہاں قربان گاہ کے اوپر ایک ستون پر وینس کا مجسمہ نصب تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج اُس کے خوبصورت بازو میلو جزیرے کے گرد پھیلے ہوئے نیلے پانیوں کی تہ میں کائی آلود ہو چکے ہوں گے۔ مجسمے کے سنگِ مرمر کا دودھیا رنگ دھندلا چکا ہے اور جسم کے اکثر حصوں سے چھوٹی چھوٹی کرچیاں علیحدہ ہو کر گڑھے بن چکے تھے۔ اِس بوسیدہ حالت میں بھی وینس ایک ذی رُوح دیوی کی مانند آپ کو مسحور کر دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی اِس اونچے ستون سے نیچے اُتر کر بڑی حیرت سے ہمیں پوچھے گی "مَیں میلو کے چمکتے ہوئے جزیرے سے اِس سرد دیس میں کیسے آگئی؟ میرے بازو کہاں ہیں؟ مَیں اپاہج کیسے ہو گئی؟"

"مجھے تو اِس مجسمے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی" پاسکل نے مجسمے کے گرد گھومتے ہوئے اِسے تنقیدی نظروں سے دیکھا "اِسے دنیا کی خوبصورت ترین عورت کہا جاتا ہے بلکہ فرانس میں اِس مجسمے کے جسمانی تناسب کو معیار قرار دے کر ایک مقابلۂ حُسن بھی منعقد کیا جاتا ہے۔" پاسکل نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ وینس کے سڈول سینے پر ڈالی اور ناک چڑھا کر

کہنے لگی "میرے خیال میں تو وینس بے حد موٹی ہے" اُس نے آخری فقرہ رشک آمیز لہجے میں اتنی معصومیت سے کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

"دراصل تم وینس کے خوبصورت جسم سے جلتی ہو"

"مَیں کیسے جل سکتی ہوں" پاسکل نے رُندھی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا اور پھر ایک دم چیخ کر کہنے لگی "وہ بھی تو میری طرح اپاہج ہے"۔

مَیں سکتے میں آگیا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ پاسکل اِس خوبصورت مجسّمے میں بھی اپنی دل آزاری کا جواز ڈھونڈے گی۔

"ہاں وہ بھی اپاہج ہے لیکن اُس نے اپنے اپاہج پن کو خود اذیتی کا ذریعہ نہیں بنالیا" مجھے ایک دم غصہ آگیا اور پھر اُسی وقت اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ مَیں نے پاسکل کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "وینس کو اپنے حُسن پر اتنا ناز ہے کہ لوگ اُس کے کٹے ہوئے بازوؤں کو بھُول چکے ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم بھی بے حد حسین ہو۔ پاسکل تم وینس کی مانند اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کو بھُول کیوں نہیں جاتیں؟"

"مَیں نہیں بھُول سکتی" اُس نے آہستہ سے کہا اور پھر لگاتار سسکیاں بھرنی شروع کردیں۔ اُس کی نیلی آنکھوں سے آنسوؤں کے فوّارے چھوٹ رہے تھے اور اُس کا گول چہرہ تربتر تھا۔ "مَیں نہیں بھول سکتی۔ نہیں بھُول سکتی" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ کمرے میں موجود دوسرے لوگ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مَیں اُسے سہارا دے کر عجائب گھر سے باہر لے آیا اور تولیریز کے باغ میں ایستادہ ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ ہم شام تک وہیں بیٹھے رہے اور وہ خاموشی سے میرے شانے پر سر رکھے روتی رہی اور سسکیاں بھرتی رہی۔ مَیں چُپ چاپ اُس کے آنسوؤں سے تر معصوم چہرے اور بھیگی ہوئی آنکھوں میں تکتا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا وہ خود اپنے کٹے ہوئے بازو نہیں بھُول سکتی یا بوڑھی عورتیں جوان لڑکیاں اور مرد اُسے بھلانے نہیں دیتے۔ شام ہونے کے ساتھ باغ میں نصب شدہ روشنیاں جل اُٹھیں اور چہل پہل

شروع ہو گئی۔

"مَیں کسی پر سکون جگہ بیٹھنا چاہتی ہوں" پاسکل نے بینچ سے اٹھتے ہوئے کہا "پھولوں کا بازار اِس وقت بند ہو گا چلو وہاں چلتے ہیں"۔

"اگر تم پسند کرو تو مَیں تمہیں گھر چھوڑ آؤں؟"

"نہیں نہیں۔ اب مَیں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں" اُس کی پلکوں تلے صاف شفاف نیلی آنکھیں جھانکنے لگیں اور وہ مُسکرا دی۔

ہم تولیرز کے باغات میں سے چلتے ہوئے پھولوں کے بازار میں آ گئے جہاں سے کل صبح ہم نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان خریدا تھا۔ پھولوں کے کھوکھے بند ہو چکے تھے اور پورا بازار ویران پڑا تھا۔ بازار کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں جن کے سُوکھے ہوئے پتے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک کھوکھے کے باہر چند ٹوٹی ہوئی کُرسیاں پڑی تھیں۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ مَیں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بجنے کو تھے اور مجھے بہر صورت دس بجے تک سٹیشن پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔

"پاسکل" مَیں نے اُس کی ٹھوڑی تلے اُنگلی رکھ کر اُس کے خوبصورت چہرے کو اپنی جانب کیا "مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔ بشرطیکہ تم۔۔۔"

"تم جا رہے ہو"۔ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ پرے کر کے سر جُھکا کر بیٹھ گئی۔

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟" مَیں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"لوگوں کے رویّے نے مجھے ایک ایسی حِس عطا کر دی ہے کہ جب بھی کوئی مجھے چھوڑنا چاہتا ہے مَیں جان جاتی ہوں۔ تم آج صبح سے ہی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے"۔

"پیرس سے سان سباستیان ہسپانیہ کے لیے گاڑی ساڑھے دس بجے روانہ ہوتی ہے" مَیں احساسِ ندامت تلے دبے جا رہا تھا۔ "پاسکل سوچو تو سہی مجھے آخر ایک روز تو یہاں سے جانا ہی تھا"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں یہ کیسے سوچ سکتی تھی کہ تم نے ایک روز پیرس سے چلے جانا ہے۔ تم سیاح ہو اور کسی قسم کے بندھنوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور پھر اپاہج بندھنوں کو۔ میں نے ساری عمر ایک مفرور مجرم کی مانند لوگوں سے چھپ کر گزاری ہے۔ میرے لیے کسی پر بھروسہ کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنی ایک علیحدہ دنیا بسا لی جس میں صرف خوابوں کے لوگ بستے تھے۔ تم نے مجھے خواب کی اِس دنیا سے نکال کر باہر لا کھڑا کیا۔ اور اب۔۔۔ اب میں ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو بے بس اور اپاہج محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر رہنا ہوگا۔" پاسکل کی آنکھیں بالکل خشک تھیں اور وہ بڑے اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔

"تم اب کبھی خوابوں کی اُس دنیا میں واپس نہیں جاؤ گے" میں نے اُس کا خنک ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "تم نے دیکھ لیا ہے کہ کوئی بوڑھی عورت کھسر پھسر نہیں کرتی اور کسی لڑکی نے بھی۔۔۔"

"تم نہیں دیکھ رہے تھے مستنصر۔ مجھے تو اُن کی نگاہوں کی سوئیاں چبھ رہی تھیں اور یہ سوئیاں میرا مقدر بن چکی ہیں۔ میری سوئیاں نکالنے کے لیے اب کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔"

ایک مرتبہ پاسکل نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے پاس اُس کے ہر اعتراض کا جواب موجود ہے مگر اس وقت میں لاجواب ہو چکا تھا۔

"چند ہفتوں میں موسم سرما شروع ہو جائے گا اور مجھے ہر حالت میں اِس سے پہلے ترکی عبور کر کے وطن کی راہ لینی ہے ورنہ راستے میں برف گرنی شروع ہو جائے گی" میں نے نظریں جھکا لیں۔ جانے کیوں مجھے اپنے رویے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا اپنا ذہن میری باتوں کی نفی کر رہا تھا۔

"موسم سرما شروع ہو جائے گا تو کیا ہوا آخر اس کا اختتام بھی تو ہو گا اور پھر تم موسم بہار میں واپس وطن لوٹ جانا" اُس نے التجا کی۔

پاسکل بینچ کے پُرانے روغن کو ناخنوں سے کھرچتی رہی اور خاموش بیٹھی مجھے تکتی رہی جیسے میرے دِل کی آواز کی منتظر ہو۔

"موسم سرما کی آمد تمہاری نسبت میرے لیے زیادہ اذیت ناک ہے۔" مجھے خاموش پا کر اُس نے کہنا شروع کیا "خزاں کے شروع میں میرے ٹخنے کا درد اور بھی شدّت اختیار کر جائے گا۔ تب تو اِک ذراسی حرکت سے ہی میرے تمام بدن میں ٹیسیں اُٹھنا شروع ہو جاتی ہیں اور میں اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ جاتی ہوں۔ دریائے سین کے کنارے اکیلی بھی نہیں گھوم سکتی۔ جب خزاں کا آخیر ہو گا تو میں کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی نیچے سڑک پر شاہ بلوط کے سُرخ پتّوں کو گرتے دیکھ کر تمہیں یاد کیا کروں گی اور میرا درد قدرے کم ہو جائے گا۔" اُس نے آہستگی سے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر لبوں سے چھُوا اور بینچ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"مَیں تمہیں ٹیکسی پر گھر چھوڑ آتا ہوں" مَیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں نہیں" اُس نے بچّوں کی طرح انکار میں بار بار سَر ہلایا "مَیں ابھی دریائے سین کے کنارے جانا چاہتی ہوں تاکہ مجھے ایک مرتبہ پھر اکیلی گھومنے کی عادت ہو جائے۔" اُس نے ایک لمحہ کے لیے اپنی نیلی آنکھیں مجھ پر جما دیں اور پھر مُڑ کر چلنا شروع کر دیا۔ وہ بُری طرح لنگڑا رہی تھی۔ کھوکھوں کی خالی قطاروں کے درمیان پاسکل کا گھسٹتا ہوا پاؤں سُوکھے پتّوں کو سمیٹتا چلا جا رہا تھا۔ بازار کے آخیر میں پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکی اور پھر پیچھے دیکھے بغیر دائیں ہاتھ دریا کو جاتی ہوئی سڑک کی طرف مُڑ گئی۔

مَیں ہوٹل واپس پہنچا تو میری آنکھیں جل رہی تھیں اور یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سارا جسم آگ میں جھونک دیا گیا ہو۔ مَیں نے اپنا سامان باندھا اور بِل ادا کر کے ایک ٹیکسی کے ذریعے سٹیشن پر آ گیا جہاں پلیٹ فارم پر ہسپانیہ جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مَیں نے ڈبے میں اپنا سامان رکھا اور گاڑی کے دروازے کے ساتھ لگ کر پلیٹ فارم کے آخر میں واقع سٹیشن میں

داخل ہونے والے دروازے پر نظریں جما دیں۔ پلیٹ فارم پر بے شمار لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو الوداع کہنے آئے تھے۔ برقی روشنیوں نے پورے سٹیشن کی تاریکی کو چمکتی ہوئی صاف روشنی میں بدل دیا تھا اور یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ رات کے دس بجے ہیں۔ سرزمین اندلس کی جانب سفر کرتے ہوئے میرا دل خوشی سے معمور ہونا چاہیے تھا لیکن جانے کیوں اُس دُور میں جھول آ چکا تھا جس نے مجھے اب تک مضبوطی سے غرناطہ کے ایوانوں اور قرطبہ کی محرابوں سے باندھے رکھا تھا میرے ذہن میں صرف پاسکل کا بھولا بھالا اور غمگین چہرہ اُبھرتا اور ڈوب جاتا جیسے وہ خیالوں میں بھی لنگڑا رہی ہو۔ انگلستان سے فرانس آتے وقت سٹیمر کے عرشے پر ٹھٹھرتا ہوا سُرخ کوٹ۔ پوئنٹ ڈی بوتوں میں سین کے کنارے ایک چمکیلا دن اور پھر وینس کا مجسمہ جس نے اُسے رُلا دیا تھا۔ مَیں انہی خیالوں میں گم تھا کہ انجن نے وسل دیا اور پلیٹ فارم پر کھڑے مسافر جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میری نظریں ابھی تک داخلے کے دروازے پر لگی تھیں۔ مَیں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ مَیں وہاں کیوں کھڑا ہوں۔ انجن نے ایک اور وسل دیا اور گاڑی کے ڈبے آہستگی سے ایک مرتبہ آپس میں بھڑ کر حرکت میں آ گئے۔ مسافروں کو الوداع کہنے والے لوگ سٹیشن سے باہر جانے والے دروازے کی طرف جا رہے تھے اور سٹیشن بتدریج خالی ہو رہا تھا۔ مَیں بھی اپنی نشست پر جانے کے لیے پیچھے ہٹنے کو تھا کہ سٹیشن کے آخر میں لوگوں کے ہجوم کے درمیان مجھے پاسکل کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ لوگوں کو چیرتی اور دونوں ہاتھوں سے اُنہیں دھکیلتی ہوئی اِس انبوہِ کثیر کے درمیان راستہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مَیں دروازے سے نیچے اُتر کر پائدان پر کھڑا ہو گیا۔ "پاسکل" مَیں نے پوری قوت سے اُس کا نام پکارا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رُکی اور پھر اُس کی نظریں کھڑکیوں اور دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے چہروں پر پھسلتیں مجھ پر آ رکیں اُس نے ایک بھرپور کوشش سے اپنے آپ کو اِس ریلے سے آزاد کیا اور پھر خالی پلیٹ فارم پر میری طرف دوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی ران کو سختی سے بھینچتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کا دوسرا ہاتھ اُس کے لبوں پر جما ہوا تھا۔ وہ

بُری طرح لنگڑا رہی تھی۔ اگرچہ گاڑی کی رفتار ابھی بے حد آہستہ تھی مگر ہمارے درمیان فاصلہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنا سامان گاڑی میں چھوڑ کر سٹیشن پر کُود پڑوں تاکہ وہ بھاگنے کی اذیت سے بچ جائے۔ اُس کا خوبصورت سُرخ کوٹ گاڑی کے پہیّوں میں سے خارج ہوتی ہوئی ہوا کے زور سے فضا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ مَیں نے دروازے کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑا اور خطرناک حد تک آگے جُھک کر اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی مگر پہیّوں کی مہیب گڑگڑاہٹ میں اُس کی آواز دب گئی۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ اُس نے اپنی ہتھیلی لبوں پر رکھ کر ہاتھ میری طرف بڑھایا اُس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر ایک اذیّت ناک احساس کا پرتو جھلک رہا تھا۔ مَیں نے ایک مرتبہ پھر اُسے پکارا "پاسکل خدا کے لیے دَوڑنا بند کر دو" اور اُسی لمحے وہ دھڑام سے پلیٹ فارم پر گر گئی۔ اُس نے نہ تو وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی اور نہ ہی میری جانب دیکھا۔ اُس کا سُرخ کوٹ اُس کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھا جس کے درمیان پاسکل ایک خوبصورت راج ہنس کی مانند بے حِس پڑی تھی۔ گاڑی پلیٹ فارم سے نکل کر باہر آئی تو پاسکل گٹھڑی بنی ایک نئی نویلی دُلہن کی طرح دِکھائی دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کا چہرہ مدھم ہو کر سُرخ کوٹ میں مدغم ہو گیا۔ پھر سُرخ کوٹ رات کی تاریکی میں جذب ہو کر ایک نُکتے کی صورت اختیار کر گیا اور بالآخر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسری طرف پاکستان تھا

ساری رات ہماری گاڑی فرانس کے وسیع میدانوں اور جنگلوں میں دَوڑتی رہی۔ میرے ڈبے میں سوار تمام مسافر گہری نیند سو رہے تھے مگر میں بدستور اُس وینس کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اپنے معبد سے نکل کر اپاہج ہو گئی تھی۔ جس نے اپنے کٹے ہوئے بازؤں کے غم میں اپنے آپ کو دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے گِرد ڈبے کے مکینوں کا جائزہ لیا۔ ایک غلیظ ہسپانوی مزدور۔ ایک فرانسیسی جوڑا۔ دو راہبائیں اور ایک گٹھے ہوئے جسم کی نوجوان عورت جس کا سر نیند کی مدہوشی میں میرے شانے کے ساتھ آ لگا تھا۔

صبح سویرے ہسپانیہ کا پہلا شہر سان سباستیان آیا۔ میڈرڈ کے بعد سفرِ اندلس شروع ہوا۔ قرطبہ۔ اشبیلیہ اور غرناطہ۔ میرے نقشے پر کھینچی ہوئی سُرخ لکیروں کا اختتام ہوا اور وطن کو واپسی کا آغاز۔ ایک مرتبہ پھر فرانس اور سوئٹزرلینڈ سے گزر ہوا اور آسٹریا سے اورینیٹ ایکسپریس پر سوار ہو کر میں استنبول پہنچ گیا۔ استنبول اور وطن کی راہ میں ارضِ روم پڑتا تھا جہاں میں اِس وقت شیفتہ مدرسے کے بوسیدہ مینار تلے کھڑا اپنے اِس طویل

سفر کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ جہاں کاکیشیا سے آنے والی تیز ہوائیں سرد تر ہو چلی تھیں۔ چند روز تک سردی اور شدید ہو جائے گی اور پھر ۔ ۔ ۔ پھر برف گرے گی۔ سردیاں شروع ہو جائیں گی۔ پاسکل نے مجھے کہا تھا "سردیاں شروع ہو جائیں گی تو کیا ہوا؟ بالآخر ختم بھی تو ہو جائیں گی۔ تم موسم بہار میں واپس وطن لوٹ جانا" کاش میں اُس کا کہنا مان لیتا لیکن میں تو سیاح ہوں اور سیاح کسی قسم کے بندھنوں کو برداشت نہیں کر سکتا اور پھر اپاہج بندھنوں کو؟ ارضِ روم! جہاں اکتوبر کا آخیر تھا اور سٹیشن سے شہر جانے والی سڑک کے گرد شاہ بلوط کے پتے سرخ ہو ہو کر گرنے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں سے ہزاروں میل دُور پیرس کی ایک ویران سڑک پر بھی اس وقت شاہ بلوط کے پتے سُرخ ہو کر گر رہے ہوں گے اور اپاہج پاسکل اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی اِن خزاں رسیدہ پتوں کو دیکھ رہی ہوگی۔ وہ کہتی تھی ناکہ ان سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر میں تمہیں یاد کر لیا کروں گی اور میرا درد قدرے کم ہو جائے گا۔

مَیں نے سر اٹھا کر مینار کی طرف دیکھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ مَیں نے سلجوق شہزادی کے مدفن کے پہلو میں کھڑے ہو کر ایک سرد اور بھیگی ہوئی دوپہرا پنے پُورے سفر کی یادیں سمیٹنے میں گزار دی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی۔ سڑک پر حسبِ معمول چہل پہل شروع ہو چکی تھی لیکن ایک ٹھہرا ہُوا سا شور نہیں تھا۔ بھوک کی چمک اب غائب تھی ۔ مر چکی تھی۔ مَیں پتلون کی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔ راہداری کے شروع میں ہوٹل کے بوڑھے مالک کا کمرہ تھا۔ مَیں سر جھکائے پاس سے گزرنے لگا تو اُس نے آواز دی "مُستنصر پاشا" میرے قدم وہیں رُک گئے۔ وہ اب ضرور کرایہ مانگے گا۔ میں ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا تو اُس کے سامنے میز پر ایک پوٹلی پڑی تھی۔ میرے کپڑوں کی پوٹلی۔

"ابھی ابھی سٹیشن سے کسٹم کا ایک سپاہی دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ یہ کپڑے صبح کی گاڑی پر ہی آ گئے تھے مگر مزدوروں کی سُستی کی وجہ سے اب تک ڈبے میں ہی پڑے رہے۔"

مَیں نے جلدی سے پوٹلی کھول کر دیکھی۔ سب کچھ موجود تھا۔

"چائے پیو گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے بے حد بھوک لگی تھی۔

اُس نے پاس رکھی چینک میں سے شیشے کے پتلے گلاس میں چائے انڈیل کر گلاس مجھے تھما دیا۔

"بسکٹ؟" اُس نے پلیٹ آگے کر دی۔

میں نے دو بسکٹ یکمشت منہ میں ڈال کر نگل لیے۔ بسکٹ میرے خالی پیٹ میں یوں گرے جیسے کسی گہرے کنوئیں میں پتھر۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔ جانے ہوٹل کا مالک میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ میں نے پوٹلی بغل میں دبائی اور اُس کا شکریہ ادا کر کے اوپر کمرے میں آگیا۔

دوسری صبح میں ارضِ روم کے مرکزی بینک کے سامنے چوڑے فٹ پاتھ پر کپڑوں کی دکان سجائے بیٹھا تھا۔ اِس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میں نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور پھر مجھے وطن واپس جانے کے لیے کرایہ بھی تو درکار تھا۔ مطلع آج پھر ابر آلود تھا۔ کوہِ دُھند پر بادل گہرے ہو رہے تھے۔ شاید آج شام تک برف گرنی شروع ہو جائے۔ بسوں کے اڈے کی جانب سے نوجوان سیاحوں کی ایک ٹولی برآمد ہوئی۔ اُن میں سے اکثر نے صرف کُرتے اور پاجامے پہن رکھے تھے۔ شاید وہ ہندوستان سے واپس آ رہے تھے۔

"یہ سوئٹر بیچو گے؟" اُن میں سے ایک لڑکی میرے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔

"کیوں نہیں۔" میں نے جلدی سے سوئٹر اُٹھا کر لڑکی کے شانوں پر رکھ دیا "سو فی صد خالص اُون۔ ریجنٹ سٹریٹ لنڈن۔ صرف دس ڈالر۔"

لڑکی نے نرم اور گرم سوئٹر کو گالوں سے رگڑا اور پھر اپنے ململ کے کُرتے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "پانچ ڈالر۔"

"منظور!" مَیں نے ہتھیلی آگے کر دی۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے سوئٹر پہن لیا اور جیب سے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔ اس لڑکی کو وہاں بیٹھے دیکھ کر دوسرے سیاح بھی رُک گئے۔ تھوڑی دیر میں میرے تمام کپڑے بِک چکے تھے اور میری جیب میں پُورے چالیس ڈالر تھے۔ سب سے پہلے ایک نزدیکی قہوہ خانے میں جا کر شیش کباب۔ روٹی، سویاں اور چائے کیا کیا کھایا اور پھر بسوں کے اڈّے کا رُخ کیا۔ مَیں ابھی ایران کی سرحد تک جانے والی بس کے بارے میں دریافت کر ہی رہا تھا کہ ایک جہاز نما یورپی بس اڈّے میں داخل ہوئی۔ بس کی پیشانی پر "پیرس سے کابل" کے الفاظ لکھے تھے۔ ڈرائیور پٹرول ڈلوانے کے لیے نیچے اُترا تو مَیں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ "کوئی نِشست خالی ہے؟"

"ہاں ایک نِشست خالی ہے۔" اُس نے پٹرول کی ٹینکی کا ڈھکن اُتارتے ہوئے لاپرواہی سے کہا "ایک بوڑھا سیاح انقرہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا تھا۔ چالیس ڈالر"

"تیس ڈالر! ہاں!" مَیں نے جیب سے نوٹ نکال کر اپنی دونوں ہتھیلیوں پر پھیلا کر اُسے دکھائے "میرے پاس صرف چالیس ہی تو ہیں۔"

"مَیں بھی تو چالیس ہی مانگ رہا ہوں" اُس نے اُکتاہٹ سے کہا۔

"راستے میں بھوک بھی تو لگے گی نا!" مَیں نے لجاجت سے کہا۔

وہ ہنس دیا "ٹھیک ہے" اُس نے میری ہتھیلی میں سے تیس ڈالر اُٹھا لیے "بیٹھ جاؤ۔"

"ابھی آیا" مَیں نے چٹکی بجائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ہوٹل آ کر کرایہ ادا کیا۔ اپنا سفری تھیلا کاندھے پر اٹھایا اور واپس آ کر بس میں سوار ہو گیا۔ بس کی آرام دہ نشست پر بیٹھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سفر ختم ہو گیا ہو۔

ارضِ روم سے بس چلی۔ نوح کا پہاڑ آرارات دُھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ رات تبریز میں گزری۔ دوسری شب ہم تہران میں تھے۔ تیسرے روز مشہد میں ایک مرتبہ پھر امام رضا کے روضے کے سنہری گنبد نظر آئے۔ چوتھی صبح ہرات کے باہر بیچارہ مدرسہ کے سر بُریدہ

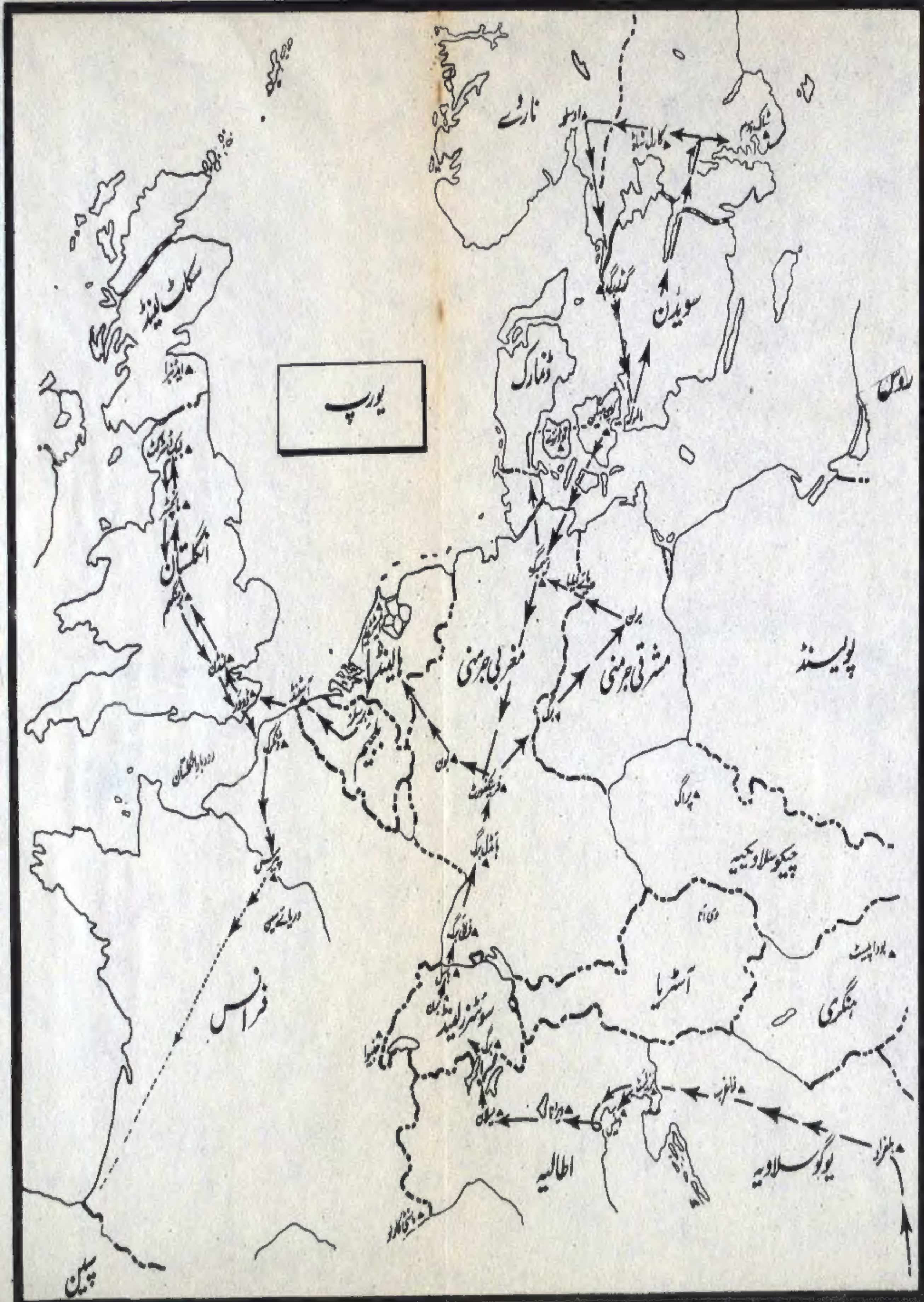
میناروں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہندوکش کا عظیم سلسلۂ کوہ سامنے آیا تو ہمیں ارضِ روم سے روانہ ہوئے پورے پانچ دن ہو چکے تھے اور ہماری بس کابل کے بسوں کے اڈے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اپنا سامان اُٹھا کر نیچے اُترا تو میرے سامنے ایک جانی پہچانی بس کھڑی تھی

"آر یُو گوئنگ ٹو پشاور سَر؟" پاکستانی بس کے گورے چِٹّے کنڈکٹر نے شُستہ انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

"آہو جی" میں نے بوکھلا کر خالص موچی دروازے کے لہجے میں جواب دیا۔ دریائے کابل کے ساتھ ساتھ پُرپیچ سڑک پر بس لڑھکتی ہوئی طورخم جا رہی تھی۔ دوسری طرف پاکستان تھا۔

لاہور

۱۲، نومبر ۱۹۷۱ء



یورپ
نارُوے
سویڈن
ڈنمارک
سکاٹ لینڈ
انگلستان
ہالینڈ
بلجیم
مغربی جرمنی
مشرقی جرمنی
پولینڈ
روس
چیکوسلاویکیہ
آسٹریا
ہنگری
یوگوسلاویہ
اطالیہ
سوئٹزرلینڈ
فرانس
سپین


افغانستان ــ ایران ــ ترکی
روس
ترکی
ایران
افغانستان
پاکستان
سعودی عرب
عراق
بحرۂ کیسپین
بحرۂ اسود
بحرۂ روم
یونان
بلغاریہ
استنبول
انقرہ
سیواس
ارض روم
تبریز
قزوین
تہران
نیشاپور
مشہد
ہرات
قندھار
غزنی
کابل
پشاور
لاہور
کشمیر
کوئٹہ
سمرقند
بخارا
تاشقند
خوقند
خوارزم
ترکستان
مرو
بلخ
اصفہان
شیراز
دشت لوط
بغداد
دمشق
شام
فرات
اردن
مدینہ
مکہ
کراچی